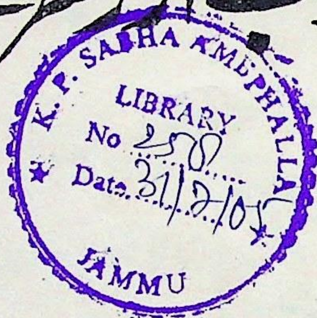

K.P. SABHA AMBPHALLA
LIBRARY
No
Date
JAMMU



# سیلاب اور قطرے




تیغ بہادر

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

طباعت — سنہ ۱۹۶۷ء

تعداد — ایک ہزار

طابع — رائیٹرس پبلشرز سرینگر کشمیر

مطبع — خواجہ لیتھو پریس جامع مسجد (دہلی)

قیمت — ۶ روپیہ ۵۰ پیسے

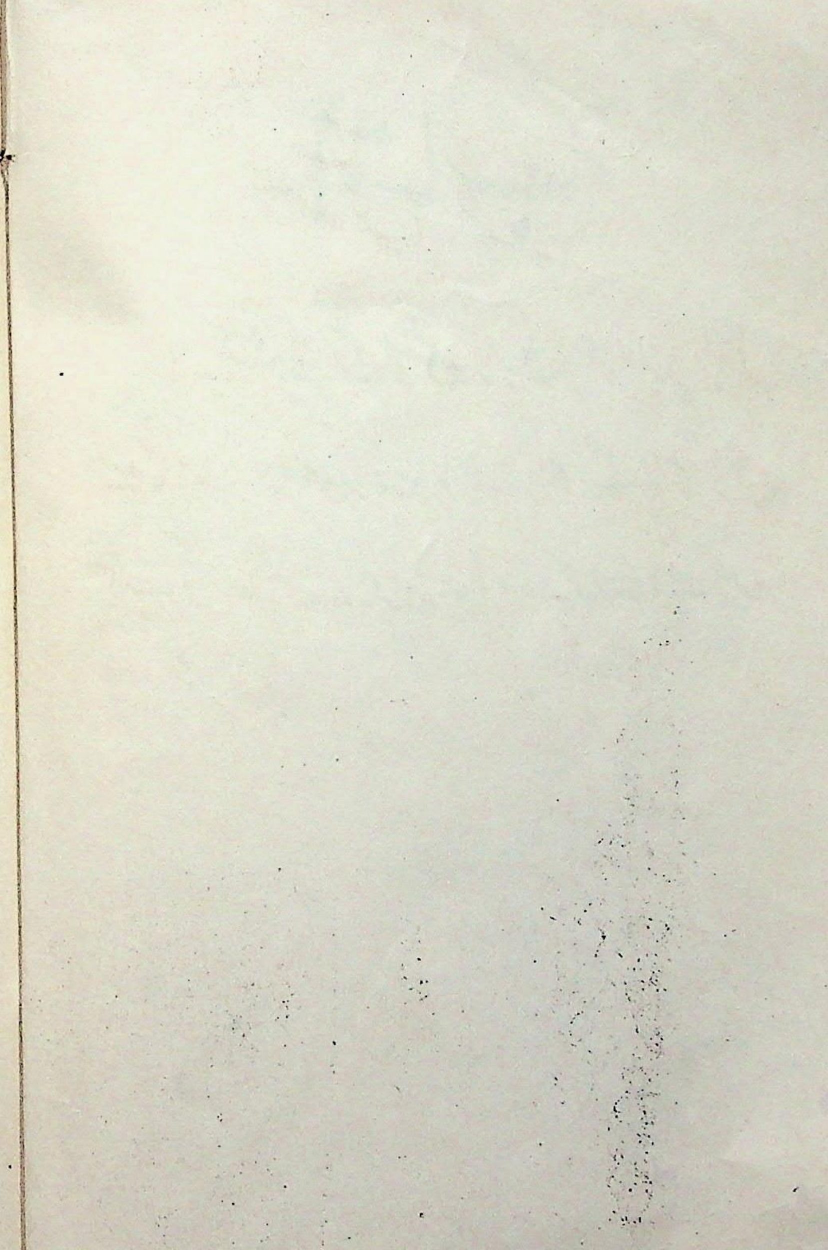
(کتبہ شمیم گونڈوی)

# انتساب

کشمیر کے مشہور شاعر

جناب دینا ناتھ نادم کے نام

جو میرے اُستاد بھی رہ چکے ہیں



# پیش لفظ

اپنے دو افسانوی مجموعوں "جہلم کے سینے پر" و "عورت" کے بعد یہ ناول آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

تیغ بہادر

"سیلاب قطروں کو بہا لے جاتا ہے
لیکن قطرے مِل کر سیلاب بن جاتے ہیں"

آسمان گھنے بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ شام اندھیری تھی، کبھی کبھی بجلی چمک اُٹھتی۔ لمحہ بھر کے لئے گھاٹ کی سیڑھیاں روشن ہوجاتیں۔ اور گھاٹ تلے جہلم میں بنتے بگڑتے ہلکوروں کی حدیں واضح ہوجاتیں۔ لمحہ بھر کے لئے گھاٹ سے کشتی کی بے ہنگم چھپت اندھیرے میں نمودار ہوتی اور بجلی کی چمک کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی پھر سے اندھیرے میں ڈوب جاتی۔

بجلی تڑپ تڑپ کر چمک رہی تھی۔ جیسے کوئی مچھلی، اُجلی اُجلی، گہرے پانی میں دم گھٹتا محسوس کرکے فضا میں سانس لینے کے لئے لپک رہی ہو۔ بجلی کی چمک لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور ہوائیں بھی تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ گھاٹ سے ذرا اُدھر کیکر کا درخت بدستور سر پٹخنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

دفعتاً بجلی بڑے زور سے چمکی۔ ساتھ گرج کا ایک مہیب دھماکہ اندھیرے میں گونج اُٹھا اور بلہ کاک پاؤں بڑھاتے ہوئے ہچکچا سا گیا۔ کیکر پر بسیرا کئے پرندے پھڑپھڑا کر اور چلا چلا کر قدرت کی دست درازی کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔ بھلا اُن کا کیا قصور تھا کہ قدرت ان کی نیند خراب کرنے پر تل گئی تھی قصور اگر کسی کا تھا تو بلہ کاک کا جو ایک ایسا قدم اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا جس سے بہت ساروں کی کائنات ڈھے جانے کا خطرہ تھا

گرج کی گونج ڈوبتے ہی تو بلہ کاک کی سوچ اُبل پڑی۔ اُسے محسوس ہوا

کہ قدرت اُسے تنبیہ کررہی ہے کہ دینا ناتھ اور رحمان کو الگ رکھنے میں ہی بھلائی ہے ۔ ورنہ اُن دونوں کا ساتھ نجانے کیا رنگ لائیگا۔ جب کبھی دونوں ساتھ رہے کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کرتے رہے ۔ اور قصور دینا ناتھ کا نہ تھا بلکہ رحمان کا تھا جس کی لپیٹ میں آکر دینا ناتھ ...... اُس کا بھولا بیٹا ناحق مارا جاتا تھا۔ دینا ناتھ نمائش میں رُومال چُراتے ہوئے کبھی نہ پکڑا جاتا اگر رحمان کا ساتھ نہ ہوتا ایک چوری کی بات ہوتی تو اتنی تکلیف دہ نہ ہوتی ۔ دینا ناتھ بچہ تو تھا ہی نا سمجھی میں ریجھ گیا ہو گا رومال پر ۔ لیکن رحمان کی ترغیب نے دینا ناتھ کو گھر سے برتن چُرا کر بیچنے پر بھی آمادہ کیا تھا تاکہ دونوں سینما دیکھ سکیں ۔ بلہ کاک کو یقین تھا کہ سب کارستانیوں کی جڑ رحمان ہے ۔ بھلا بھِک منگے کے پاس تھا ہی کیا جو بیچ سکے ۔ بوسیدہ ناؤ کے پھٹے تو جلانے کے قابل بھی نہ تھے !

بلہ کاک نہ جاتا لیکن رحمان کے بوڑھے باپ بنزا کی بات ٹالتے بھی نہ بنتی تھی ۔ بیچارہ بنزا خود بھی بیٹے کے ہاتھوں نالاں تھا۔ رحمان آج دینا ناتھ کی وساطت سے کام پر لگ جائے تو بنزا کے بھی بہت سارے دُکھ دُور ہو سکتے تھے ۔ دینا ناتھ کسی ٹھیکیدار کا منشی بن گیا تھا۔ خیال آتے ہی بلہ کاک کے چہرے پر افسوس کی لہر اُمڈ آئی ۔ بلہ کاک اپنے بیٹے کو انجنیر یا ڈاکٹر کی صورت میں دیکھنا زیادہ پسند کرتا۔ پر جب بیٹا ہی نالائق ہو تو باپ بیچارہ کیا کرے ۔ ! بلہ کاک کا جی چاہا کہ بیٹے کو دو چار گالیاں دے ۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا ۔ اُسے محسوس ہوا کہ بیٹے کو گالیاں دینے سے کام نہیں چلے گا ۔ بھلا وہ خود کونسا افسر بن پایا تھا۔ وہ تو دینا ناتھ کے دادا کی کوششوں سے ایسی جگہ کلرکی پر مامور ہو گیا تھا جہاں رشوت پانی کی طرح ملتی تھی ۔ ورنہ آج اُس کے اپنے پاس تن ڈھانپنے کو چیتھڑے بھی نہ ہوتے ۔ اِس لئے اُسے کوئی حق نہ تھا بیٹے کو کوسنے کا ۔ بلکہ بھگوان کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ

دینا ناتھ مستری بن گیا۔ تنخواہ کم سہی بالائی آمدنی تو تھی۔
یکایک بلڈاک کی کھوج رک سی گئی۔ ہوا کی تیزی بھائیں بھائیں کی آواز کو چھوڑ رہی تھی۔ جیسے چیخ چیخ کر اس کی گھبراہٹ کا مضحکہ اڑانے کی کوشش میں ہو یا زبانِ حال سے کہہ رہی ہو کہ ستاون برس کا گھسا پٹا پنجر ابھرتی زندگی کے دھارے کو روکنے سے قاصر رہیگا۔ اس لئے چاہیئے کہ قدم جلدی جلدی بڑھائے تاکہ آنے والی بارش میں بھیگنے سے پہلے منزل پہ پہنچ جائے۔
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی جیسے سینے پر سے ایک تکلیف دہ بوجھ گزار رہا ہو۔ ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش شروع ہونے کے آثار تھے۔ اب جانا بیکار تھا۔ جہنم میں جائے یہ نئی پود، جرجی میں آئے کرتی پھرے۔ اسے کیا اس کے دن تو ختم ہو رہے تھے۔ آگے جانا بیکار اپنے بدن کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا شکار بنانا تھا۔ فیصلہ کر کے اسے تسکین سی ملی۔ یکایک اس کی نگاہیں سیڑھیوں پر ملتے دودھیا دھبے پر مرکوز ہو گئیں۔ اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "کون ہے..."
"میں ہوں سمرا ...... سفید دودھیا دھبہ اندھیرے میں معلق سا ہو گیا اور بلڈاک اپنا فیصلہ بھول گیا۔
"آ تو رہا ہوں بھئی....... آ رہا ہوں..." اور وہ کھڑاؤں پہنے دیوار کے سہارے سیڑھیاں اترنے لگا۔ کھڑاؤں کی کھٹاک کھٹاک اندھیرے میں گونج پیدا کرنے لگی۔
وہ سمرا کے سہارے کے باوجود تھک سا گیا۔ سینہ دھونکنی کی طرح ملنے لگا۔ کوئی وقت تھا جب اس گھاٹ پر سیڑھیاں نہ تھیں۔ بلکہ سیڑھیوں کی جگہ ایک عمیق ڈھلان تھی۔ ان دنوں وہ اس ڈھلان پر چڑھ کر یاں کیا کرتا

تھا - ایک ہی سانس میں نیچے سے اُوپر تک کا فاصلہ طے کرتا تھا۔ بنرا کے ساتھ پھسلنے کا کھیل کھیلا کرتا تھا۔ یا اس کیکر کے درخت کی ٹہنیوں میں جھول جھول جاتا تھا۔ لیکن اب تو درخت کی ٹہنیاں بھی شاید بوڑھی ہو گئی ہوں۔ شاید اُس کا وزن نہ سہہ کر ٹوٹ ہی جائیں۔

بلہ کاک نے سوچا اور اُسے افسوس ہوا۔ وہ بھی کیا اچھے دن تھے زندگی دھیمی چال چلتی تھی جیسا کہ جہلم بھی دھیمی چال چلا کرتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی سیلاب آ بھی جاتا تو کچھ دن چرچا رہتا۔ اور جب تک سیلاب کی تہہ تک پہنچا جاتا سیلاب اُتر چکا ہوتا تھا۔ زندگی ہلکی سی پھریری لے کر پھر سے دھیمی ہونے لگتی۔ لیکن اب تو پل بھر بھی زندگی کے تھپیڑوں سے نجات نہ ملتی تھی۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی بکھیڑا کھڑا رہتا۔ کوئی نہ کوئی غم ذہن کو جھنجھوڑ جاتا اور کوئی نہ کوئی خواہش مچلتی رہتی۔ دن ہوا کی طرح اُڑے جا رہے تھے اور اُمیدیں تھکنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ چاہے بدن تھک کر چُور ہو جائے یا ٹانگیں لڑکھڑانے کو آ بیٹھیں۔ اور بلہ کاک سیڑھیاں اُترتے اُترتے لڑکھڑا سا گیا۔

"تھک گئے بلا...........؟" بنرا بلہ کاک کو بے تکلفی سے بلا کہہ کر پکارتا تھا اور کچھ دنوں سے بلہ کاک کو بنرا کے یوں مخاطب ہونے سے تکلیف سی ہوتی تھی۔

"ہاں بھئی — ذرا دم تو لوں" بلہ کاک کے لہجے میں ہلکی سی ترشی تھی۔

بنرا نے بلہ کاک کے لہجے کی ترشی محسوس نہ کی۔ سہارا دے کر اُس نے بلہ کاک کو سیڑھی پر بٹھا دیا اور خود کھڑا رہ کر کچھ دُور اپنی ناؤ کو دیکھنے لگا۔ ناؤ کے سرے سے ایک چھوٹا شکارا لمبی رسی سے بندھا تھا۔ بلہ کاک

نے دیکھا کہ چھوٹا سا شیکارا جہلم کی لہروں پر ہولے ہولے ڈول رہا ہے جیسے بڑی ناؤ کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی جدو جہد کر رہا ہو۔ بڑی ناؤ کے پیٹ سے ... قہقہوں کی بے ربط آوازیں آرہی تھیں۔ بلہ کاک کو ٹھیس سی لگی۔ بوڑھے لڑکھڑا کر نوجوانوں کا ساتھ دینے کی کوشش کریں اور نوجوان بوڑھوں کا ہاتھ پکڑنے کی زحمت بھی نہ اُٹھائیں۔ اس طوفان میں گھر سے باہر نکل آیا۔ تھکن کے مارے جوڑ جوڑ الگ سا ہو گیا تھا۔ ٹھنڈ سے ہڈی ہڈی کانپ رہی تھی اور ایسے بے شرم منظر و سے واسطہ پڑا تھا کہ ایک بوڑھے کو دوسرے بوڑھے کے سہارے کے لئے کھینچ دیا۔

شاید چھوٹا شکارا بڑی ناؤ کو گھسیٹ کر بہا ہی لے جائیگا؟ جرا ہوا ...... ہوں ـــ بوڑھا منرا اور وہ خود ایک بوڑھا۔ پھر منرا تو اتنا زیادہ بوڑھا نہیں ـــ اب بھی دو من کی بوری سر پر لاد کر گھاٹ پر چڑھ جاتا ہے نہ چڑھ پائے تو کھائے کیونکر...... اور ایک وہ خود ہے کہ سیڑھیاں اُترتے تھک گیا۔ دفعتاً اُس نے منرا سے سوال کیا۔

"منرا تم مجھ سے کے سال چھوٹے ہو......"

"یہی کوئی تین ایک برس ...... کیوں؟......" منرا بھی سیڑھیوں پر بلہ کاک کے پاس بیٹھ گیا۔ بلہ کاک کو محسوس ہوا کہ منرا کا سینہ بھی دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔ محسوس ہوتے ہی تسکین کی لہر سی اُس کے بدن میں دوڑ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے منرا کی حالت پر رحم بھی آگیا۔ منرا کی زندگی بُری کٹ رہی تھی۔ بڑھاپے میں بھی محنت مزدوری کرنی پڑھ رہی تھی۔ اور بیٹا تھا کہ آوارہ پھرا کرتا تھا اور جو کہیں رحمان کا ساتھ دینا نا

کو بھی آوارہ کردے ..... تو ؟ اُسے خود بھی شاید منبرا کی طرح بوڑھاپے میں دردر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ اُسے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیئے۔ معمول کی طرح منبرا کو نظر انداز کرنا چاہیئے۔ منبرا کا کُند ذہن ایسی گتھیاں سُلجھانے کا اہل نہ تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ڈھیل دینے پر آمادہ نہیں۔ لاکھ جتن کر کے دینا ناتھ نوکری میں جٹ گیا تھا۔ کچھ دنوں میں باپ بھی بن جائے گا۔ ہو امید سے تھی۔ بھگوان لڑکی دے، تو دل کے ارمان پورے کرنے کا موقع مل جائے۔ اب تک اُن کے گھر میں لڑکی پیدا نہ ہوئی تھی۔ رشتہ دار اور ہمسائے بھی سمجھ لیں کہ بلہ کاک ایک معمولی کلرک سہی پر پوتی کو اتنا جہیز دیا..... اتنا جہیز دیا..... کہ ..... پر کیا فائدہ لڑکی ہونے سے۔ لڑکی کے بڑے ہونے تک تو وہ چتا میں جل کر راکھ ہو چکا ہو گا۔ کہیں وہ سڑی تو نہیں جو عجیب عجیب سپنے دیکھ رہا ہے۔ لڑکی پیدا ہوئی نہیں اور وہ..... ہوں..... بوڑھا ہو گیا ہے نا تبھی ذہن بہک بہک جاتا ہے۔ اِس وقت وہ اِس لئے سیڑھیوں پر بیٹھا ہے کہ منبرا کو جتلائے کہ دینا ناتھ اور رحمان کا ساتھ ٹھیک نہیں۔ دونوں نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور جو منبرا بُرا مان جائے تو..... بچپن کا دوست جو ٹھہرا۔ پھر اس کے بغیر چارہ ہی کیا ہے..... کیسے سمجھائے اِس بیوقوف کو..... کیسے کہہ دے اِس بدھوان پڑھ، جاہل گنوار سے کہ وقت بدل رہا ہے۔ دوستی بدل رہی ہے۔ دوستی کے اصول بدل رہے ہیں۔ دیکھ منبرا..... تم دینا ناتھ کے ساتھ رحمان کو گاؤں بھیجنے سے انکار کر دو۔ اکیلی جان ہو، کیا بھروسہ۔ دیکھ بھال کے لئے بھی کوئی ہونا چاہیئے۔ میری مانو تو اُسے یہیں روک لو۔ یہاں بھی اُسے مزدوری مل سکتی ہے۔ کام نہ کرنا چاہے تو وہاں بھی دربدر پھرتا رہے گا۔ اُسے

یہیں رُک لو تو اچھا رہے گا۔"

"یہاں مزدوری کرنی ہوتی تو دربدر کیوں پھرا کرتا۔ یہاں میں بوڑھا جو ہوں کمانے کے لئے۔ اب تم ہی بتاؤ۔ گھر کا کام کاج میں کروں۔ کھانا میں پکاؤں اور مزدوری بھی میں ہی کروں اُسے کونسی فکر ہے یہاں جو سنبھل جائے گا۔ ہاں سب اپنے کندھوں پر آ پڑے گا تو شاید سنبھل جائے۔ اسد کرنائی کی لڑکی سے بات چل رہی تھی۔ سوچا کوئی عورت آئے گی تو گھر بھی بن جائے گا۔ اور یہ حرامی کا پلا بھی سنبھل جائے گا۔ لیکن اب اسد کرنائی نیا ہی راگ الاپ رہا ہے۔" بزرا کی آواز میں اَن گنت دکھ پنہاں تھے۔

"کیا کہہ رہا ہے اسد کرنائی!" بلہ کاک نے ہمدردی ظاہر کی۔

"کہتا کیا۔ یہی کہ رحمان لفنگا بن گیا ہے۔ لڑکی کی زندگی خراب ہو گی تو کون ذمہ دار ہو گا۔"

"اچھا....." بلہ کاک نے جھوٹ موٹ کی حیرانی ظاہر کی۔

"ہاں بھئی اب تم ہی بتاؤ۔ بچپن میں کون ایسا نہیں ہوتا۔ اپنی ہی کہو۔ یاد ہے دیوان باغ کے مالی کی، کیا حالت بنا یا کرتے تھے ہم دونوں۔ ایک انار کبھی نہ رہنے دیتے تھے درختوں پر..... بھلا ہم لفنگے تھے کیا۔"؟

اور بلہ کاک پھر سے سوچ کی لہروں میں غوطے کھانے لگا۔ مزا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ خود بھی تو بچپن میں ایسی ہی شرارتیں کیا کرتے تھے۔ اناروں کی چوری کیا کرتے تھے۔ دینا ناتھ نے بھی یہی کیا تو اُسے قصوروار نہیں گردانا جا سکتا۔ اس زاویئے سے دیکھا جائے تو رحمان بھی برا نہیں۔ اب وہ کیا کرے..... کیسے سمجھائے مزا کو یا شاید اپنے آپ کو سنبھالنے کی نوبت

آئے۔ اُفوہ......ان گتھیوں کو سلجھانے سلجھاتے وہ خود الجھ رہا تھا اور
سیڑھیوں پر بیٹھے رہنے کے باوجود اُسے بے انتہا تھکن محسوس ہونے لگی
نبرا آپ ہی آپ جھنجھلا اُٹھا۔ بلاکاک بڑھاپے میں سٹھیا گیا تھا
شاید۔ کیا باتیں لے بیٹھا اور وہاں بچے ناؤ میں انتظار کر رہے ہوں گے۔
سوچنے کی بات تھی۔ اتنی ٹھنڈی ڈراؤنی رات میں گھاٹ کی سیڑھیوں پر
بیٹھے بیٹھے اونگھ رہا تھا بلاکاک۔ جیسے پتھر کی سخت کھردری سیڑھیوں پر
نہیں بلکہ گھر میں تکیہ سے پیٹھ لگائے بیٹھا ہو۔

بھئی رات یہیں کاٹنی ہے کیا...... دیکھو تو...... بوندیں بھی گرنے
لگی ہیں۔" نبرا نے اُسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ بلاکاک چونک پڑا۔
بدن کے ننگے حصوں پر بارش کے قطرے چبھتے سے محسوس ہوئے۔ اُس
نے اپنا سوکھا ہاتھ نبرا کے کھردرے ہاتھ کو تھامنے کے لئے بڑھایا۔ نبرا کا
کھردرا ہاتھ لمحہ بھر کے لئے بُرا سا لگا۔ اور دوسرے لمحے اپنا توازن برقرار
رکھنے کے لئے کھردرے ہاتھ کو زور سے تھاما۔ زندگی شاید اچھائی برائی دونوں
کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔

—

اُس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ فضلی نام ہو کر اُسے لوگ پھُولی کے نام سے کیوں پکارتے تھے۔ پھُولی نام پیارا تھا۔۔ پر زبان پر اُلٹتے پلٹتے گُدگُدے پن کا احساس ہونے لگتا تھا۔ ذہن میں موٹی تازی لڑکی کی صورت اُبھر آتی۔ پھُولے گال۔۔۔۔ پھُولا سینہ۔۔۔۔ پھُولے پھُولے بازو۔ پھُولی پھُولی رانیں اور گوشت سے ڈھکے بے ڈھنگے ہاتھ پیر، اور حد سے زیادہ پکّے موٹے سے شلغم کا خیال آتا تھا۔ پر وُہ اِس تصوّر کے بالکل برعکس تھی۔۔۔۔ لمبی بے ہنگم۔ ڈانڈ کی طرح پتلی۔۔۔۔ لمبوترہ چہرہ جیسے کوئی کچا بگو گوشہ۔۔۔۔ گال پچکے سیب جیسے سہیلیوں نے بارہا ڈھارس بندھائی تھی کہ چہرہ بہت دِلکش ہے پر پھُولا تو نہ تھا۔ سینے پر ہلکے سے دو اُبھار جو جوانی کو بچپن کی طرف دھکیلتے محسوس ہوتے تھے۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں۔ اُبھری ہڈیوں سے مزیّن اور سوکھے ندرو[۱] جیسی ٹانگیں۔

ـــ ہو سکتا تھا کہ بچپن میں بہت کھا کھا کر وہ پھُول کر کُپا ہو گئی ہو۔ اُن دِنوں اُس کا باپ زندہ تھا۔۔ گھر میں مویشی تھے۔ بھیڑ بکریاں تھیں۔ اُس کا باپ صبح تڑکے ڈل جھیل کو چل دیتا تھا۔ دِن بھر کیچڑ اور لہروں سے اُلجھتا رہتا۔ پانی میں اُگی گھاس کو روندھتا کاٹتا۔ نرکلوں میں آنکھ مچولی کھیلتا رہتا اور سِنگھاڑے اِکٹھے کیا کرتا تھا۔ کالے کالے سِنگھاڑے جن کے دوسری طرف اُگے کلمٹے کالی گائے کے سینگوں کی طرح نوکیلے تھے۔۔۔۔ وہ خود دِن بھر

---

۱۔ کنول گٹھا۔ کنول ڈھنٹل۔ سبزی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

گائے کو چراتی پھرتی تھی۔ اُس کی ٹانگوں کے بیچ منڈلاتی۔ اُس کی تھوتھنی کو چُومتی چاٹتی ــ اور تھوتھنی میں بسی ہری ہری گھاس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی اُس کی پیٹھ پر چڑھ کر دو سینگوں کے سہارے سواری بھی کرتی تھی اور کالی گائے کبھی سینگ نہ مارتی گو لیکن یہ چھوٹے چھوٹے بے رحم سنگھاڑے ذرا بے احتیاطی سے چھو دو تو کاٹ کھائیں اور خون کی دھار پھوٹ پڑے۔ گھر میں چھلکوں کے ڈھیر بکھرے رہتے تھے اور پیروں میں چبھتے رہتے تھے وہ۔ تو باپ ہی کا کمال تھا جو اتنے سارے سینگھاڑے اکٹھے کرتا تھا رات کو جب گھر پہنچ جاتا تو ماں کو اُس کی ہتھیلی اور تلوؤں پر کڑوے تیل کی مالش کرنی پڑتی تھی باپ کی ہتھیلیوں پر زخموں کی چھینٹ دیکھ کر اُس نے کئی بار پوچھا تھا کہ کیا سنگھاڑے اکٹھے کرنے ضروری ہیں۔ کیوں نہ باپ بھی گھر بیٹھ کر اُس کے ساتھ گائے چرانے جایا کرے یا ٹوکریاں بنا کرے۔ گھر کے کام کاج سے فرصت پاتے ہی ماں ٹوکریاں بننے میں جٹ جاتی۔ ٹوکریاں بنتے بنتے ماں کی انگلیاں اتنی تیزی سے چلا کرتی تھیں کہ اُس کا ننھا سر چکرا جاتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے نازک ٹہنیاں خوبصورت مضبوط ٹوکریوں کا رُوپ دھارن کر لیتی تھیں۔ یہ ٹہنیاں بھی تو اُس کا باپ دلر جھیل سے لے آتا تھا۔ جب وہ باپ کو آتے دیکھتی تھی تو گائے کو بھول کر اُس کے پاس دوڑی دوڑی جاتی۔ اُس کی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ جاتی۔ باپ سنگھاڑوں کی تازی تازی رس بھری گریاں اُسے دیتا۔ ــ چباتے ہوئے اُس کا منہ میٹھے میٹھے دودھ سے بھر جاتا تھا۔

"اور گریاں دو" وہ مچل اٹھتی اور باپ اُسے بانہہ سے پکڑ کر سر پر رکھی، ٹہنیوں کے گٹھے پر اُچھال دیتا تھا۔ بھیگی بھیگی ٹہنیوں پر وہ بے طرح پھسلنے لگتی تھی۔ زمین کوسوں دُور محسوس ہوتی اور وہ مارے ڈر کے چیخنے لگتی

باپ ہنس دیتا اور دوڑ لگاتا۔ خطرناک جھٹکوں سے وہ ٹہنیوں میں دھنسنے لگتی
ٹہنیوں میں جگہ سی بن جاتی جس میں وہ سما جاتی۔ اُس کا ڈر زائل ہو جاتا اور اُسے
محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کالی گائے کی پیٹھ پر بیٹھی دندنا رہی ہے۔

— باپ کی یاد آتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو اُبھر آئے... شاید یہی دن
تھے۔ ایسا ہی موسم تھا۔ اُسے یاد کہاں۔ وہ شاید چھ سات برس کی ننھی
سی بچی تھی۔ لیکن ذہن کے تاریک خانوں میں دریائے جہلم میں باڑھ آنے کے خطوط
مٹ نہ پائے تھے۔ جہلم میں یوں تو ہر سال باڑھ آیا کرتی تھی اور لوگ جہلم میں
باڑھ آنے کے تصور سے ایسے مانوس تھے جیسے موسم بہار سے۔ اور لوگ
یہ بھی جانتے تھے کہ ہر سال باڑھ مویشی بہا لے جاتی ہے، گاؤں کے کچے پکے مکان
ڈھا دیتی ہے، اور فصلوں پر جھاڑو پھیر جاتی ہے۔ مال مویشی اور فصل بچاتے
بچاتے کچھ لوگ بھی بہہ جاتے تھے۔ اُن سے وابستہ اُمیدیں بھی بہہ جاتی تھیں۔ کچھ
دن اُن کو یاد کر کے رو دیا بھی جاتا تھا۔ اُن کے لواحقین سے ہمدردی بھی جتائی جاتی تھی
لیکن باڑھ اترنے کے ساتھ وہ لوگ بھی ذہنوں سے اُتر جاتے تھے۔ یادوں کے
ویرانوں پر نئی اُمیدیں اُگنے لگتیں۔ لوگ پھر سے لوٹ کر ملبے کے ڈھیروں کو سمیٹنے
لگتے۔ گھر بسنے لگتے۔ زندگی پھر سے موت پر چھانے لگتی تھی۔ باڑھ کی لپیٹ
میں آئے انسانوں کی جگہ نئے انسان اُبھر آتے۔ اُن سے نئے رشتے جوڑے جاتے
یہی کچھ ہوتا ہے یا یہی کچھ تو ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اُس کی ننھی سی زندگی میں کوئی
نیا باپ نہ اُبھر پایا تھا۔ اُس کی ماں نے کسی نئے انسان کو موقعہ نہ دیا۔ اسی لئے
شاید باپ کے خدوخال یادداشت سے میٹ جانے کے باوجود اُس کے ذہن
نے ایک خیالی باپ کو جنم دیا تھا۔ جو بہت اچھا تھا۔ ہر وقت لاڈ و پیار کرنے والا۔
فصل بے فصل سنگھاڑے لا کر دینے والا۔ اور جو شرارت کرنے پر بگڑ کر آسمان پر بھی نہ

ڈانٹتا جیسے اور باپ اپنے بچوں کو ڈانٹا کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ باپ کی
غیر موجودگی میں گھر کی حالت بالکل ابتر ہو گئی تھی۔ کالی گائے تو ڈوب ہی چکی تھی۔ باقی
مال مویشی بک گئے تھے۔ مکان کے سامنے ذرا تھوڑی بہت زمین۔ جو تھی بیکار پڑی
تھی۔ گھر کی چھت ٹوٹ کر گرنے کے قریب تھی۔ اور اسے مُنہ اندھیرے بارش برف
کی پرواہ کئے بغیر دلدل جھیل جانا پڑتا تھا تاکہ کچھ سنگھاڑے اکٹھے کر سکے اور ماں
بیٹی پیٹ بھر سکیں۔

اُس کی حیرانی بجا تھی۔ اِتنا کچھ ول کے.... گھر بار.... مال مویشی....
گاؤں والے اور وہ خود بھی ایک پتلی بے ہنگم لڑکی.... سوکھی مُولی جیسی.... اُس
کا نام کیوں بدل گیا.... کیوں نہ اس کا نام سوکھی ہو سکا.... آخر کیوں نہیں؟

پگڈنڈی سنسان تھی۔ آکاش پر بھی کوئی تارا نہ تھا۔ بادلوں کی دبیز
تہ نے تاروں کو بھی ڈھک رکھا تھا۔ اندھیرا کافی گہرا تھا۔ صرف دودھیا
رنگ کی لکیر مشرق میں نمودار ہونے لگی تھی۔ جس کی روشنی میں پھولی پگڈنڈی
پر جمع ہوئے پانی کے گڑھوں سے پیر بچا کر چل سکتی تھی۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف
کھیت خالی تھے اور خالی کھیت خاموشی کی چادر اوڑھے سوئے پڑے تھے۔ صرف
اس کے اپنے پیروں کی چاپ اس بھیانک خاموشی میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

— دفعتاً پھولی کو محسوس ہوا کہ نام کے متعلق سوچنے سے بے کلی نہیں گئی
آج وہ بہت سویرے گھر سے نکل پڑی تھی۔ اسکو اِتنے سویرے نہ آنا چاہیے تھا
کیا معلوم سرکنڈوں میں کون سے جانور چھپے بیٹھے ہوں۔ گھاس پھوس میں
کتنے سانپ پھنکارتے پھر رہے ہوں۔ سانپوں کا خیال آتے ہی وہ ڈر سے تھر تھر
کانپنے لگی۔ اور اس کا پاؤں پانی کے ایک بڑے گڑھے میں گرتے گرتے بچا۔

کاندھے پر رکھی روٹی کی پوٹلی میں ایک دو گانٹھ اور بڑھاتے ہوئے

وہ سوچنے لگی کہ یہ اُس کا قصور نہیں کہ وہ پو پھٹنے سے پہلے گھر سے نکل پڑتی۔ دن میں
وہ سنگھاڑے اکٹھے نہ کر سکتی تھی۔ پھر اُس کے پاس لائسنس بھرنے کے لئے
پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ اور دن بھر گارڈ لوگ ہرے رنگ کی کشتیوں میں وولر کی
لہروں پر گھوما کرتے تھے۔ کشتیوں کا ہرا رنگ وولر کی ہریالی میں بالکل نہ ابھر آتا
تھا۔ حتیٰ کہ کشتیاں سر پر پہنچ جاتی تھیں اور سنگھاڑے اکٹھے کرنے والیوں
سے پوچھ تاچھ ہوتی۔ کچے پکے سنگھاڑوں کی شناخت ہوتی تھی۔ سنگھاڑے
تولے جاتے تھے کہ کہیں ساری فصل ہی نہ اُڑا لایا ہو۔ سنگھاڑوں کے تحفظ کے
لئے خاص ہدایت کی گئی تھی۔ بغیر لائسنس سنگھاڑے اکٹھا کرنا جرم تھا۔ قانون
کا احترام کرانے کے لئے گارڈ لوگوں کی فوج میدان میں جھونک دی گئی تھی۔ قانون
توڑنے والوں کو پولیس کے حوالے کیا جاتا تھا۔ کچھ منچلوں نے احتجاج بھی کیا
کہ بھلا سنگھاڑے اکٹھے نہ کریں تو کھائیں گے کیا۔ لیکن حکومت نے یہ کہہ
کر ان کا منہ بند کر دیا تھا کہ تعمیری کام شروع ہوتے ہی لوگ مزدوری کریں۔ سرکار
سیلاب روکنے کے لئے بہت سارے اقدام لے رہی تھی۔

سرکار نے علاقہ کا نام بھی بدل دیا تھا۔ سن دور سے سن واری... سونے
کا گھڑا...... سونے کا آبخورہ یا سونے کا باغیچہ.... اوں ہوں.... کاش
اُس کا نام بھی کوئی بدل دے!!

"خدا جانتا ہے۔ سونا کب اُگ آئے گا یہاں..... " آخری الفاظ
پھولی بڑبڑا اٹھی اور ساتھ ہی وہ لرز گئی... چہار سو چھائی خاموشی میں اُسے
اپنی آواز بھیانک سی لگی۔

پھولی مزدوری کرتی — ماں کا اور اپنا پیٹ بھرنا تھا۔ اب اُسکی
بوڑھی ماں ٹوکریاں بھی نہ بُن پاتی تھی۔ ماں سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی اور بے حد

چڑچڑی ہو گئی تھی۔ وقت پر کھانا نہ ملتا تھا تو دن بھر صلواتیں سُناتی رہتی۔ اور جو کہیں زیادہ غصے ہو جاتی تو اُس کو مارنے سے بھی گریز نہ کرتی۔ ایسے موقعوں پر پھولی کو اپنی حالت پر رونا آتا۔ یقین نہ آتا کہ یہ بوڑھی ڈائن اُس کی ماں ہو سکتی ہے۔ یہ وہی عورت ہو سکتی ہے جس نے اپنی اکلوتی بچی کی خاطر خاوند کے مرنے کے بعد دوسرا گھر نہ بسایا۔ اِس بوڑھیا کے سوکھے پنجر میں نہ ہی دل دھڑک رہا ہے۔ جس کی دھڑکن کبھی اُس کے لیے وقف تھی۔ اور پھولی کے جی میں آتا کہ اِس بوڑھی کے سوکھے پنجہ کو اُٹھا کر جہلم میں پھینک دے۔ نہ کر سکے تو اِتنا کر سکے کہ مار مار کر اس کی پاپی ہڈی توڑ ڈالے۔ یہ بھی کوئی زندگی تھی کہ دن بھر کام کرتے کرتے مرو۔ اور رات بھر بوڑھیا کی گالیاں سُنتے رہو۔ لیکن ماں نہ ہونے کا احساس اسے بھیانک گہرائیوں میں دھکیلنے لگتا۔ اور ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ دریا میں نہاتے نہاتے دریا میں ڈبکی لگا گئی ہو اور پانی کے اندر بہت دور اندر چلی گئی ہو۔ جہاں آنکھیں کھولنے کے باوجود کچھ دکھائی نہ دے بلکہ پانی بدن کو جکڑنے لگے۔ اور پانی پانی کے سہارے کے باوجود جی بے سہارا ہو جائے۔ وہ اندھا دھند ہاتھ پیر چلانے پر مجبور ہو جاتی تاکہ دریا کی گہری گہرائیوں میں سے اُبھر پائے۔ دریا کی تہہ پر بکھرے گول گول سنگریزے یا چھوٹی چھوٹی نازک سیپیاں بھی اُسے دم گھٹتی گہرائیوں میں کچھ دیر اور رکنے کی ترغیب نہ دیتی تھیں۔ جب کبھی اُس کے ذہن میں ماں کی موت کا خیال پیدا ہوتا تو اُس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ بھلا وہ اکیلی بے سہارا... اس دُنیا میں کیسے رہ پائے گی۔ سنسان مکان میں رات بھر اکیلی سو سکے گی۔ مکان کے گھور اندھیرے میں کس کی اکھڑی سانس اُس کو سہارا دے گی کوئی نہ تھا اُس کا بوڑھیا کے بغیر اس بے رحم دُنیا میں!

اس لئے وہ چپ چاپ بوڑھیا کی مار سہہ لیتی تھی. گالیاں سُن لیتی تھی. اس کا بس چلتا تو وہ مزدوری کرنے بھی جاتی۔ پر مزدوری ملے بھی. سوکھی سوکھی کمزور سی لڑکی کو بھلا کون کام دے۔ ایک ٹوکری بھر مٹی تو تھا وزن اس کا. چار و ناچار اسے ڈلر جا کر خود سنگھاڑے اکٹھے کرنے پڑتے تھے. لائسنس نہ ہونے کی وجہ سے وہ منہ اندھیرے گاؤں سے نکل پڑتی تھی. جب گارڈ لوگ لحافوں میں دُبکے رہتے تھے. اور سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے وہ گھر لوٹ آتی تھی. پہلے پہل اُسے بہت تکلیف محسوس ہوئی تھی. رات کے اندھیروں میں بھٹکنا ...... ٹھنڈے برف جیسے پانی کا مس اور سنگھاڑوں کی چبھن... زخمی ہتھیلیوں پر کڑوا تیل ملنے والا بھی کوئی نہیں تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ اس زندگی سے مانوس ہو گئی. اب تو عادت سی ہو گئی تھی اُسے منہ اندھیرے ڈلر جانے کی اور وہ نہیں جانتی تھی کہ زندگی کی کوئی بھی حرکت جب عادت بن جاتی ہے تو اعتدال کی حدیں ٹوٹنے لگتی ہیں اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے. بھلا سولہ برس کی الھڑ لڑکی کیا جانے ایسی باتیں۔

سرکنڈوں کی قطاریں گھنی ہوتے لگیں، اور فضا میں کہرے کی لہریں اُمڈنے لگیں۔ رات بارش ہوئی تھی۔ اس لئے سارے ڈلر پر کہرے کے بادل منڈلا رہے تھے. پھُولی کو تسکین سی ملی - کہرے کی وجہ سے وہ دن کے پہرے داروں کی نگاہوں سے اوجھل رہے گی. اور بہت سارے سنگھاڑے اکٹھے کر سکے گی. پھر تو دو چار دن آنے کی ضرورت نہیں. ویسے سر کے بال میلے اور اُلجھے گئے تھے. جوئیں بھی پڑ گئی ہوں گی سر میں. وقت ملا تو وہ بال بھی دھو ڈالے گی اور آنگن میں دھوپ سینکتے سینکتے کپڑے بھی نکال لے گی۔ وہ بہت خوش ہوئی ویسے کھردری زمین میں بھی نرمی پیدا ہو رہی تھی. آگے کچھ قدم پر کیچڑ شروع

ہونے والی تھی اور کیچڑ سے ذرا پرے ڈلر کے پانی کی سطح۔ پھولی نے دیکھا
چاروں طرف کہرے کے بادل اٹھلا رہے تھے۔ لمحہ بھر کے لئے اُس کے دل
میں آیا کہ کیوں نہ کچھ دیر رک کر کہرے کے مرغولوں کو تاکتی رہے۔ کہرے کی لہریں
ایسے اٹھلا رہی تھیں جیسے کسی پری کے بال ہولے ہولے دوش پر اٹھلا رہے ہوں
ویسے کچھ دیر سستا بھی لیتی وہ پیدل چار میل کے قریب چل کر آئی تھی۔
ٹانگوں میں تھکن ابھر آئی تھی۔ لیکن دوسرے لمحے یہ سنہری خیال پیٹ میں
بڑھتے تاریک خلا میں ڈوب گیا۔ اُس نے کندھے پر سے روٹیوں کی پوٹلی
اُتار کر نزدیک ہی سرکنڈے کی جڑ میں چھپا دی اور شلوار کو اونچا کرتے ہوئے
آڈلر کے مٹیلے پانی کی طرف بڑھنے لگی۔ کہرے کی ایک دبیز لہر اُسے چھو گئی اور
ننگی ٹانگوں میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ وہ رُک گئی۔ کہرا آج واقعی گھنا
تھا۔ نگاہیں کچھ فاصلے تک ہی جا پاتی تھیں۔ کیا ضرورت تھی شلوار بھگونے
کی۔ بھیگی شلوار ٹانگوں پر پڑی بری لگتی تھی اور واپس جاتے وقت بھیگی شلوار
میں ٹھنڈ سے ٹانگیں اکڑ جانے کا خطرہ تھا۔ آج سردی تیز تھی۔ شلوار کو نکال
کر کسی سرکنڈے پر رکھ دے۔ اور پانی میں بڑھتے بڑھتے قمیض کو بتدریج
اونچا کرتی جائے تو شلوار بھیگنے سے بچ جائے گی۔ فیصلہ کر کے اُس نے
چاروں اور نگاہیں دوڑائیں۔ کہرے کے بادل اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ اُس
نے ایزار بند ڈھیلا کرنا شروع کیا۔ پیٹ پر ٹھنڈے پانی کا لمس بُرا
محسوس ہوا۔ شلوار کو سرکنڈے کی ٹہنیوں پر پھینک کر وہ آگے کو بڑھنے
لگی۔ کیچڑ گہری ہوتی جا رہی تھی اور پاؤں چپ چپ کی آواز پیدا کر رہے تھے
وہ کمر تک پانی میں تھی۔ پانی کی سطح کا زیر و بم اُس کے جسم کو بری طرح
سے کاٹ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے جسم سے بے نیاز سنگھاڑے چننے میں مصروف

اس کی انگلیاں پانی میں اُگی گھاس پھوس میں ایسے چل رہی تھیں جیسے ماں کی انگلیاں
بہت پہلے ..... ٹوکریاں بُنتے وقت چلا کرتی تھیں۔ ایک ہی وقت دونوں ہاتھوں
سے سنگھاڑے ٹٹولنے کے لئے اُس نے پھرن کو کمر پہ گانٹھ دے کر روکا تھا
تاکہ سنگھاڑے جمع کر سکے۔ اور پھرن کا جھول پُر ہوتا جا رہا تھا۔ انگلیاں تھک
نہ جاتیں تو سورج نکلنے تک وہ پھرن کے کئی جھول بھر سکتی تھی۔

یکایک کہیں سے سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔ جیسے سرکنڈے آپس
میں ٹکرا رہے ہوں۔ گھبرا کر اُس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ گھنے کہرے
کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ کہرے کے دبیز بادل دبیز پردوں کی طرح لہرا رہے
تھے۔ شاید مرغابیاں ہوں۔ ڈر زائل ہونے سے پہلے اُس نے ہری ایک دھند
کے دبیز پردوں میں اُبھرتے دیکھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہری نوک اُبھر کر کشتی کے سر
کی شکل اختیار کرنے لگی۔ اُس نے بھاگنا چاہا۔ لیکن پیر کیچڑ میں دھنسے پڑے
تھے۔ بے تحاشہ اُس کے ہاتھ پھرن کی گانٹھ کھولنے کو بڑھے۔ انگلیاں الجھ
گئیں۔ کئی سنگھاڑے بھی انگلیوں میں چبھ گئے۔ اور جب تک وہ گانٹھ کھول
کر پھرن کو آزاد کرتی ہری کشتی اس کے سر پہ آ پہنچی۔ کشتی کے بیچ میں عبدالسلام
گارڈ چپو تھامے بھوت کی طرح بیٹھا دکھائی دیا۔ بھوت کا چہرہ مکروہ ہنسی میں
لپٹا پڑا تھا۔ آنکھوں میں وحشت کوند رہی تھی۔ اور منہ کے ارد گرد مونچھوں کے
سروں پہ درندگی پر تولتی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ڈل کے ٹھنڈے پانی کا اثر
..... کچھ شرم و حیا کا اثر، اور کچھ ان خوفناک آنکھوں کا سحر جیسے آنکھیں
نہ تھیں بلکہ انگاروں کے انبار تھے۔ پھولی بے سدھ سی ہو گئی۔

عبدالسلام نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سحر توڑ دیا۔
"آج پھنس گئی نا مچھلی جال میں ۔ روز جل دے کر نکل جاتی تھی۔ آج

پھنس گئی مچھلی ........."

"ہیں .... ہیں .... ہیں .... پھوٹی نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی، لیکن پیر اُٹھ ہی نہ پاتے تھے۔ جیسے دلدل کی تہہ پر کھیلی کیچڑ نے جان بوجھ کر اُس کے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ کاش وہ ایک قدم پیچھے ہٹ سکے۔ کاش عبدالسلام کی آنکھیں ایک دفعہ .... صرف ایک دفعہ جھپک جائیں۔ کاش اُس کی مونچھیں یوں تنی نہ رہیں .... یہ مونچھیں کہاں تھیں۔ سرکنڈوں کی جھاڑیاں تھیں شاید۔ خوفناک سرکنڈوں کی جھاڑیاں، جن میں پانی کے سانپ چھپے بیٹھے ہیں .... پانی کے سانپ .... پانی کے سانپ کچھ زیادہ زہریلے نہیں ہوتے .... بالکل زہریلے نہیں ہوتے .... زہریلے نہیں ہوں گے۔ یقیناً زہریلے نہیں ہوں گے اسے چاہئے ہمت کر کے پاؤں پیچھے کو بڑھائے۔ پانی کے سانپ بالکل زہریلے نہیں ہوتے .... بالکل زہریلے نہیں ہوتے ......

بھرم رکھنے کے لئے کچھ راشن آ بھی جاتا تھا تو پلک جھپکنے میں یا راشن کالے بازار کی بھینٹ ہو جاتا تھا یا بڑے افسروں کے کوارٹروں میں گم ہو جاتا تھا عام ملازم منہ تکتے رہ جاتے۔ اِس پر طرّہ یہ کہ چُنگی والے ایک دانہ اِدھر اُدھر کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ حرامی کہیں کے۔ راتوں کو سیٹھ بنیوں کے ٹرک گزرتے رہتے تھے اور کوئی غریب اپنے کھانے کے لئے ایک پاؤ سیر اناج لیکر پکڑا جائے تو قانون بگھارنے کے لئے سبھی اُس پر پل پڑتے تھے۔ اگر وہ خود اپنے دماغ سے کام نہ لے تو اُس کی حالت بھی غیر ہو گئی ہوتی۔ شہر سے تھوڑا بہت ساگ سبزی منگا کر اپنے افسروں کی نذر کرنے سے اُس کی بہت ساری مشکلیں حل ہو گئی تھیں۔ اُس کی ڈیوٹی دفتر کی بجائے دلریہ لگا دی گئی تھی جہاں روز کوئی نہ کوئی سنگھاڑے چوری کرتے پکڑا جاتا تھا۔ اور روز کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ لیکن اِس میں بابوؤں کا حصّہ، اکونٹنٹ کا حصّہ، ہیڈ کلرک کا حصّہ، حتیٰ کہ دفتر کے چپراسیوں کا حصّہ بھی الگ کرنا پڑتا تھا۔ چوری کے مال پہ ہر ایک کی حیثیت ایک برابر تھی۔ ورنہ اکیلا تو وہ مہاجن بن گیا ہوتا۔ یہ سونہ وادی نہ تھی بلکہ جہنم کی سرزمین تھی، نہ اُف کرنے کی اجازت اور نہ فریاد کرنے کی اجازت۔ اور کام کا یہ حال کہ گھر جانے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اب کوئی بیوی بچے لانا چاہے تو اُس کی بھی اجازت نہیں۔ حکومت کا خیال تھا کہ بیوی بچوں میں رہ کر ملازمین مستعدی سے کام میں جُٹے نہیں رہینگے ..... یہ سالی حکومت ..... !

کئی مہینے ہو گئے تھے اُسے یہاں آئے ہوئے اور بیوی بچوں کی یاد نے اُسے بے کل کر دیا تھا۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزرتی تھی اور بدن میں عجیب سی گھٹن رچی رہتی تھی۔ اِس گھٹن کو کم کرنے کے لئے کشتی چلانے کے سوا

عبدالسلام ایسے ہی کسی موقع کا منتظر تھا۔ تب سے..... جب اُس
نے پہلی بار سرکنڈے کی آڑ سے پھولی کو بے حجابانہ سنگھاڑے چوری کرتے
ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شاید مہینہ پہلے کی بات تھی یا شاید کئی مہینے پہلے کی بات
تھی۔ اِس جگہ آکر تو وقت کا احساس بھی مرنے لگا تھا۔ لیکن اُسے یاد تھا
کہ اُس دِن صُبح صُبح جب وہ کشتی میں بیٹھ کر ڈلر کی طرف چل پڑا تھا۔ ڈلر
رات کی لمبی خاموشی سے اُکتا کر ہلکی ہلکی کروٹیں لے رہا تھا۔ اور ان ہلکی ہلکی
کروٹوں پر اُس کی کشتی ڈولتی جا رہی تھی۔ ہلکے ہلکے..... دھیرے دھیرے
جیسے کوئی محبوب کسی عاشق کی گود میں ہولے ہولے ڈول رہا ہو۔ اور اُسے
محسوس ہوا تھا کہ ڈلر کا سینہ نہیں ڈول رہا ہے۔ بلکہ اُس کی اپنی بیوی کا سینہ ڈولتا
جا رہا ہے۔ جب وہ تھکن اور نیند سے بے خود ہو کر اُس کے بازو پر سر رکھ کر غافل
ہو جاتی تھی۔ کئی مہینے ہو گئے تھے اُسے گھر چھوڑے ہوئے۔ سو یہ ساری تبدیلی
کیا ہوئی تھی اُس کی تو جان پر بن آئی تھی۔ نہ رہنے کو مکان ملتا تھا اور نہ
کھانے کو چاول اور نہ ہی بدن کی گرمی برقرار رکھنے کے لئے ایندھن۔ دِن
کو بھوکوں مرو، اور راتوں کو منجمد بستر میں اکیلے ٹھٹھرتے رہو۔ یہ ٹھیک تھا
کہ حکومت نے راشن اور بالن دینے کا انتظام کر دیا تھا۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ
حکومت ایسا انتظام کرتی رہتی ہے۔ ورنہ حکومت کے کیا معنی۔ لیکن کاغذی
کارروائی کو چھوڑ کر باقی کچھ نہ کرنے کے برابر تھا۔ اور جو کبھی کبھار حکومت کا

اُس کے پاس کچھ کام بھی نہ تھا۔ ایسے میں سرکنڈوں کے بیچ میں کوئی سنگھاڑے چوری کرتا ہوا پکڑا جائے، چاہے وہ گنوارن ہی کیوں نہ ہو تو ہوس پوری کرنے کی خواہش مچلنے لگتی ہے۔ اِس لئے چپو سے پتوار کا کام لے کر اُس کی کشتی قوس بناتی ہوئی سرکنڈوں کے بیچ سے گزر گئی۔ سامنے کوئی لڑکی مجسّم اُس کی بیوی سنگھاڑے اکٹھا کر رہی تھی۔ بے ہنگم لڑکی نزدیک آکر اُس کی بیوی کے بالکل برعکس نکلی۔ پتلی اور پنی تلی لڑکی کے چہرے پر بلا کی جاذبیت تھی اور بدن پر چاندنی کی چمک رقصاں تھی۔ اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

لڑکی اُسکو سامنے پاکر بوکھلا گئی۔ وہ سنگھاڑے پھینک کر کنارے کی طرف بھاگ گئی۔ عبدالسلام بھی کچھ کم تیز نہ تھا۔ اُس نے پانی میں چھلانگ لگائی اور لڑکی کو پکڑ لیا۔ دونوں پانی میں غوطہ کھا گئے۔ اور جب دونوں ایک دوسرے کا سہارا لے کر اُٹھے تو عبدالسلام کے بازوؤں میں لڑکی مچھلی کی طرح کسمسا رہی تھی۔ مچل رہی تھی۔

پانی ٹھنڈا تھا۔ ڈل کی تہہ میں کیچڑ تھی اور اُن کی کشمکش سے کیچڑ اُبل کر پانی کو گدلا رہی تھی۔ لیکن عبدالسلام ان سب چیزوں سے بے نیاز تھا۔ لڑکی کو بازوؤں میں مچلتا محسوس کر کے اُس کے سارے بدن میں تناؤ اُبھر آیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دنیا کو توڑ پھوڑ دے۔ کیچڑ کو روندتا مسلتا ڈل کی لہروں کو چیرتا پھاڑتا پھرے۔ کچھ نہ کر سکے تو کم از کم اس لڑکی کو سینے سے اتنا لپٹا لے اتنا لپٹا لے کہ ساری لڑکی اُس کے جلتے سینے میں جذب ہو جائے۔ لیکن اُسے سنبھلنا پڑا۔ آوازیں سن کر گاؤں کے لوگ ان کی طرف دوڑ رہے تھے۔ بمشکل اُس نے لڑکی کو اپنے آپ سے جُدا کیا اور کنارے پر آیا۔ لوگ نزدیک آنے لگے تو عبدالسلام نے لڑکی کے بازو پر

اپنی گردنت ذرا ڈھیلی کر لی اور ڈانٹنے لگا۔

" لائسنس کہاں ہے تمہارا۔ جواب دو۔ کہاں ہے لائسنس !"

عبدالسلام کی آنکھوں میں رقصاں خواہشات نے لڑکی کو بُری طرح سے جھنجھوڑ دیا تھا۔ اُس کے بدن میں ڈر کی تھر تھری رواں تھی اور بھیگے کپڑے بدن سے بُری طرح چپک گئے تھے۔ جیسے بدن پر کپڑے نہ ہوں بلکہ وہ ننگی کھڑی عبدالسلام کی آنکھوں کا مرکز ہو۔ وہ ہکلانے لگی۔

" لائسنس ..... لائسنس نہیں ہے .... لائسنس نہیں ...!"

" لائسنس نہیں ہے.... ہوں ....." عبدالسلام کی جان میں جان آگئی۔ کہیں ہوتا لائسنس اس لڑکی کے پاس تو اس کشمکش کا انجام بُرا ہوتا۔ اُس نے اپنا بھیگا کوٹ نکالا۔ مارے ٹھنڈ کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ یہ تو اِن ہی گنواروں کا دِل گُردہ تھا جو دِن بھر اس یخ بستہ پانی میں ڈٹتے پھرتے تھے۔ کوٹ کی جیب میں رکھی سگریٹ کی ڈبیہ کا ستیاناس ہوگیا تھا۔ اُس نے ڈبیا پھینک دی۔ ایک ماہی گیر نے ڈبیا اُٹھائی اور احتیاط سے بھیگے سگریٹ ڈبیا سے نکالنے لگا۔ سُکھا کر شاید پی لے۔ عبدالسلام کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا۔ ذرا سی محنت سے سگریٹ استعمال کے قابل ہو جاتے۔ غلطی ہو گئی جو ڈبیہ پھینک دی تھی۔ اب واپس مانگنا اتنے سارے آدمیوں کے سامنے خود کو اُن کی نظروں سے گرا دینا تھا ... بھکاری کہیں کے ..... کچھ نوٹ بھی بھیگ گئے تھے۔ نوٹوں کو تہ بہ تہ جماتے ہوئے اُس نے لڑکی کو گھورا۔ ماہی گیر عبدالسلام کو جانتے تھے۔ اُس سے ڈرتے تھے۔ اس لئے ہر کوئی اپنی طرفداری جتا رہا تھا۔ رائے دے رہا تھا اور پھُولی پر بس رہا تھا۔

"میں کہتا ہوں گارڈ صاحب۔ اس کو لے چلو تھانے"

"لے چلنا پڑیگا۔ بھاگی جارہی تھی۔ وہ تو میں نے پانی میں چھلانگ لگاکر پکڑ لیا ورنہ سرکنڈوں میں تمام ۔ ہو گئی ہوتی"

عبدالسلام سی سی کرتے ہوئے بولا

"میں ...... میں ... میں پھر چوری نہیں کروں گی ..... قسم اللہ کی! لڑکی رونے لگی۔

لڑکی کو روتے دیکھکر ماہی گیر نے جراٴت کی"۔ جانے دیجئے صاحب ..... کافی سزا ملی ہے۔ اب ایسی حرکت نہیں کریگی .."

شہ پاکر سب لڑکی کی طرفداری کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ "ہاں صاحب جانے دیجئے۔ صرف بوڑھی ماں ہے اس کی اور کوئی نہیں ....

عبدالسلام چاہتا یہی تھا کہ لڑکی کو چھوڑکر اس کے دل میں اپنے لئے جگہ پیدا کرلے۔ لیکن لوگوں کا شک دُور کرنے کے لئے اس نے ذرا سی بحث کی۔

"معافی مانگ لے۔ کان پکڑکر کہہ پھر چوری نہیں کریگی!"

لڑکی ڈر گئی۔ وہ کسی طور ان وحشتناک آنکھوں سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ تھانے کا نام سُن کر وہ اور بھی ہراساں ہو گئی تھی۔ پولیس کی بے ضابطگیوں اور ظلم و جبر کا گاؤں کے بچے بچے کو علم تھا۔ اُس نے عبدالسلام کے رویئے کو ظاہر کرنے کی بجائے معافی مانگنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔

عبدالسلام کو لڑکی کے معافی مانگنے کا انداز بڑا پیارا لگا۔ سر جھکا کے دونوں ہاتھ جوڑ کے لڑکی ہولے ہولے اُس کے سامنے جھک گئی۔ جھکنے کے سبب لڑکی کے پیرہن میں جھول سا آ گیا۔ سینے کی دودھیا چمک سا.....

عبدالسلام کی آنکھوں کے سامنے مچل گئی۔ سردی کے باوجود اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے پھوٹ پڑے۔ دیکھتے دیکھتے یہ ننھے ننھے پسینے کے حقیر قطرے.... ایک سے ایک مل کر.... اس کی خواہشات کا دھارا بن گئے اور گندہ وادی کی دلدل میں اُس کی بے کیف زندگی کے لئے ایک نیا راستہ چیرنے لگے۔

اور کئی مہینوں سے عبدالسلام کا معمول بن گیا تھا کہ موقعہ بے موقعہ ڈلر آجاتا۔ سرکنڈوں میں تاک لگائے بیٹھتا۔ نرکلوں میں چھپا جا بچتا، پر لڑکی سے کبھی مڈبھیڑ نہ ہوتی۔ جب کبھی سامنا ہوا بھی تو کوئی نہ کوئی آس پاس ضرور ہوا کرتا اور جب کوئی بھی آس پاس نہ ہوا کرتا تو لڑکی اُس کی پہنچ سے دُور ہوا کرتی تھی۔ اور وہ اکیلے کیلے ہی اپنی ناؤ میں بیٹھا دل مسوس کر رہ جاتا تھا لڑکی اُس سے بہت خائف ہو گئی تھی۔ نہ وہ ڈلر آتی تھی اور نہ سنگھاڑے اکٹھا کرتی تھی۔ عبدالسلام نے سوچا کہ لڑکی سنگھاڑے اکٹھے کرنے نہ آئیگی تو کھائے گی کیا۔ اُس نے لڑکی کے متعلق چھان بین کی۔ تب اُسے معلوم ہوا کہ اُس لڑکی کا نام پھوٗلی ہے۔ اُس کی ایک بوڑھی ماں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ وہ ڈلر آتی ہے۔ ضرور آتی ہے اور موقعہ بے موقعہ آجاتی ہے۔ اس لئے عبدالسلام بھی موقعہ بے موقعہ ڈلر آجاتا تھا۔ کبھی طوفانی لہروں میں آتا اور کشتی ڈوب ڈوب جاتی۔ کبھی بھیانک سیاہ راتوں میں آجاتا اور کشتی سرکنڈوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک بھٹک جاتی۔ شام کے دھندلکے میں آجاتا جب ڈوبتے سورج کی شعاعیں ڈلر کے پانی میں آگ سی لگا دیتی تھیں، اور کبھی سحر پھوٹنے سے پہلے ڈلر کی خاموشی میں اپنے چپوؤں سے ارتعاش پیدا کیا کرتا تھا۔ یہی ایک تلاش رہ گئی تھی اُس کے وجود کی بیداری کی بار

کہلا بھیجا کہ چھٹی لے کر چلے آؤ۔ دونوں بچے بابا کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔
لیکن پھولی کی چال ڈھال۔ پھولی کے ہاتھ سکیڑنے کا انداز... پھولی کا
چاندی جیسا رنگ۔ بیوی کی صورت پر چھا جاتا۔ اُس کے ارادوں کو تحس
نحس کر کے بچوں کی پرچھائیاں ذہن سے مٹا دیتا اور وہ دنیا و مافیہا سے
بے خبر دن رات ڈولر کے سینے پر لوٹتا پھرتا تھا۔

پھولی کی گوری باہیں عبدالسلام کی گرفت میں جکڑی پڑی تھی، اور پھولی کمر تک پانی میں کھڑی، سہمی سہمی عبدالسلام کو دیکھ رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے عبدالسلام کے دل میں رحم کی لکیر سی دوڑ گئی۔ پھولی بیچاری۔ بہت ڈر رہی تھی۔ گھبراہٹ کے مارے اس کی آنکھیں پھیل رہی تھیں اور ہونٹوں کے کنارے خوف سے کپکپا رہے تھے۔ اُسے یوں نہ پیش آنا چاہئے۔ اُس کے گھر میں بیوی ہے۔ نو بچے ہیں۔ وہ پینتیس برس کا ہو گیا ہے اور یہ لڑکی بہت چھوٹی ہے۔ اُسے واقعی یوں نہ پیش آنا چاہئے۔ لیکن دوسرے لمحے ڈولتے شفاف پانی میں لڑکی کی نظر آتی ہوئی، ننگی رانیں۔۔ جو پانی کی حرکت سے ارتعاش کرتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں جیسے لہراتی ہوئی دودھ کی دو دھاریں۔۔ ...... یا بجلی کی لکیریں .... یقیناً بجلی کی لکیریں ..... عبدالسلام کے ذہن میں ہر جذبے کو چاٹ گئیں اور اس نے پھولی کو کشتی کی طرف کھینچنا شروع کر دیا... کشتی کے کھردرے کناروں کا لمس پھولی کے جسم کو کاٹ گیا۔ اُس کے ذہن کو جھنجھوڑ گیا۔ وہ ہوش میں آ گئی۔ ویسے اب عبدالسلام کی خطرناک آنکھیں اُسے ایک ٹک نہ گھور رہی تھیں۔ جدوجہد کے بندھ آزاد ہو گئے۔ اُس کے حلق سے چیخیں اُبھر آئیں۔ اُس کے ہاتھ پیر چلے۔ غصے اور نفرت کا ایک بھیانک طوفان پھوٹ پڑا۔ جس کی تیزی سے کشتی اِس بری طرح ڈولنے لگی کہ اب ڈوبی ...... اب ڈوبی .....؛

عبدالسلام ڈوبتی کشتی سے بے نیاز پھولی کو گھسیٹتا ہوا بانٹھا ۔ کمرے کی چیخیں بڑی
دلدوز تھیں جیسے کسی ... کو ذبح کیا جا رہا ہو ۔ ان چیخوں نے ... زندگی کے احساس
کو راسخ کردیا ۔ وہ جھنجھلا اٹھا ۔ ایک ہاتھ چھڑا کر اس نے پھولی کا منہ بھینچنا چاہا ، پھولی
نے ہاتھ پر کاٹ کھایا ، درد کی شدت سے وہ بپھر اٹھا ، اُس نے ایک زوردار ہاتھ
پھولی کے منہ پر دے مارا ۔ پھولی کے منہ سے لال رنگ کے چھینٹے سے اڑے ، اور وہ بے دم
ہو گئی ۔ عبدالسلام کے دوسرے جھٹکے نے اسے کشتی کے اندر گرا دیا ۔ ڈر کی گہرائیوں نے
جتنی ستر پوشی کی تھی وہ ... جھپکتے ہی ختم ہو گئی ۔ اُس کے ہاتھ جو بچاؤ کی خاطر عبدالسلام
کے چہرے اور جسم کو نوچنے میں مصروف تھے ستر پوشی کی طرف بڑھے ، عبدالسلام کو
موقع مل گیا ۔ ایک ذرا سی کشمکش ، ایک ہلکی سی چیخ ...... اور وہ بے سہارا خلاؤں میں ڈولنے
لگی ۔ اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں ، بدن تھرتھرانے لگا ۔ اور دل سے ہوک اٹھی ۔ کہ وہ
بے شعور ہو جائے ۔ بے ہوش ہو جائے ...... مر جائے ۔

——— شہنائی والے زور و شور سے شہنائی بجا رہے تھے ، ڈھول کی
آوازیں ساتھ نہ ہوتیں تو شہنائی کی لے اور بچوں کی چیخوں میں کوئی فرق نہ محسوس ہوتا ۔
شہنائی کی پتلی تیکھی آواز تیز نیزوں کی طرح کان کے پردوں کو چیرے جا رہی تھی ۔ شہنائی
کی چیخ پکار ، ڈھول کا دھوم دھڑکا ...... بچوں کی ریں ریں ، عورتوں کے بے ہنگم گیت اور
مردوں کے کرخت قہقہے ...... ایک شور ہوتا ، ایک آواز ہوتی تو شاید وہ
برداشت کر لیتی ۔ پر یہاں تو جیسے آتش فشاں پھٹ رہا تھا ۔ اپنے کان دونوں
ہاتھوں سے دبا لے ۔ ... اس کا تنہا کا ذہن اس شور و غل سے نجات پا لے ۔ لیکن وہ
کان بند کر سکتی تھی ۔ دونوں ہاتھوں پر مہندی کا لیپ تھا ۔ بہری گاڑھی لال جیسی مہندی
لگانے کا اسے بے انتہا شوق تھا ۔ بچپن سے شوق تھا ۔ جب کبھی وہ ... جاتی تھی تو
سہیلیوں کے ساتھ کھلیان میں درختوں کی آڑ لے کر ... چھپ کے چھپ کے ...

کے طور پر کانوں میں سجائے جاتے تھے۔ سنگھاڑ ولکی لوگیں کان کے چھید میں بڑی آسانی سے گھس جایا کرتی تھیں۔ کیچڑ کا گارا بناکر مہندی کے بدلے ہتھیلیوں اور تلووں میں لگایا جاتا تھا۔ گھاس کی بٹی رسیوں میں ٹنگے پھول بدن پر زیوروں میں منتقل ہو جاتے تھے اور وہ گھنٹوں گھونگھٹ اٹھانے گرانے کی مشق کیا کرتی تھیں اور جو کہیں حقیقی بیاہ شادی پر مہندی لگانے کا موقعہ مل جاتا تو وہ ہاتھوں اور پیروں کو مہندی سے خوب لیپ پوت کر سُرخ مرچ بنا دیتی تھی۔ یہ رنگ مہینوں جما رہتا تھا۔ کبھی داؤ چل جاتا تو مہندی کی کٹوریاں چھپا کے رکھ دی جاتی تھیں۔ تاکہ بعد میں لگانے کے کام آجائے۔ آج بھی شاید کسی کا بیاہ تھا۔ اُسے آج ضرور کچھ مہندی چھپا کے رکھنی چاہئے۔ بہت دنوں بعد کسی کا بیاہ ہو رہا تھا۔ ورنہ اتنا غل غپاڑا نہ مچتا۔ چوک گئی تو مہینوں مہندی لگانے کا موقعہ نہیں مل سکے گا۔ واقعی آج کسی کا بیاہ ہوگا۔ لیکن دلہن ہے کہاں .... کہیں مہندی کے کٹورے میں تو نہیں ڈوب گئی۔ ڈوب جائے اس کی بلا سے۔ اُسے تو برات کا انتظار تھا۔ سہرا باندھے دولہا گھوڑے پر چڑھ کر آئیگا۔ اُسے مسند پر بٹھا دیا جائیگا۔ براتیوں کی دعوت ہوگی۔ پر دولہا شرم کے مارے شاید کچھ نہ کھا سکے بے چارہ دولہا.......... وہ خود دولہا ہوتی تو پیٹ بھر کر دعوت کھاتی۔ اور گھوڑے پر بھی نہ بیٹھ آتی۔ کہیں گھوڑا آتشبازیوں سے بھڑک اُٹھے اور گرا دے تو ہاتھ پیر ہی ٹوٹ جائیں۔ گالی لگانے کی تو اور بات ہے۔ اب تو وہ بھی نہ رہی۔ اس لئے گھوڑے پر ضرور بیٹھنا پڑیگا۔ باز آئی وہ دولہا بننے سے۔ دولہن بننا ہی اچھا رہے گا۔ زیور اور اچھے کپڑے تو ملیں گے پہننے کو۔ دولہن کے کپڑے پہن کر تو وہ شہزادی بن جائے گی۔ شرائط خود ہری ہو جائے گی۔ مولوی جی آئیں گے۔ نکاح پڑھیں گے اُس سے اقرار کرائیں گے۔ بھلا دولہا کانا ہو یا لنگڑا ہو تو اقرار کیسے کرے گی۔ انکار بھی نہ کر سکے گی۔ سارے براتی اُس کو نوچ کے رکھ دیں گے۔

اور جو دولہے کی لمبی گھنی مونچھیں ہوں۔ لاکرار مونچھیں ہوں تو۔۔۔
پھر بڑی مشکل ہو گی۔ پر وہ تو شہزادی ہے۔ شہزادی کا دولہا کوئی
شہزادہ ہو گا۔ چاند سا۔۔۔۔۔۔۔ کہانیوں میں تو چاند جیسے دولہا
ہی آتے ہیں۔ اور اُسی جیسی شہزادی کو بیاہ کرنے جاتے ہیں۔ اور
وہ دولہا کو دیکھ بھی نہ سکے گی۔ چہرے پر سہرا پڑا ہو گا۔ اور
مشعلوں کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہو گی۔ سہیلیاں تو
کنٹھے پر گیری جا رہی ہوں گی۔ اتنے سارے لوگوں کے بیچ وہ
ہاں بھی نہ کہہ سکے گی۔ اُفوہ۔۔۔۔۔۔ زیور اور کپڑوں
کے بوجھ سے اُس کا سر جھکا جا رہا تھا۔ یہ شور۔۔۔۔۔۔ یہ
جگمگھٹا۔۔۔۔۔ گھونگھٹ کوئی ہٹا دے۔۔۔۔۔۔ اس کا دم گھٹ
رہا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے ہٹا دے گھونگھٹ تو۔۔۔۔۔ اپنے
ہاتھوں سے۔۔۔۔ ہاتھوں میں تو مہندی رچی ہے۔۔۔۔ وہ
کیا کرے۔۔۔۔۔ اُس کا سانس۔۔۔۔۔۔۔۔ اُفوہ۔۔۔۔ کوئی
ذرا اُس کا گھونگھٹ۔۔۔۔۔ یہ اندھیرا۔۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔

—— پھولی نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولنے سے
پپوٹوں میں درد سا محسوس ہوا۔ شاید صدیوں سے وہ آنکھیں
بند کیے بیٹھی تھی۔ درد کی شدت سے دو آنسو گالوں پر بہتے
محسوس ہوئے۔ گالوں پر سنسناہٹ کی لکیریں سی بڑھ رہی تھیں،
اور وہ اپنے چہرے سے مانوس ہونے لگی۔ کہیں سے کوئی
ہاتھ بڑھا اور اُس کے گالوں کو چھو گیا۔ اور اُس کے اپنے
بازو وہیں تھکن سی محسوس ہوئی۔ لمحہ بھر کے لیے وہ حیران

سی ہو گئی۔ اُس کے بازو میں تھکن کیوں پیدا ہوئی۔ اور یہ
بازو جو سامنے لہرا رہا تھا۔ کہاں سے آیا۔ یہ نوکیلی سوکھی
انگلیاں جن کے ناخن کیچڑ کی تہہ تلے دب سے گئے ہیں۔ اُس نے اپنا
ہاتھ لہرانے بازو کو چھونے کے لئے بڑھایا۔ دوسرے
بازو میں بھی تھکن کی لہر رواں ہو گئی۔ درد کی شدت نے اُسے
ایک بار پھر آنکھیں میچنے پر مجبور کیا اور تب اُسے محسوس ہوا کہ
یہ بازو اُس کے اپنے بازو ہیں۔ اِن نوکیلی سوکھی انگلیوں
سے وہ سنگھاڑے اکٹھے کرتی ہے۔ پر یہ تھکن کیوں...
..... یہ درد کیسا۔ ابھی تو اُس کی انگلیاں کسی سنگھاڑے
کو چھو نہ گئیں۔ نہ ہی ڈھیر سارے سنگھاڑے اُس کے بازوؤں
میں جھول گئے۔ تو پھر یہ تھکن کیسی۔ اُس نے آنکھوں کو پھر سے
کھلنے پر مجبور کر دیا۔ چاروں طرف دھند کے مرغولے پرواز
میں محو تھے۔ ننھی ننھی دھوپ کی لکیریں ..... سنہری لکیریں.....
کہیں کہیں پیچ اور خم ..... بنتے بگڑتے قوس ..... وہ
ہنڈولا ناچنے لگا اور ناچتے ناچتے کھنور بن گیا۔ "چھو"...
.... کھنور ٹوٹ گیا۔ بکھر گیا۔ اور اُس کی سانس تیر کی طرح
دھند کے مرغولوں میں گھستی چلی گئی۔ اردگرد دھند کے بادل
پریشان ہونے لگے۔ بازو تھکن سے بیتے پڑ گئے۔ صرف اُس کی
سانس دھند کے دبیز جلد کو جھٹلانے لگی۔ توڑنے لگی۔

——— اُسے اپنی پیٹھ پر نمی کا ہلکا سا احساس ہو گیا۔ شاید
وہ پانی میں ڈوب گئی ہے۔ پیٹھ ٹھنڈ کے مارے بے حس ہو ئی

جا رہی تھی ........ نہیں .... سارا بدن بے حس ہوا جا رہا تھا۔ اُس نے کروٹ بدل لی۔ منہ نم کیچڑ سے آ لگا۔ اور ناک میں کوئی منچلا تنکا گھُسنے کی کوشش کرنے لگا۔ چھینک آگئی اور اُس کی ناک زور سے نم زمین سے ٹکرا گئی۔ درد کے جھٹکے نے بے حس بدن کو تڑپا دیا۔ اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو نزدیک ہی پڑی شلوار دھندلی دِکھائی دی۔ اور اُس پر دھندلی حقیقت عیاں ہونے لگی۔ شرم کی ایک لہر اُس کے شل ذہن کو ڈبو گئی۔ ذہن ماؤف ہو گیا اور خیال پیدا ہوا کہ اُسے رونا چاہیے۔ زور زور سے رونا چاہیے۔ اُس کے ساتھ بُرا ہوا تھا۔ بہت بُرا ہوا تھا۔ اِس لئے اُسے ضرور ...... زور زور سے رونا چاہیئے۔

——— شلوار پہنتے ہوئے اُس کی نگاہیں بھٹک گئیں۔ بھٹکتی نگاہوں میں ایک رنگین رومال اُبھر آیا۔ رنگین رومال کے صرف کنارے دِکھائی دے رہے تھے۔ باقی رومال سنگھاڑوں کے ڈھیر تلے چھپا پڑا تھا۔ اور کچھ سنگھاڑے بھٹک کر زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ اُس کے دل کو دھکا سا لگا۔ اُسے اپنا آپ عجیب سا محسوس ہوا۔ لوگ شاید اُس کو بھی سنگھاڑوں کا ڈھیر سمجھ رہے تھے کہ ہاتھ بڑھا لیا اور نوچ لیا۔ یہ شاید اُس کی ہتک تھی۔ وہ اندازہ نہ لگا سکی۔ ماں کی گالی گلوچ ...... گاؤں والوں کی ڈانٹ پھٹکار

اور سہیلیوں کے کوسنے وہ بچپن سے سنتی آئی تھی۔۔۔۔۔۔سہتی آئی تھی۔ اس نے خود بھی کئی بار اوروں کو کوسا تھا۔ پانی پی پی کے کوسا تھا۔ اس کی شخصیت جلن اور بیپ کے سہارے ہی ابھر آئی تھی۔ اس لیے اس نے کبھی بھی لفظ "ٹھک" کو جاننے کی کوشش نہ کی تھی۔ پر اس وقت۔۔۔۔۔۔ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لت پت کھڑے۔۔ اُسے سامنے کھلے رنگین رومال پر سنگھاڑے کے ڈھیر میں اپنی بے کسی مجسم کھڑی محسوس ہوئی۔ سنگھاڑوں کی نوکوں سے چھلنی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ صبح سویرے سنگھاڑے اکٹھے کرنے کے لیے گھر سے چل پڑی تھی۔ اور سامنے پڑا سنگھاڑوں کا ڈھیر وہ کئی دن بھی اکٹھا نہ کر سکتی تھی۔ جی تو نہیں کرتا تھا ان سنگھاڑوں کو چھوڑ لے۔ کیا معلوم انگلیاں بھی نوکوں سے لہولہان ہوں۔ پر یہاں پڑے پڑے سارا سنگھاڑے کا ڈھیر سڑ سکتا تھا۔ بھلا اس سنگھاڑے کے ڈھیر کا کیا قصور۔۔۔۔۔۔ چھوڑ بھی دے اس ڈھیر کو تو پھر گھر پر بوڑھیا کو خالی ہاتھ لوٹ آنے کا کیا جواز پیش کرے۔ کیا کہہ سکے گی وہ۔۔۔۔ کیا روداد سنائے گی اُسے —— کیا حالت بتا سکے گی اپنی۔ اپنی حالت یاد آتے ہی اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔۔ سنگھاڑوں کا ڈھیر پھر سے جد نظریں آ گیا۔ پیٹ میں بھوک کی ٹیس سی اُٹھی۔ اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔

شاید ٹھنڈ کا اثر تھا۔ پر کان کی لویں دہکنے لگیں۔ کپکپاتے ہاتھ بیگھارٹے کے ڈھیر کی طرف بڑھے اور دل میں ڈر اُبھر رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ رنگین رومال سے نہ چھو جائیں ۔۔۔۔ نہ چھو جائیں۔

______ سوماوتی سویرے سے پریشان تھی بساڑھیاں جمپر، سینڈل، پوڈر کریم اور کپڑے کمرے کے فرش پر چاروں طرف بکھرے پڑے تھے، اور بکھرے کپڑوں کے بیچ سوماوتی میلی کچیلی ساڑھی میں ملبوس اکڑوں بیٹھی تھی۔ بدن ٹھنڈ کے مارے ٹھٹھر رہا تھا۔ اُس نے پتی کو کئی بار ڈانٹا تھا کہ کھڑکی بند کر دے لیکن دینا ناتھ بیوی کی ڈانٹ پھٹکار سے بے نیاز کھڑکی کے پٹ کھول کے بارش کو بڑے انہماک سے دیکھنے جانچنے میں مصروف تھا سردی کے تُند جھونکے کمرے کا طواف کرتے پھر رہے تھے اور سوماوتی کے جسم میں سوئیاں سی چبھوئے پھر رہے تھے سوماوتی کا جی حسب معمول پتی سے لڑ پڑنے کو چاہتا تھا۔ لیکن آج اُس کی زبان گنگ تھی۔ ڈر تھا کہ پتی ناراض ہو گیا تو سب کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ دینا ناتھ اُسے اپنے ساتھ لے جانے پر بڑی مشکل سے راضی ہو گیا تھا۔

پتی کے بغیر اِس گھر میں اُس کا نباہ مشکل تھا۔ بوڑھے سسر کی ڈانٹ پھٹکار، کھوسٹ ساس کی لعن طعن اور رشتہ داروں کے طعنے سُننے کی اب اُس میں تاب نہ تھی۔ صبح سے شام تک وہ کسی زر خرید لونڈی کی طرح چولھے چوکے میں جی جلایا کرتی تھی تب کہیں دو وقت کی روٹی میسّر ہوتی تھی۔ ساس سسر کا بس چلتا تو گلا گھونٹ کر مار دیتے۔ اُس کا قصور صرف یہ تھا کہ جہیز کم لائی تھی جیسے اُس کا پتی کوئی بی اے ------ ایم اے پاس تھا جو اُس کے ماں باپ گھر بیچ کر داماد کو روپیوں سے تول دیتے پھرتے۔ اپنے پتی کے متعلق سوچتے سوچتے وہ مادتی آپ ہی آپ کھسیانی سی ہوگئی۔ ایک ہندو لڑکی ہونے کے ناطے اُسے ایسی باتیں سوچنے میں کبھی نہ سوچنا چاہیے۔ پتی جیسا بھی ہو بھگوان سے کم نہیں لیکن ایسا بھی کیا کہ ہر وقت زبان کی کھال بھی اُدھیڑ لی جائے۔ اور پتی زبان نہ ہلائے۔ اب آج ہی کے واقعے کو لیا جائے تو توبہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہی تو کہا تھا کہ وہ پتی کے ساتھ گاؤں جائے گی۔ زبان ہلانے کی دیر تھی کہ ساس سسر نے ایسی بے نقط سنائیں کہ جی چاہا تھا چپکے سے جا کر دریا میں ڈوب مرے۔ لیکن اُس ماں کے لال کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ شاید ساس سمجھتی ہے کہ گاؤں جا کر بہو پتی کو بس میں کرے گی۔ ساس سسر کو پالنے سے منع کرے گی۔ بھلا اُسے کیا پڑی ہے کچھ کہنے کی۔ وہ بیسے ہی کون سے محل تھے اُس کے پاس جو چھن جائیں گے۔ اگر کوئی چاہت تھی تو یہ تھی کہ وہ کبھی

اپنے پتی کے ساتھ رہ کر دکھ سکھ جو بھا گیا ہیں بھوگ لے۔ ایک بیاہتا استری کے لئے اِس سے بڑھ کر اور کون سی خواہش ہو سکتی ہے۔ ساس سسُر کو بہو کا بیٹے کے ساتھ رہنا پسند نہیں تو بیٹے کی شادی نہ کرنی تھی۔ اب جو بیاہ رچایا لاڈلے کا۔ تو دیوار کھڑی کرنے سے کیا معنی۔ جہیز کے معاملے میں کچھ کمی بیشی ہوئی تو سمدھیوں سے فیصلہ کرلیں۔ بے زبان بہو کو ناحق تنگ کیوں کیا جائے۔ واقعی شریف آدمی کی اِس دنیا میں گذر نہیں۔ خیر اب جب بہو ناز ادا اٹھانے کے لئے نہ رہے گی تو بہو کی قدر و قیمت معلوم ہو گی۔ ساس لاکھ لاڈ پیار دکھائے۔ صحت وغیرہ کا واسطہ دے لیکن وہ اِس گھر میں ایک پل رُکنے کی نہیں ......... ہوں..... اور لاڈلے بیٹے کی ہمت تو دیکھو۔ خود تو شکایت کرتا رہتا تھا کہ گاؤں میں کھانے پینے کی تکلیف ہوتی ہے۔ کھانا پکانا پڑتا ہے۔ جھاڑو دینا پڑتا ہے۔ بیمار ہو جائے تو کوئی پانی پلانے کے لئے نہیں۔ اور اب پتی کی حالت دیکھ کر اُس نے حامی بھر لی تو مائی کے لال کی زبان ماں باپ کے سامنے ہکلاتی ہے۔ دودھ پیتا بچہ ہے نا... ...... ہوں......

_______ دفعتاً سوا وتی کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ

دیر اور ایسے بیٹھے رہے گی۔ تو ٹھنڈے کے مارے وہ خود بھی ہکلانے لگے گی۔ اُس نے پتی کی طرف دیکھا۔ دینا ناتھ بدستور بارش کے قطروں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ دیکھنے کے انداز میں غیر قدرتی انہماک عیاں تھا۔ شاید جان بوجھ کر آنکھیں پھیرے بیٹھا تھا۔ وہ اور برداشت نہ کر سکی۔

"اب کھڑکی تو بند کر دو........ کوئی سمجھے گا بارش دیکھی نہیں ہے کبھی........"

کہتے کہتے اُس کے دانت کٹکٹانے لگے۔

"تو میں کیا کروں۔ تمہیں کنگھی چوٹی سے فرصت ہی نہیں ملتی اور دیر ہو رہی ہے۔ میری! تو یہیں رہ جاؤ" دینا ناتھ نے منہ پھیرے بغیر جواب دیا۔ کچھ دنوں سے اُسے سوماوتی اچھی نہ لگتی تھی۔ سوماوتی دبلی پتلی تھی۔ اس لئے اُبھرے پیٹ کی وجہ سے بڑی بھدی لگتی تھی۔

"تم تو یہی چاہتے ہو کہ میں اس گھر میں سڑ سڑ کر مر جاؤں اور تم وہاں پاؤں پسارے سوتے رہو" سوماوتی کو پتی کے جواب سے کھٹیس سی لگی۔

"تو پھر جلدی سے تیاری ہو جاؤ۔ میں نے ٹھیکہ دار سے کل پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ تمہاری مہربانی سے ایک دن کی دیر ہو گئی۔ بس نہیں جائے گی تو پھر دو بجے کی ٹرین سے جانا پڑے گا۔

رات کے اندھیرے میں پہنچنگے گاؤں۔"

"تو نہ ہی کہو نا کچھ۔ کون سے کپڑے ساتھ لے جاؤں گی۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"

واقعی سوماوتی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ساری ساڑھیاں، شال، جمپر ساتھ لے جائے۔ اِس گھر میں آکر اُسے باہر جانے کا کبھی موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ جو پہننے پہنانے کا موقعہ ملتا۔ جی تو چاہتا تھا کہ سب کپڑے آج ہی پہن لے۔ لیکن دیناناتھ کی الجھن بڑھ رہی تھی۔ ایک ویران سے علاقے میں اِتنے سارے کپڑوں کی ضرورت نہ تھی۔ رویے اُس کا دل چاہتا تھا کہ سوماوتی ساس سے صلاح لے۔ اب تو سوماوتی جا رہی تھی ساس کا دل بھی بہلا رہتا۔ اُس نے شہہ دی۔

"ماں سے پوچھو نا کہ کون سے کپڑے لے جانے ہیں۔ عورتیں ان معاملوں میں مردوں سے بہتر رائے دے سکتی ہیں۔"

سوماوتی کو پتی کی بات بہت بُری لگی۔ جیسے اُس کی شادی سامنے بیٹھے پتی سے نہ ہوئی تھی، بلکہ بوڑھی ساس سے ہوئی تھی۔ وہ بپھر پڑی۔

"تمہاری ماں کہنا چاہتی ہے۔ کہ میں بھی اور بہو بیٹیوں کی طرح ڈھنگ سے رہوں اُس کا بس چلے تو چیتھڑوں میں لپٹا رکھے مجھے۔ خود بیٹی کوئی بنی نہیں ہے نا۔ اِس لئے بیٹی کی قدر و قیمت معلوم نہیں"۔ یہ حربہ سوماوتی کا پسندیدہ حربہ تھا۔ کئی بار اُس نے اس حربے کو استعمال کر کے ساس کے منہ میں لگام دی تھی۔

دیناناتھ کو بیوی کی زیادتی پر غصہ آگیا۔ بھلا کون ماں ہوگی جو اپنے اکلوتے بیٹے کی بہو کو چیتھڑوں میں لپٹا رکھے گی۔ سوماوتی سراسر بہتان تراش رہی تھی۔ وہ لڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ پھر دُور سے رحمان کو گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھ کر اُس کو گذرتے لمحات کا احساس ہوگیا۔ اُس نے بات ختم کر دی۔

"اچھا ........ اچھا اب چپ بیٹھا رہ دیکھ رحمان آ رہا ہے۔ جو کپڑے جی چاہے لے چل۔ دیر ہو رہی ہے۔"

—— رحمان گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ پیٹھ پر لوئی میں کچھ بندھا پڑا تھا۔ جس کے بوجھ سے وہ جھکا جھکا سا تھا۔ پاؤں میں پھٹی چپل تھی اور سر پر گوٹے کنارے والی مخصوص کشمیری ٹوپی اور ٹوپی کے کناروں سے چکدار بالوں کے گچھے باہر جھانک رہے تھے۔ دینا ناتھ نے کئی بار سوچا تھا کہ رحمان ٹوپی پہننا چھوڑ دے تو گھنگھریالے بال اُس کے چہرے کو ایک نئی جلا بخش دیں گے۔ پہ نہ معلوم رحمان کو اس ٹوپی سے کیا انس تھا کہ لاکھ کہنے پر بھی ننگے سر نہ رہتا تھا۔ گو روز بال تیل کنگھی سے سنوارا کرتا تھا۔ ویسے رحمان جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس طبقے میں ظاہری دکھاوا سرے سے ہی مفقود تھا۔ یہ ہلکی گٹھری جو رحمان کی پیٹھ پر کپڑے کے کوہان کی طرح لگ رہی تھی۔ اسی گٹھری میں رحمان کا سارا اثاثہ تھا۔ کچھ برتن ہوں گے۔ کنگھی آئینہ ہو گا۔ ایک آدھ قمیص ہو گی۔ اور بس ........ جہاں دل چاہا چلے گئے۔ جہاں رات آ گئی سو گئے۔ نہ گھر گرہستی کی فکر۔ نہ کھانے کھلانے کا ڈر۔ روکھی سوکھی کھائی اور سوٹ اڑائی اور ایک وہ خود تھا کہ بیوی اور ماں کے بیچ ایسے پستا رہتا تھا۔ جیسے گیہوں چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پستا رہتا ہے۔ باپ کی ڈانٹ پھٹکار وہ سن لے۔ ماں کی شکایت وہ سہہ لے اور جو بیوی نے دکھڑا کہنا سب سمجھ لیا تو ایک اور مصیبت۔ نہ ایک کے ساتھ نہ دوسرے کے ساتھ ...... صرف وہ ............... رحمان کی آواز نے اُس کے ذہن کو موقع پر لگام دی۔

"کیا بات ہے بھئی ........ جانے کا ارادہ نہیں؟"

"جانا ہے بھئی ...... جانا ہے۔ تم تانگہ لے آؤ میں تب تک کپڑے

بدل لوں گا۔"

"ابھی تک کپڑے نہیں بدل پائے۔ ..... تم تو کہتے تھے بس دس بجے روانہ ہو جاتی ہے۔"

"ابھی وقت ہے۔ تم تانگہ تو لے آؤ" رحمان جانے لگا۔ تو اُسے یاد آیا "تانگے تک سامان لے جانے کے لئے مزدور بھی لیتے آنا" رحمان نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو اُس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ سوماوتی بڑی بے دلی سے ٹرنک میں کپڑے بھر رہی تھی۔ اُس کا چہرہ اُترا اُترا سا لگ رہا تھا۔ دینا ناتھ کو رحم آ گیا۔ سوماوتی سب کی ڈانٹ پھٹکار کی مرکز تھی۔ اور بہو ہونے کے ناطے کوئی اُس کی سننے پر تیار نہ تھا۔ جی چاہا۔ بیوی کو گدگدائے۔ اُسے خوب ہنسائے لیکن دروازے کی حرکت نے اُس کی آرزو کو پورا نہ ہونے دیا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ماں اندر آئی پوپلے منہ کے اِردگرد خفگی کے آثار تھے۔ بہو کی طرف دیکھے بغیر اس نے کہا۔

"کھانا پروس رکھا ہے ..... کھالو۔"

"اچھا ماں ..........." دینا ناتھ نے میدان چھوڑنے ہی میں اپنی خیریت سمجھی۔ کپڑوں کے معاملے میں ساس بہو کی جھڑپ یقینی تھی۔ اور تجربے نے اُسے سکھایا تھا۔ کہ اِن بکھیڑوں سے جتنا دور رہا جائے اُتنا اُس کی صحت کے لئے اچھا ہے۔

کھانا کھا کر اُس نے کپڑے تبدیل کئے۔ رحمان بھی تانگے کو سڑک پر کھڑا کر کے اطلاع دینے آیا۔ سوماوتی نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ بن ٹھن کر منہ پھلائے کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر سڑک کی طرف چل دی۔ دینا ناتھ نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں کی نگاہوں میں نفرت اور طنز کی ہلکی لکیریں اُبھر آئیں۔ اور وہ جل ہی تو گیا۔ بیوی کی طرفداری کرے تو ماں ناراض۔ ماں کی

طرفداری کرے تو بیوی ناراض۔ اور جو دور رہنے کی کوشش کرے تو دونوں ناراض۔ غصے میں آ کر اس نے ماں باپ سے اجازت بھی نہ مانگی۔

"ہے بھی رحمان۔ اُٹھا ایک طرف سے ٹرنک اور دوسری طرف سے میں اٹھاتا ہوں۔ اِس بارش میں کسی کو کیا پڑی ہے۔ کہ مزدوری کرنے نکل پڑے۔ وہ تو میں ہی ایک کرائے کا ٹٹو ہوں۔ جو دن رات کام میں جتا رہتا ہوں۔"

جانے سے پہلے رحمان نے دینا ناتھ کی ماں سے رسماً کہا "اچھا ماں جی ...... ہم چلے۔"

——— دینا ناتھ کی ماں چاہتی تھی کہ دینا ناتھ بھی اُس سے کوئی بات کرے۔ بیٹے کے ایک لفظ کہنے پر وہ سب کچھ فراموش کر دینے پر تیار تھی۔ معلوم اب کب بیٹے کا منہ دیکھنے کو ملے۔ لیکن دینا ناتھ کے رویئے نے اسے ٹھیس پہنچائی اور وہ منہ پھیر کر رسوئی میں گھس گئی۔ جس ماں نے بیٹے کو نو مہینے پیٹ میں سنبھالا تھا۔ اُسے پیدا کیا تھا۔ پالا پوسا تھا۔ اُس سے بیٹا بات کرنی گوارا نہ کرے تو ماں کو کیا پڑی ہے کہ بیٹے کے پیچھے دیوانی ہوتی پھرے۔ ناحق ماتا پھوٹ پڑ رہی تھی اُس کے سوکھے پسینے سے اِس سے تو مر دہی بہتر ہیں جن کو ان چیزوں کی فکر ہی نہیں۔ باپ بیٹے سے ناراض ہے تو کمرے میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا ہے۔ نہ کوئی غم نہ کوئی فکر۔ جب بھگوان نے عورت کو اتنی مشکلیں سہنے کے لئے پیدا کیا ہے تو دل بھی کٹھور بنایا ہوتا؟"

——— بس تیار کھڑی تھی رحمان سامان کو بس کی چھت پر رکھوانے کے لئے کلینر کا ہاتھ بٹانے لگا۔ دینا ناتھ کرایہ ادا کر کے ٹکٹ لے آیا تو سوماوتی کو گاڑی کے دروازے کے پاس کھڑا پایا۔ بس بھری پڑی تھی۔ عورت ذات کا

داسطہ دے کر اس نے بڑی مشکل سے ایک سیٹ حاصل کر لی۔ سوماوتی کو اس میں ٹھونس دیا اور خود سیٹ کے دستے پر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پتی کے چہرے پر بدستور روکھاپن دیکھ کر سوماوتی نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ زندگی کا سفر تھا، وہ پہلا قدم ٹھیک ڈھنگ سے بڑھانا چاہتی تھی۔

"کتنا کرایہ لیا گاڑی والوں نے............"

"تین ٹکٹوں کے تین روپے اور سامان کا ایک روپیہ......" دینا ناتھ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اُسے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

"تم تو کہتے تھے، ایک سواری کے بارہ آنے لیتے ہیں ........"

"گورنمنٹ ریٹ تو بارہ آنے ہے۔ لیکن پرائیویٹ بس والے سواریاں زیادہ دیکھ کر کرایہ بڑھا دیتے ہیں۔"

"اور حکومت کچھ نہیں کہتی......" سوماوتی کے کہنے کی دیر تھی کہ اردگرد بیٹھے دو چار آدمی بول اُٹھے۔

"حکومت نے ہی تو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ حکومت کیا ہے...... ننگوں لُچکوں کی جماعت ہے"

سوماوتی کو کرائے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اپنے پتی کو سنانے کی۔ اور لوگوں کو بیچ میں بولتے دیکھ کر اُس نے بات بدل دی۔"

"رحمان کا کرایہ بھی دیا تم نے......"

"ہاں......" دینا ناتھ نے بے خیالی میں جواب دیا۔ رحمان بس کے اندر نہ آیا تھا۔ اور اُس کی سگریٹ کی طلب بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیوں" سوماوتی کے کہنے کا کچھ ایسا انداز تھا، جیسے اُس کے پتی نے

غلطی ہوئی ہو۔ جس کے لئے اظہارِ تاسف ضروری سمجھا گیا ہو جو اُسے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اُس بیچارے کے پاس پیسے کہاں ہیں" دینا ناتھ کی آواز میں پھر سے روکھا پن اُبھر آیا۔ دوست کے متعلق وہ کچھ اور سننے کے لئے تیار نہ تھا سوماوتی کچھ زیادتی نہ کر بیٹھے۔ اِس لئے اُس نے رحمان کو آواز دی۔

"بھئی رحمان ......... ایک سگریٹ پھینک دینا" اور سوماوتی ایک دم خاموش ہو گئی۔ بڑا دانی بنا پھرتا تھا اُس کا پتی۔ شادی کے بعد بیوی کے لئے دو پیسے کی پیڑ لانے کی توفیق نہ تھی اور دوستوں پر روپیہ نچھاور کرتا پھرتا تھا۔ اُس کی اپنی قسمت پھوٹ گئی تھی۔ گھر کے اندر ساس سسر دیوار بنے کھڑے تھے۔ اور گھر سے باہر دوستوں کی فوج ... ... ٹھیک کہتے تھے سبھی۔ رحمان نے ہی اُس کے پتی کو بگاڑ دیا تھا ..... ... خیر۔ اب تو وہ ساتھ چل رہی ہے۔ وہ سُدھار لے گی پتی کو۔ نہ سُدھارا تو سوماوتی نام نہیں۔

اور گاڑی دھچکے سے آگے کو روانہ ہوئی۔

عبدالسلام بند دوکان کے چھجے پر لوئی اوڑھے ایسے بیٹھا تھا جیسے اپنے آپ کو لوئی میں چھپانا چاہتا ہو۔ بازار کی چہل پہل سے بے نیاز وہ ہر آنے جانے والے کو جھانکتا پر کھڑا ٹھنڈ کے باوجود اُس کا بدن پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ ذہن میں آگ دھک رہی تھی۔ اور انگ انگ خوف سے جل رہا تھا۔ کہیں کوئی کھٹکا ہوتا تو وہ بری طرح سے چونک پڑتا اور اپنے آپ کو لوئی میں سکیڑنے کی ناکام کوشش کرنے لگتا۔ غرور سے تنی گردن آج جھکی تھی۔ رعب دار چہرہ بے رونق ہو گیا تھا۔ نگاہوں میں بیباکی کے بجائے لاچاری سمٹ آئی تھی۔ آج کوئی ماہی گیر عبدالسلام کو اس حالت میں دیکھتا تو اُسے ہرگز یقین نہ آتا کہ یہ وہی عبدالسلام گارڈ ہے۔ جس کے نام سے سونہ واری کے سارے ماہی گیر تھر تھر کانپا کرتے ہیں۔ ماہی گیر بھی شاید اُس کی اتنی گری حالت دیکھ کر ترس کھانے پر مجبور ہو جاتے۔

—— عبدالسلام بھی اپنی حالت سے انجان نہ تھا۔ اور یہ احساس بذاتِ خود بے حد تکلیف دہ تھا۔ برسوں اپنے بدن کو کسرت کے بل بوتے پر، اپنی مونچھوں کو پال پال کے، اپنی آواز کو کرخت اور گرجدار بنا کر اُس نے جو شخصیت بنائی تھی۔ وہ اِس ذرا سی لغزش سے کہیں خاک میں نہ مل

جائے۔ کہیں بھولی گاؤں پہنچ گئی۔ اور راز افشا ہو گیا۔ تو کیا ہو گا۔ کہیں جان ہی سے نہ ہاتھ دھونا پڑے۔ سنا ہے یہ ظالم ماہی گیر دشمن کو ایک ہی وار میں ختم نہیں کرتے بلکہ کشتی کے سرے پر باندھ کر دریا میں گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ اور جب آدمی ادھ موا ہو جاتا ہے۔ تو پانی سے باہر نکال کر ہوش میں لاتے ہیں۔ ہوش میں آتے ہی پھر اسے کشتی کے سرے سے باندھ کر دریا میں گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ حتیٰ کہ آدمی بے حال ہو کر جان دے دیتا ہے۔ آجکل پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ پانی میں گرتے ہی اُس کا بدن اکڑ جائے گا۔ آواز بھی حلق سے نکل نہ سکے گی۔ اُف...... اُسے جھرجھری سی آگئی۔

—— ایک پہلو بیٹھے بیٹھے ٹانگ اینٹھ گئی۔ لیکن ہل کر وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچنا چاہتا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ بھولی کے گاؤں پہنچنے سے پہلے پہلے وہ بس میں نکل بھاگے۔ ہو سکتا تھا بعد میں اُسے نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں یا شاید جیل بھی جانا پڑے۔ لیکن جان تو بچ جائے گی۔ جان ہے تو جہان ہے۔ اُس کا بس چلے تو پیدل نکل چلے یہاں سے۔ لیکن راز افشا ہو گیا تو گاؤں والے چاروں کھونٹ اُسے ڈھونڈتے نکلیں گے۔ اور کسی کو گمان نہ ہو گا۔ کہ وہ اِسی گاؤں میں چھپا بیٹھا ہے۔ ٹھیک ہے۔ اُسے یہیں بیٹھ کر بس کا انتظار کرنا چاہیئے بھولی اتنی جلدی گاؤں نہیں پہنچ جائے گی۔ ہوش میں آنے میں دیر لگ جائے گی۔ کاش وہ یوں نہ گھبرا جاتا۔ کوارٹر سے ہو آتا۔ کپڑے نہ سہی کانگڑی تو لے آتا۔ شلوار کے پائنچے ابھی تک نم تھے۔ گاڑی آگئی تو بھیگی شلوار کو چھپ چھپا کے رکھنا پڑے گا۔ شاید گوں گوں کی آواز آ رہی ہے۔ یقیناً گاڑی آ رہی ہو گی۔ بس دیکھنے کے اشتیاق میں وہ بے تحاشا آگے کو

جھٹکا اور دکان کے چھجے سے گرتے گرتے بچا۔

——— بس اپنی مخصوص جگہ پر آکر رک گئی ۔ سواریاں اُترنے لگیں عبدالسلام بیتاب ہو کر چھجے پر سے لپک پڑا اور بس سے نکلتی سواریوں کی پرواہ کئے بغیر بس میں گھسنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ کہاں تو بازار میں اکا دکا آدمی ہی چلتا نظر آتا تھا اور کہاں بس آتے ہی شہر جانے والی سواریوں کا غول امنڈ آیا۔ پلک جھپکتے ہی سارے بازار میں رونق آگئی بس شہر سے خبریں لاتی تھی سبزی ترکاری لاتی تھی۔ اور کچھ نئے چہرے بھی گاؤں کی زندگی میں اہال سا پیدا کر دیتے تھے ۔ ہر بس کی آمد پر پرانے سماج کی کچھ کرم خوردہ کڑیاں گر کر ٹوٹ جاتی تھیں ۔

رحمان بمشکل جم غفیر سے بچ کر نکل آیا۔ کلینر چلا چلا کر لوگوں کو بس پر یلغار کرنے سے روک رہا تھا ۔ اور بس سے نکلتی سواریوں کو باہر دھکیل رہا تھا۔ اور سوہادتی سیٹ پر بدستور ناک سکوڑے بیٹھی لطف اٹھا رہی تھی ۔ لوگوں کا زور کچھ کم ہوا تو دینا ناتھ ڈرائیور اور کلینر کی مدد سے بیوی کو بس سے باہر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ باہر آکر اس نے ایک لمبی سانس بھری گرد و پیش کی جانب نگاہیں دوڑائیں ۔ اور عبدالسلام کو دیکھ کر ساری کوفت بھول گیا ۔ عبدالسلام اس کی بہت ساری مشکلیں حل کر سکتا تھا۔

——— عبدالسلام کسی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر گھبرا گیا ۔ لیکن دینا ناتھ کو پہچانتے ہی اس کا ڈر کچھ کچھ زائل ہو گیا۔

"کہو بھئی ........ کیا حال ہے ۔ سونہ داری کا " دینا ناتھ کے لہجے میں مخصوص طنز تھا۔ جو شہر سے آتے ہی لوگ سونہ داری کے ذکر پر عموماً استعمال کرنے کے عادی ہو گئے تھے ۔ جیسے سونہ داری کشمیر

جنت نظیر کا کوئی حصّہ نہ ہو بلکہ کوئی لق و دق صحرا۔

"ٹھیک ہی ہے ......" عبدالسلام نے مرے مرے سے لہجے میں جواب دیا۔ دینا ناتھ سے اس کی ملاقات یہیں سونہ وادی کے حاجن گاؤں میں ہوئی تھی۔ شہر کے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے اس گاؤں میں۔ گاؤں کے لوگوں اور شہریوں کے مزاج جدا ہوتے ہیں اس لیے آپس میں بنی مشکل تھی۔ یوں بھی گاؤں والے شہریوں کو عیار سمجھ کر اُن سے نفرت کرتے تھے۔ اور شہری بھی گاؤں میں رہنا اپنی بدقسمتی سمجھتے تھے۔ اس لیے غیر ارادی طور پر گاؤں کے لوگ دو گروپوں میں بٹ گئے تھے۔ اور سونہ وادی کی ڈیولپمنٹ کا منصوبہ ختم ہو گیا تھا۔ ان دو گروہوں کے افراد کی آپس میں غیر قدرتی ہمدردی سی پیدا ہو گئی تھی اسی ناطے عبدالسلام بھی دینا ناتھ کا ہمدرد تھا۔ ساتھ والی عورت شاید دینا ناتھ کی بیوی تھی۔ عبدالسلام نے اندازہ لگایا ہے۔ تو سالی خوبصورت ..... لیکن پیٹ اُبھرا ہوا ہے۔ بڑی بے ڈھنگی لگ رہی ہے۔ حاملہ ہوگی۔ بیوقوف تھا دینا ناتھ جو ایسی حالت میں بیوی کو اس ویرانے میں لایا۔ عبدالسلام نے سوچا اور آپ ہی آپ کھسیانا ہو گیا۔ دینا ناتھ بیوقوف نہ تھا۔ بلکہ وہ خود بیوقوف تھا۔ اپنی بیوی کو لے آیا ہوتا تو آج یوں جان کے لالے نہ پڑتے۔ بھلا اپنی خواہشوں کو کب تک روکا جا سکتا ہے۔ لیکن بیوی لاتا تو کیوں کر۔ سرکاری حکم تھا کہ سونہ وادی کا کوئی ملازم بیوی کو ساتھ نہ رکھے۔ اُسے محسوس ہوا وہ بڑا بدقسمت ہے۔ کہیں پھولی کو بھی حمل ٹھہر گیا تو نہ معلوم کیا ہو۔ وہ پھر سے ہراساں ہونے لگا۔

دینا ناتھ سے عبدالسلام کی حالت چھپی نہ رہی۔ عبدالسلام کی موچھوں میں آج وہ پہلی سی اٹھان نہ تھی، نہ ہی عبدالسلام کا ہاتھ حسب معمول موچھوں کو مروڑنے کے لئے بڑھا تھا۔ کہیں عبدالسلام بیمار تو نہیں۔ دینا ناتھ نے ہمدردی ظاہر کی۔

"کیا بات ہے۔ تم بجھے بجھے سے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری"

"طبیعت تو ٹھیک ہے" عبدالسلام نے بہانہ گھڑ لیا۔ "گھر سے خبر آئی ہے۔ بچے بیمار ہیں۔ اس لئے صبح صبح شہر جا رہا ہوں"

دینا ناتھ شش و پنج میں پڑ گیا۔ لانے کو تو وہ رحمان کو شہر سے لے آیا تھا لیکن اس کے رہنے کے لئے جگہ حاصل کرنی مشکل تھی۔ مکان لاکھ کوشش کرنے پر بھی نہ ملتا تھا۔ اور خود اس کے پاس صرف ایک کمرہ تھا۔ سو ماں ساتھ تھی۔ ظاہر تھا کہ رحمان اس کے ہاں رہ نہ سکتا تھا۔ سوچا تھا عبدالسلام پاس ہی ایک مکان میں اکیلا رہتا ہے۔ کچھ دنوں کے لئے رحمان کو وہیں رکھے گا۔ جب تک اور کوئی بندوبست ہو جاتا۔ لیکن کیا معلوم عبدالسلام اپنی غیر حاضری میں کسی کو رہنے بھی دے۔ بہر حال کوشش تو کرنی تھی۔

"بھئی تمہاری تھوڑی سی مدد کی ضرورت تھی۔" دینا ناتھ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ذہن اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ رسماً عبدالسلام کے بیمار بچوں سے ہمدردی بھی ظاہر نہ کی۔

"کہو......کہو" عبدالسلام نے کہا۔ بس جانے میں ابھی کچھ دیر تھی اور اکیلے بس میں بیٹھے رہنے کی اس میں اب سکت باقی نہ تھی۔

"بھائی تم تو جا ہی رہے ہو۔ تمہارا کمرہ خالی ہے۔ اگر حرج نہ ہو تو

رحمان کچھ دن وہاں ٹھہرے" دینا ناتھ نے اپنا مدعا ظاہر کیا۔
"رحمان .......کون ......" عبدالسلام نے پوچھا۔
"وہ جو گاڑی کے پاس کھڑا ہے۔ میرا دوست ہے۔ میرے پاس صرف ایک کمرہ ہے۔ بیوی کو لے آیا ہوں اِس لئے........" دینا ناتھ جملہ پورا نہ کرنے پر مجبور تھا۔

—— کوئی اور دن ہوتا تو شائد عبدالسلام پس و پیش کرتا اُس کے بہت سارے راز کمرے سے وابستہ تھے۔ جو غیر آدمی کی موجودگی میں فاش ہو سکتے تھے۔ کچھ ماہی گیر تھے۔ جو بغیر لائسنس کے مچھلیاں پکڑتے تھے۔ کچھ آدمی سنگھاڑے چوری کیا کرتے تھے۔ یہ سب لوگ عبدالسلام کا حصہ رات کے اندھیرے میں اُس کے کمرے میں لے آتے تھے۔ حتیٰ کہ کسی کو خبر نہ لگتی تھی اُس کے دفتر کے باقی عملے کو بھی کچھ پتہ نہ لگتا تھا۔ عام طور پر یہ حصہ جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ جس کو روپے میں تبدیل کرنے کے لئے عبدالسلام نے گاہک بھی پیدا کئے تھے۔ یہ سارے کام وہ اپنے کمرے کی چار دیواری میں ہی انجام دیتا تھا۔ اِنہی وجوہ کی بنا پر وہ کمرے میں رہنے کے لئے کسی کو شریک نہ بنا سکا گو کمرے کا کرایہ اُس کی تنخواہ کا ایک بہت بڑا حصہ ہڑپ کر جاتا تھا۔ لیکن آج دینا ناتھ کی اِلتجا اُسے اِلتجا نہ لگی۔ بلکہ غیبی سہارا محسوس ہوئی۔ دینا ناتھ اُس کی عدم موجودگی میں اُس کے سامان کا محافظ ہوگا۔ پھر شاید گاؤں والے غصے میں آ کر اُس کے کمرے کو نہ لوٹ سکیں گے۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ کمرے میں .راشن پڑا ہے۔ کہیں دینا ناتھ کے دوست نے استعمال کرنا شروع کیا تو.....
عبدالسلام نے سوچا اور دیر کرنی مناسب نہ سمجھی۔ ایک بار پہلے بھی دل

میں ایسے ہی خدشات پیدا کرکے وہ غلطی کر بیٹھا تھا! ذرا اپنا سامان بٹورے بغیر
بس کے اڈے پر چلا آیا تھا۔ اب کے اناج کے کچھ دانوں کی خاطر اُسے انکار
کرنے کی غلطی نہ کرنی چاہیئے۔ گاؤں والوں نے حملہ کیا بھی تو دینا ناتھ اُس
کے سامان کا ذمہ دار ہوگا۔ ہنگامہ دب جائے گا۔ تو سامان بٹورا جا سکتا ہے۔
بڑی خوشی سے رہ سکتا ہے۔ تمہارا دوست۔ تم سے کیسے انکار کر
سکتا ہوں۔ لو یہ کنجی۔ اور ہاں ...... ذرا خیال رکھیے۔"
"تم کوئی فکر نہ کرو۔ اپنا سامان سمجھ کر حفاظت کروں گا۔"
دینا ناتھ کے کندھے سے جیسے بہت بڑا بوجھ سرک گیا۔
______ عبدالسلام چابی دینا ناتھ کے حوالے کرتے کرتے رک
گیا۔ اُسے یاد آیا کہ گورنمنٹ کی ناؤ بس اڈے کے پاس ہی گھاٹ سے
بندھی ہے۔ یوں چھوڑ دے تو شاید بہہ جائے پھر تو ایک اور مصیبت گلے
پڑنے کا خطرہ تھا۔ کیوں نہ وہ کبھی دینا ناتھ کے گلے باندھ دے۔
"بھئی تمہارا سامان ساتھ ہوگا۔ سرکاری ناؤ گھاٹ سے لگی ہے
لے جاؤ اور وہاں کسی گارڈ کے حوالے کرنا۔ ناؤ چلانی آئے گی اِس بہاؤ
میں؟"

دینا ناتھ نے حامی بھری۔ رحمان کے ساتھ آنے سے اُس کی اپنی تقدیر
کھُل رہی تھی۔ سامان لے جانے کے روپے بچ جائیں گے۔ عبدالسلام ہاتھ
ملا کر بس میں داخل ہو گیا۔ تو بس کی چھت سے کلینر نے آواز دی۔
"بابو جی یہ سامان ہے آپ کا...... اتارنا نہیں" جب تک
دینا ناتھ جواب دے رحمان بول پڑا۔
"ہاں بھئی ...... ہمارا ہی ہے"۔

کلینر نے دینا ناتھ کی اور دیکھا۔ دینا ناتھ نیلے سوٹ میں ملبوس کسی بابو کی طرح لگ رہا تھا۔ کلینر نے پھر رحمان کی طرف دیکھا۔ اُس کے لہجے میں خود بخود فرق اُبھر آیا" تو اتارتے کیوں نہیں......کیا بابوجی خود اتاریں گے۔"

کلینر کے لہجے پر رحمان نے کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ گاڑی کی طرف بڑھا جہاں کلینر سامان اُلٹنے پلٹنے میں مصروف تھا لیکن کلینر کے لہجے نے سوماوتی کے ذہن میں ایک نئی ترغیب کو جنم دیا۔ چشم زدن میں اُس رحمان کی نظر میں پتی کے دوست کی حیثیت سے گر کر نوکر کی حیثیت میں بدل گیا۔

گاڑی سے سامان اتار کر گھاٹ سے لگی کشتی تک لے جانا تھا۔ قلی کو ڈھونڈھا گیا۔ گاؤں کے کچھ لوگ آمادہ ہو گئے۔ لیکن قلی دینا ناتھ کا سوٹ اور سوماوتی کے سرسراتے کپڑے دیکھ کر کچھ قدم سامان لے جانے کے لئے آٹھ آنے مانگنے لگے۔

"دینا ناتھ نے ہجت کی" دو آنے ملیں گے۔"

" دو آنے بابوجی بہت کم ہیں۔ مزدوروں نے ہنسی اڑائی۔

" اچھا بھئی چار آنے دوں گا...... ایک پیسہ زیادہ نہیں۔"

دینا ناتھ نے مزدوروں کا نسخہ جھٹلانا چاہا۔ اِس سے پہلے کہ مزدور حامی بھر لیتے سوماوتی نے جل کر کہا۔

" کسی مزدور کی ضرورت نہیں ہم سامان خود اٹھائیں گے...... بدتمیز کہیں کے۔"

دینا ناتھ پس و پیش میں پڑ گیا۔ گو سامان کچھ زیادہ نہ تھا۔

لیکن خود سامان اٹھانا... بس یہ مشکل تھی کہ اس گاؤں میں وہ صرف بلدکاک کا بیٹا دینا ناتھ نہ تھا بلکہ گاؤں کے سب سے بڑے ٹھیکیدار کا منتری تھا۔ جس کے ماتحت بیسوں مزدور کام کیا کرتے تھے۔ خود سامان اٹھانے سے کر کری ہو جاتی۔ اِس لئے سوا وتی کو دھیرے سے سمجھایا۔

"میں یہاں سامان خود نہیں اٹھا سکوں گا۔ میری عزت کا سوال ہے۔"

رحمان نے سن لیا اور سمجھ گیا۔ دینا ناتھ نے کئی بار اس کا اپنے اقتدار اور عزت کا رعب جمایا تھا۔ اس لئے اُس نے دوست کی الجھن حل کر دی۔ "تم نہ اٹھاؤ سامان۔ سامان ہی کتنا ہے۔"

دینا ناتھ اُسے روکنے والا ہی تھا۔ کہ رحمان نے سامان اٹھانا شروع کیا۔ ناچار دینا ناتھ بھی آگے بڑھا۔ کم از کم مزدوروں کو تو پتہ چل جائے کہ دھاندلی روز روز نہیں چلتی۔

مزدوروں نے ہاتھ سے اسامی جاتے ہوئے دیکھ کر آخری داؤ لگایا۔

"اچھا بابوجی...... دو ہی آنے دیجئے...... دو ہی آنے دیجئے"

دینا ناتھ نے مزدوروں کو منہ لگانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ چپ چاپ گھاٹ کی ڈھلان اترتا چلا گیا۔ پر سوا وتی سے رہا نہ گیا۔ اُس نے پہلے ندی کی طرف دیکھا جو کشتی میں پہنچ کر چپو ڈھونڈھ رہا تھا۔ پھر اُس نے دوسری نگاہ رحمان پر ڈال دی۔ جو اُس کے ٹرنک کے ساتھ زور آزمائی کر رہا تھا۔ اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ دونوں میں سے کسی کے سننے کا ڈر نہیں تو بڑے غرور سے قلیوں سے مخاطب ہوئی۔ "پہلے جو کہہ دیا تھا اس وقت عقل ماری گئی تھی۔ تم لوگوں کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارا نوکر ساتھ ہے۔ وہ اٹھالیگا۔

دینا ناتھ کا مکان، ہاجن گاؤں سے ڈیڑھ میل دور پاری بل میں تھا پاری بل بھی ہاجن گاؤں سے ہی منسلک سمجھا جاتا ہے۔ مکان گاؤں کے باہر واقع تھا۔ مکان کیا تھا۔ مٹی کی چار دیواری پر گھاس پھوس کی چھت ڈال دی گئی تھی۔ مکان میں صرف دو کمرے تھے۔ اور دونوں کمروں کے بیچ ایک تنگ راہداری تھی جس کے آخری سرے سے سیڑھیاں کہیں اوپر جاتی تھیں۔ سوماوتی اچنبھے میں پڑ گئی۔ باہر سے تو مکان صرف ایک منزلہ دکھائی دیتا تھا۔ سیڑھیاں کہاں جاتی ہوں گی۔ وہ غور نہ کر سکی۔ مکان کے آس پاس گندہ آنگن دیکھ کر اُس کا جی متلانے لگا۔ مکان کے چاروں طرف ناہموار زمین پر گوبر۔۔۔ گھاس پھوس کے ڈھیر بکھرے پڑے تھے۔ بارش نے آنگن میں دلدل سی اُبھاری تھی۔ سوماوتی کی نئی سنہری اونچی ایڑھی کی سینڈل کیچڑ سے لت پت ہو گئی۔ کچھ کیچڑ چپل میں بھی گھس آئی تھی۔ اور بڑی بڑی لگ رہی تھی۔ پتی کا سہارا نہ ہوتا تو وہ کئی دفعہ گر گئی ہوتی۔ گاؤں کا عام تصور مثلاً گاؤں شہروں سے زیادہ صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ مکانوں کے ارد گرد بڑے بڑے میدان ہوتے ہیں۔ میدانوں میں پھل پھول لہلہاتے ہیں۔ ہوا پھولوں کی بھینی

بھینی مہک سے لدی پھندی رہتی ہے۔ وہ سارا تصور ٹھیک سا گیا۔ اور اسے افسوس ہونے لگا۔ کاش اس نے ساس سسر کا کہا مان لیا ہوتا۔ اور اس جہنم میں نہ آتی وہ ناک پلو سے ڈھانپ کر جلدی جلدی راہداری میں گھس گئی۔ راہداری کے دونوں طرف دروازے تھے۔ بائیں دروازے پر کوئی ٹھگنے قد کا بے حد کالا آدمی کالے پھرن میں ملبوس کھڑا بھوت سا لگ رہا تھا۔ سوماوتی کا چہرہ وحشت کے مارے زرد پڑ گیا۔

"آ گئے بابوجی.........." بھوت کی آواز میں انکساری تھی۔

"ہاں بھائی آ گیا.........." دینا ناتھ نے اپنے ہاتھ کا قفل کھولنے کو بڑھا۔ سوماوتی بے سہارا ہو گئی۔ دینا ناتھ کہتا جا رہا تھا۔

"تم کہتے تھے گھر والی کو لے آؤ بابوجی۔ سو لے آیا ہوں۔ اب سنبھالو اسے۔" دینا ناتھ ہنس پڑا اور سوماوتی کو دینا ناتھ کا ہنسنا زہر سا لگا۔ بھلا اس کالے کلوٹے بھوت کو بھائی کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ گاؤں میں رہ کر پتی بھی گنوار ہوا جا رہا تھا۔

"آؤ جی آؤ۔ ماں اندر ہے۔" ٹھگنے قد کے آدمی نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا اور تب سوماوتی کو پتہ چلا کہ یہ کالا کلوٹا بھوت مالک مکان ہے۔ اور روز اس کا سامنا رہے گا۔

"ماں دیکھو تو.......... بابوجی گھر والی کو لے آئے ہیں" ٹھگنے قد کے آدمی نے کمرے کے اندر جھانکتے ہوئے کہا اور سوماوتی کا چہرہ سرخ ہو گیا جیسے وہ،

"جاؤ، زدن دید سے ملو۔ بہت اچھی ہے،" دینا ناتھ نے شہہ

دی اور وہ بے دلی سے بائیں کمرے میں گھس گئی کمرے کے اندر تاریکی تھی فضا میں دھوئیں کی کڑواہٹ تھی، وہ ڈر سی گئی۔ اندھیرے میں کسی کی پوپلی آواز نے اُسے دلاسا دیا۔

"آجاؤ بیٹی...... اندر آجاؤ۔ بابوجی سے روز کہتی تھی کہ ہمیں بھی گھر والی دکھاؤ۔"

کمرہ بے حد غلیظ تھا۔ ایک طرف چولہا تھا۔ جس میں انگارے دہک رہے تھے۔ دوسری طرف گھاس کی کھُردری چٹائی بچھی تھی۔ چٹائی کے ایک طرف دو عورتیں پاس پاس بیٹھی تھیں۔ ایک عورت کی گود میں بچہ تھا۔ بچے کی آنکھیں بہت نیلی تھیں۔ انگاروں کی روشنی میں کسی درندے کی آنکھ کی طرح دہک رہی تھیں۔ اور بڑی ڈراونی محسوس ہو رہی تھیں۔ سوماوتی کو نیلی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ لیکن اس ماحول میں نیلی آنکھیں دیکھ کر اُسے نیلی آنکھوں سے نفرت سی ہو گئی، صبح صبح اٹھ کر دعائیں مانگتا کہ اُس کے اپنے بچے کی آنکھیں نیلی ہوں۔ یہ دعائیں سی لگیں۔ بچے سے زبردستی نگاہیں ہٹا کر اس نے کمرے کے باقی حصّے کا جائزہ لیا۔ سارے کمرے میں گھاس پھوس بکھرا پڑا تھا۔ کہیں کوئی پھٹا چیتھڑا بھی گھاس پھوس میں اضافہ کر رہا تھا۔ سوماوتی کو عجیب سا لگا۔ ہر کپڑے کا رنگ کالا تھا۔ شاید اس گاؤں میں کالے رنگ کا رواج تھا۔ لیکن غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ کپڑے کالے نہ تھے۔ بلکہ میل نے سارے کپڑوں کو رنگ دیا تھا۔ گندے لوگ ...... کمرے میں ایک بھی کھڑکی نہ تھی صرف دیوار کے ایک کونے میں چھوٹا سا چھید تھا روشندان تھا۔ جس میں ٹکے جالے، کالک

میں لتھڑے ہوئے کالے سانپوں کی طرح لٹک رہے تھے کمرے کا فرش چھوٹے چھوٹے گڑھوں سے پُر تھا۔ کوئی کوئی گڑھا پانی سے پُر دکھائی دے رہا تھا۔ شاید بچے کا پیشاب تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے بوڑھیا کی طرف دیکھا۔ بوڑھیا سامنے رکھے پیالے میں سے اُبلے آٹے جیسی کوئی چیز انگلیوں سے نکال نکال کر چاٹ رہی تھی۔ سارا ہاتھ لتھڑ گیا تھا۔ سوماوتی اور زیادہ برداشت نہ کر سکی۔ اُسے اُبکائی آئی۔ وہ اندھا دھند کمرے سے باہر نکلی۔ راہداری کی دہلیز تک پہنچ نہ پائی تھی کہ قے شروع ہو گئی۔ دینا ناتھ بھی دوڑتا ہوا بیوی کو سہارا دینے کے لئے پہنچ گیا۔ خالی پیٹ اُبکائیوں سے سوماوتی کا بُرا حال ہو گیا۔ مالک مکان کی بیوی بھی دوڑی دوڑی مدد کے لئے آئی۔ لیکن دینا ناتھ کو بیوی کے پاس دیکھ کر دور ہی کھڑی رہی۔ سوماوتی کی آنکھوں میں آنسو ابل آئے۔ سانس رُک رُک کے آ رہا تھا جیسے کوئی گلا دبا رہا ہو۔ بے حال ہو کر وہ پٹی پر گر گئی۔ ہچکیوں سے اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ مالک مکان کی بیوی نے گہری نگاہوں سے سوماوتی کے جسم کا جائزہ لیا۔ اور واپس لوٹ کر بڑھیا سے کھسر پھسر کرنے لگی۔

---

رحمان گھاٹ سے سامان لے کر تب پہنچا جب سوماوتی کچھ سنبھل گئی تھی اور اپنے کمرے میں لوئی اوڑھے چٹائی پہ آرام کر رہی تھی۔ دینا ناتھ نے اسٹوو جلا کے قہوہ بنایا تھا۔ ایک پیالی قہوہ سوماوتی کے پیٹ میں جا چکا تھا اور

دینا ناتھ اصرار کر رہا تھا۔ کہ دوسری پیالی بھی پی لے۔

رحمان نے کہا "ہاں بھابی۔ صبح کھانا بھی نہیں کھایا ہے پی لو دوسری پیالی۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

سوماوتی کو گھر کی تلخ باتیں یاد دلانی اچھی نہ لگیں۔ اُس نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ ابھی کھانا پکاؤں گی تو کھاؤں گی۔" دینا ناتھ کو تسکین سی مل گئی کہاں تو وہ سمجھ رہا تھا کہ بیوی بیمار ہو گئی۔ اور نہ معلوم کتنے دن اُسے سنبھالنا پڑے گا اور کہاں اب کھانا خود پکانے کے لائق ہے۔ اُس نے بیوی کو ہمت دلائی۔

"ٹھیک ہے۔ کھانا کھا نا ہی اچھا رہے گا۔ تو برتن سنبھال میں پکانے کا بندوبست کرتا ہوں"

"پانی کس سے منگاؤ گے...... سوماوتی نے پوچھا

"مالک مکان سے۔ کمرہ لیتے وقت فیصلہ ہوا تھا کہ پانی وہی لایا کرے گا۔"

"نہیں...... نہیں......" سوماوتی کو پھر سے اُبکائی سی آئی۔ "میں اِن گندے آدمیوں سے منگایا پانی استعمال نہیں کروں گی۔"

"اچھا بھئی اچھا۔ پر آہستہ تو بولو۔ یہ لوگ سنتے ہوں گے۔ کیا سمجھیں گے۔" دینا ناتھ نے غصے سے کہا۔

"میں کوئی جھوٹ بول رہی ہوں جو آہستہ بولوں۔" سوماوتی کے لہجے نے ثابت کرنا چاہا کہ اِس گھر کی مالک وہ رہے گی۔"

سوماوتی منہ پھلا کر خاموش رہی لیکن دینا ناتھ سے نہ رہا گیا "نہیں کبھی رحمان میں تمہیں پانی نہیں لانے دوں گا۔ تم کیا میرے نوکر ہو؟"

لیکن رحمان ایک نہ مانا۔ اُس نے مٹی کے گھڑے کو اُٹھایا اور باہر نکل آیا۔ آہٹ مرتے ہی دینا ناتھ بیوی پر برس پڑا۔

"دیکھو ذرا سی بات کہاں پہنچا دی تم نے۔ رحمان کو پانی لانا پڑا۔ سب تمہاری حجت سے ہوا۔"

"تو کیا بُرا ہوا۔ ایک گھڑا پانی لانے سے رحمان تھک تو نہیں جائے گا۔" سوماوتی دینے والی نہیں تھی۔ "ان لوگوں کو ایسے کاموں کی عادت ہے۔"

"تو تم میرے دوستوں کو اپنا نوکر سمجھتی ہو ——" دینا ناتھ دھاڑا۔

"ان پڑھ جاہل ہانجی تمہارے دوست ہوں تو میرا کیا قصور۔" سوماوتی نے دھیرے سے کہا۔ ویسے وہ بڑی خوش تھی کہ اُس کا حربہ کامیاب ہو رہا تھا۔ دینا ناتھ ایک ایک کر کے ہتھیار ڈالتا جا رہا تھا۔ لیکن دینا ناتھ کو بیوی کی سرگوشی سانپ کی پھنکار سی محسوس ہوئی۔ جی چاہا ہاتھ اُٹھا کر ایک دے مارے۔ وہ رُک گیا۔ پہلا دن تھا۔ پہلے ہی دن لوگ میاں بیوی میں جھگڑا ہوتے دیکھ لیں تو اُس کی عزت کی دھجیاں اُڑ جائیں گی۔ اِس لئے وہ خاموشی سے اُٹھا اور بغیر کچھ کہے سنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

—— غلام محمد بانڈے سنگار میز کے سامنے کرسی
پر براجمان تھا۔ یوں تو سنگار دان کو کمرے کے کسی کنارے
ہونا چاہیئے تھا لیکن کمرے کی کچی دیواروں میں پیوست دو
چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے بہت کم روشنی اندر آتی تھی۔۔
غلام محمد بانڈے نے کبھی سوچا تھا کہ سنگار میز کو کھڑکی کے
پاس رکھ دے۔ لیکن جس خاص کام کے لئے اس نے یہ
سنگار میز شہر کے ایک کباڑیئے سے خریدی تھی۔ وہ کھڑکی کے
سامنے پورا نہ ہو سکتا تھا۔ کھڑکیوں کے سامنے راستہ تھا
اور ہر آنے جانے والوں کی نگاہیں اسے دیکھ پاتیں اور
بات کا تبنگڑ بن جاتا۔ ویسے ہی کیا کم دکھ اٹھانے پڑے
تھے اس کو گاؤں والوں کے ہاتھوں سے۔ اس لئے کمرے
میں بچھے نئے قالین کی پرواہ کئے بغیر اس نے سنگار میز کو
کمرے کے وسط میں کھڑا کیا تھا۔ حتی کہ قالین میں سجا رہی
سنگار میز کے پایوں نے گڑھے ڈال دیئے تھے۔ ویسے

اس کمرے میں قالین بھی اجنبی سا لگتا تھا۔ کمرے کے طول سے بڑا ہونے کے سبب قالین کو ایک کنارے سے موڑ دیا گیا تھا۔ قالین خریدتے وقت اُس نے کمرے کا ناپ لینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ یہی کیا کم تھا کہ عمر بھر کھردری چٹائیوں اور ننگے فرش پر بدن گھس گھس کے وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ کباڑیے سے پرانا قالین خرید سکے۔ اور اُسے فخر تھا کہ گاؤں میں وہ واحد شخص ہے جس کے گھر میں قالین ہے۔ قالین کمرے کے طول سے بڑا تھا تو تھا لیکن اگر اُسے قالین سے کوئی شکوہ تھا تو یہ تھا کہ قالین کا عرض کمرے کے عرض سے کچھ چھوٹا تھا جس کی وجہ سے کمرے کے پورے عرض میں کچے فرش کی نالی سی بن گئی تھی۔ خیر...... خدا نے چاہا تو نیا مکان بھی جلد ہی بن جائے گا۔ اُس کا کوئی کمرہ اس قالین کے موافق بنوانا پڑے گا۔ غلام محمد بانڈے نے سوچا اور خوش ہو گیا۔

——— اُس نے ہاتھ بڑھا کر سنگار میز کی دراز کھینچی۔ دراز میں سے ہرے رنگ کی بوتل نکال لی۔ اور بوتل کا کارک کھول دیا۔ ہرے رنگ کا سیال اُس کی ہتھیلی پر گرتے ہی خوشبو کی پھنکاریں مارنے لگا۔ بوتل کو احتیاط سے میز پر رکھ کر وہ بڑے پیار سے ہتھیلی پر پھیلے سیال کو سر پر ملنے لگا۔ اس کے سر پر کوئی بال نہ تھا۔ بالوں کی جگہ گنج کی ڈھیر تھا۔ جو کنپٹیوں کے پاس سمٹ سی آئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس نئی دوائی سے نہ ہی کھلی سر اُبھارے گی اور نہ ہی بدبو

کی لپٹیں۔ اس چھوٹی سی بوتل کی قیمت ساڑھے آٹھ روپے دیتے ہوئے وہ ہچکچایا ضرور تھا لیکن خریدے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔

——— کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دروازے کی کنڈی چڑھی ہوئی تھی پھر بھی ہر آہٹ پر وہ چونک اٹھتا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ کوئی زمانہ تھا جب وہ گاؤں کے چوراہے پر بیٹھ کر لوگوں سے بے پرواہ گنج پر تیل کی مالش دن دہاڑے کیا کرتا تھا اور دھوپ سینکا کرتا تھا۔ لیکن جب سے اس کا نام گاؤں کے ٹھیکہ داروں کے زمرے میں آیا تھا تب سے یہ گنج اس کے دل میں کھٹکنے لگا تھا۔ اور اب تو یہ کھٹک تشویش کی حد کو چھونے لگی تھی۔ دہلی سے کچھ ماہر کام کا جائزہ لینے کے لئے آ رہے تھے۔ ظاہر تھا ایسے موقعوں پر اسے خود موجود رہنا پڑے گا۔ تاکہ یہ ماہر سیمنٹ میں بیجا ملاوٹ یا ناقص اینٹوں کی طرف دھیان نہ دے سکیں۔ روپے پیسے سے بات ٹل جاتی تو وہ بے دریغ خرچنے پر آمادہ تھا۔ سونا داری کے کئی افسروں کی قیمت اس کے سامنے ٹکوں میں کھل گئی تھی۔ لیکن کون جانے یہ ماہر کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوں۔ اس لئے اس کے دل میں ایک انجانا سا خوف ابھر رہا تھا۔ جیسے کہ وہ اپنی شخصیت سے جھٹلانا چاہتا تھا۔ ویسے اس کی شخصیت کچھ کمزور ذات نہ تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، موٹے موٹے بازو، [illegible]

سخت جسم۔ بھاری ڈیل ڈول۔ سر پر پگڑ رکھنے پر وہ پٹھان سا لگتا تھا۔ لیکن یہ سالا گنج اُس کی شخصیت پر ڈھال کی طرح چھایا ہوا تھا۔

مالش کرتے کرتے اُس کا ناخن کسی زخم کو کھرونچ گیا۔ اور اس کی سوچ کو جھٹکا سا لگا۔ اسے محسوس ہوا۔ ٹھیکیدار بن کر رہن سہن کے ساتھ ساتھ اُس کی سوچ بھی بدل رہی ہے اب وہ خود سے بھی دھوکہ کر رہا ہے۔ جیسے ٹھیکیداری میں کرنا پڑتا ہے۔ اصل میں اُسے گنج سے پرخاش نہ ہونی چاہیے گنج کی بدولت ہی وہ اِتنا بڑا آدمی بن گیا۔

——— جب سے وہ پیدا ہوا تھا۔ اُس کے گنج پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں، قہقہے اڑائے جاتے تھے۔ اُسے کوئی پاس بٹھانے کا بھی روادار نہ تھا۔ مجبوراً وہ سخت جان بن گیا۔ کسی نے پھبتی کس لی اور اُس نے طمانچہ جڑ دیا۔ کوئی ہنسا تو وہ جھگڑ پڑا۔ پورا گاؤں ایک طرف اور وہ ایک طرف کسی کی ہمت نہ تھی جو اُس سے ٹکر لیتا۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ بے تاج بادشاہ تھا گاؤں کا۔ اُس کا لفظ قانون تھا۔ کہیں کوئی میلہ لگا تو انتظام اُس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ کہیں کوئی شادی بیاہ ہوتا۔ تو وہ پیش پیش رہتا۔ حتی کہ حکومت کو بھی اُس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ ٹھیکیدار بنا۔ اب تو وہ گاؤں کا خدا بنتا جا رہا تھا۔ جو لوگ پہلے نفرت کے مارے اُس کو اپنے پاس بٹھانے کے روادار نہ تھے۔ اب کچھ ٹکوں کی خاطر اُس کی خوشامد کرتے

پھرتے تھے۔ واقعی ماسٹر جی کا کہنا سچ ہے "روپیہ اگرچہ خدا نہیں پر خدا کی برابری کا دم ضرور رکھتا ہے"۔

——— غلام محمد باندھے ان پڑھ تھا۔ لیکن ٹھیکیدار بننے کے بعد سرکاری کاغذات پر انگوٹھا ثبت کرتے وقت اُسے بڑی بے بسی سی ہونے لگتی تھی۔ ذہن میں ہزاروں وسوسے جنم لیتے۔ نہ معلوم کاغذات میں کیا کچھ لکھا ہو گا۔ کون جانے کارندے کون سے وارے نیارے کر رہے ہوں گے۔ اِس لئے اُس نے پڑھنا لکھنا بھی شروع کیا تھا۔ گاؤں کے سکول کا ہیڈ ماسٹر خود پڑھانے آتا تھا۔ وہی ہیڈ ماسٹر..... جو کچھ دن پہلے اُس بات۔ بات کرنی گوارا نہ کرتا تھا۔ کیوں کہ غلام محمد باندھے نے بیچ چوراہے پر اُس کی نقل اُتاری تھی۔ اور سکول کے ننھے ننھے بچوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائی تھیں۔

——— بھولا بسرا واقعہ یاد آتے ہی وہ کھلکھلا کے ہنس پڑا۔ آئینے میں داغدار دانت واضح ہو گئے۔ غیر ارادی طور پر اُس کا منہ بند ہو گیا۔ ٹھیکیداری شروع کرنے کے ساتھ ساتھ اُس نے مے نوشی بھی شروع کی تھی۔ اُسے خیال آیا کہ اُسے زیادہ شراب نہ پینی چاہیئے۔ دانت خراب ہو گئے تھے۔ کوئی دیکھے تو حاجی بن کر بھی کوئی اس کی عزت نہیں کرے گا۔ اور حج کو جانا از حد ضروری تھا۔ خیر..... ڈاکٹر کی گنج والی دوائی کامیاب رہی تو

وہ دانتوں کی دوائی بھی اِسی ڈاکٹر سے خرید لیگا۔

دفعتاً دروازے پر کھٹکا ہوا اور وہ گھبرا گیا ——— اُس نے تیزی سے بوتل بند کر کے سنگار میز کی دراز میں ٹھونس دی۔ سر پر کلاہ جما دی۔ اور تیل سے اٹے ہاتھ پشمینے کے بے داغ پھرن سے پونچھ لئے ......... "کون .... ہے .......؟" وہ غرایا۔

"حضور میں ہوں دینا ناتھ ........" آواز آئی اور غلام محمد بانڈے کا چہرہ تن گیا۔ اُس نے دروازے کی کنڈی گرا دی۔ رگڑ کی وجہ سے ہتھیلیوں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ کنڈی کے گرنے کی آواز سن کر دینا ناتھ نے باہر سے دروازے کو دبا دیا۔ دروازے کے پاس ٹھیکہ دار کو استہ رُکے پاکر وہ وہیں کھڑا رہا۔

"کہاں رہے اتنے دن ......" ٹھیکیدار کی کرخت آواز نے اس کا سواگت کیا۔ اور دینا ناتھ کو حسب معلوم متلی سی آنے لگی۔ ٹھیکیدار کو دیکھتے ہی اس کے ذہن میں گنج کی بدبو اُبھرتے لگتی تھی۔

"جی...... جی...... بس ذرا...... ذرا دیر ہو گئی" دینا ناتھ کی زبان آج لڑکھڑانی نہ چاہیئے تھی۔ وہ بہانے پوری طرح سے رٹ کے آیا تھا۔ ویسے دیر سے آنے کا اُس کے پاس معقول جواز تھا۔ لیکن کمرے کی فضا میں خوشبو کے تیز بھبکوں کو محسوس کر کے وہ لڑکھڑائی اور وہ

جھنجھلا کر کمرے میں پلٹ پڑا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دینا ناتھ کو اپنی مضبوط باہوں سے اٹھا کے اِس زور سے اچھالے کہ زمین پر گرتے ہی اُسکی آنتیں بکھر جائیں۔

"ایک دن کی چھٹی لے کر گئے تھے۔ تین دن غائب رہے ایسے نوکری نہیں کی جاتی..." ٹھیکیدار نے ایسے کہا جیسے دینا ناتھ کو واقعی اُچھال رہا ہو"۔

جناب دیر ہو گئی۔ گھر والی کو لانا پڑا۔ سامان وغیرہ ٹھورنے میں دن لگ گئے" دینا ناتھ نے کہا اور بے صبری سے پاؤں پٹک دیئے۔ اور ننگے پیر اس کی گرد بھرے قالین پر سفید چھاپ کی طرح چھٹ گئی۔ غلام محمد پانڈے نے قالین پر بڑھتے گرد کے داغوں کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ اُس نے خود نوکروں کو راہداری سے آگے جوتے استعمال کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ نوکروں کو اپنے سامنے ننگے پیر پاکے اُسے برتری کا احساس ہو جاتا تھا۔ ویسے بوسیدہ مکان کی کچی سیڑھیاں بھی محفوظ رہتی تھیں

"اچھا تو گھر والی کو ساتھ لے آئے ہو......؟"
ٹھیکیدار نے تنک کر پوچھا اور دینا ناتھ نے رٹے رٹائے جملے پھینکنے شروع کئے۔

"ہاں حضور......کھانے پینے کی بڑی تکلیف رہتی تھی۔ بیماری میں کوئی پانی پلانے پلانے والا نہ ہوتا تھا۔ گو اب دینے کا اندازہ منجھانہ تھا۔ گو غلام محمد پانڈے کی شخصیت نے

اُسے کبھی مرعوب نہ کیا۔ وہ خود بھی ہٹا کٹا تھا۔ اور بزدلوں کا رہگیروں کے سامنے شیر کی طرح گرجتا تھا۔ اگر وہ مرعوب تھا تو چاندی کے چند ٹکڑوں سے ...... جن کے سامنے عقل، ہنر، علم سب ہیچ تھا۔ ہٹا کٹا بدن ہیچ تھا۔۔۔ سب کچھ ہیچ تھا۔

ملتجیانہ انداز دیکھ کر ٹھیکہ دار دینا ناتھ کے نتھنوں کی واضح پھڑپھڑاہٹ بھول سا گیا۔ "مکان کا کیا بندوبست کیا۔" اس نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں حضور۔ وہی ایک کمرہ ہے۔ آتے ہی گھروالی کی طبیعت خراب ہو گئی۔" جواب دیتے ہوئے دینا ناتھ کے ذہن میں دن بھر کی تگ و دو ابھر آئی۔ اسے بے حد تھکن سی محسوس ہوئی۔ اور وہ پھسڑا مار کر قالین پر بیٹھ گیا۔

نوکر بیٹھ جائے اور مالک کھڑا رہے۔ غلام محمد باندے سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور سنگار میز کے آئینے میں اپنی کلاہ کا زاویہ ٹھیک کرنے میں مشغول ہو گیا۔ دینا ناتھ کہتا جا رہا تھا۔

"حضور آپ کی سفارش سے کوئی دوسرا مکان مل جائے تو مہربانی ہوگی۔ وہ مکان رہنے کے قابل نہیں۔ اصطبل ہے۔۔ ۔۔۔ جی ہاں........"

"مکان ملنا تو مشکل ہے۔ تم تو خود بھی جانتے ہو کہ گاؤں

کے ہر اچھے مکان پر افسروں نے قبضہ جما رکھا ہے۔" ٹھیکیدار نے حقیقت بیان کر دی۔

"تب جناب گھر والی کو واپس شہر بھیجنا پڑے گا۔ ایک کمرے میں رہنا مشکل ہے۔" دینا ناتھ نے بیچارگی ظاہر کی اور غلام محمد پانڈے سوچ میں پڑ گیا۔ دینا ناتھ بیوی واپس بھیج دے تو روز چکر لگائے گا۔ کام میں بہت حرج ہو گا۔ حرام زادے ماہر بھی معائینہ کرنے آ رہے تھے۔ اُن کے رہنے اور کھانے پینے کا بند و بست کرنا تھا۔ افسروں نے تو صاف کہہ دیا تھا۔ کہ خیریت چاہتے ہو تو ماہرین کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ سالے ........ آنے جانے کا خرچہ گورنمنٹ سے لیں گے اور کھائیں گے میرا۔ دینا ناتھ گھر کے چکر لگاتا تھا تو ہو چکا انتظام۔ معلوم نہیں یہ لوگ شادی کیوں کرتے ہیں۔ جب نوکری کرنی ہوتی ہے۔

"دیکھو بھئی۔ بیوی کو واپس بھیجنے سے اب کوئی فائدہ نہیں۔ ویسے اپنا نیا مکان بن جائے تو تم اِس مکان میں آ کر رہنا۔ تب تک گزارہ کر لو......" ٹھیکیدار نے اپنے زعم میں اسے مغالطے میں ڈال دیا اور دینا ناتھ خوش ہو گیا۔ بیوی کو بھیجنے کا سوال ہی نہ تھا۔ بھیجنا چاہتا بھی تو وہ نیک بخت جاتی بھی۔ لاچارگی صرف ٹھیکیدار سے رحم کو اُبھارنے کے لئے ظاہر کی تھی۔ تین دن کی غیر حاضری کو بھلوانے کے لئے ظاہر کی تھی۔ اِس لئے اُس نے جھٹ جواب دیا۔

"اب آپ کہہ رہے ہیں تو بھلا میں انکار کیسے کر سکتا ہوں؟"
ٹھیکیدار کے چہرے پر تناؤ ڈھیلا ہوتے محسوس کر کے اُس نے اپنا مدعا ظاہر کر نا غنیمت جان لیا۔ اس نے بڑی حلیمی سے کہا "حضور ــــ میں ایک آدمی کو لے آیا ہوں۔ اسے کام پر لگا دوں؟"
"کہاں سے لے آئے ہو ......" ٹھیکیدار چوکنا ہو گیا۔
"کہیں مستری اپنے آدمیوں کو بھرتی کر کے وارے نیارے کرنا شروع کر دے تو پتہ چلنا مشکل تھا۔ وہ خود پڑھا لکھا ہوتا تو دینا ناتھ کو کبھی کی چھٹی دے ڈالتا۔ ان شہر کے لوگوں سے خدا بچائے!"
دینا ناتھ نے چاہا کہ کہدے اُس کا دوست ہے لیکن اُس نے اپنی زبان کو لگام دی۔ رحمن مزدوری کرنے کے لئے آیا تھا۔ ہانجی کا بیٹا تھا۔ ٹھیکیدار کو پتہ چل گیا کہ اُس کے مستری کے دوست ہانجی ہیں تو عزت دو کوڑی کی بھی نہیں رہے گی۔ شاید سوماوتی کا کہنا ٹھیک تھا۔ رحمن کو ہر کسی کے سامنے دوست ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ نہ کہنے سے دوستی میں فرق تو نہیں آ سکتا۔ اِس لئے ٹھیکیدار کے سامنے جھوٹ بولنا ہی مناسب تھا۔ "حضور...... شہر میں میرے محلے کا آدمی ہے بہت غریب ہے حضور۔ بنڈ تعمیر کرنے کے لئے مزدور رکھتے ہیں۔ اُسے بھی رکھ لیں گے۔"
ٹھیکیدار کے جی میں آیا کہہ انکار کر دے۔ پھر پتہ کا

ذکر سن کر اُسے ماہرین کا خیال آگیا۔ کہیں مستری اس نازک وقت میں ناراض ہوگیا۔ تو نہ معلوم کہاں چوٹ کر دے۔
اُس نے حامی بھر لی۔
"تو سبھی رکھ لو.......... کیا فرق پڑتا ہے۔ اور سنو.. باہر سے کچھ ماہر دورے پر آ رہے ہیں۔ ان کا بندوبست کرانا ہے"
"کیسا بندوبست حضور۔......' دینا ناتھ نے وضاحت چاہی۔
"ارے بھئی..... کھانے پینے کا بندوبست.... تم جانتے ہی ہو۔ سرکاری آدمی ہیں۔ کام کا جائزہ لیں گے"
ٹھیکہ دار نے اُس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور دینا ناتھ خاندانی مستری کی طرح غرور سے بولا۔
"آپ فکر نہ کیجئے۔ اینٹیں اور پتھر آج ہی ہٹوا دوں گا۔ اور ان کے بجائے صاف صالحہ رکھوا لوں گا۔"
"سیمنٹ بھی ذرا صاف استعمال کرنا۔ جس جگہ ٹیپ نہیں ہوا ہے۔ وہاں اچھے سیمنٹ کا ٹیپ کرانا... دھیان رہے۔"
"پر حضور.... پھر تو بہت نقصان ہو جائے گا" دینا ناتھ نے من ہی من میں حساب لگانا شروع کیا۔
"اس وقت نقصان کی نہ سوچو۔ وہ لوگ بہت تیز ہیں۔ نقصان بعد میں بھی پورا ہو سکتا ہے۔" ٹھیکہ دار نے سمجھایا۔

رہنے کا انتظام ڈاک بنگلے میں ہونا چاہیئے۔"

"کھانے وغیرہ کا انتظام بھی ڈاک بنگلے میں ہی ہو گا حضور"
دینا ناتھ نے بڑی معصومیت ظاہر کی۔ اور ٹھیکہ دار دینا ناتھ
کی مکاری سمجھ گیا۔ اس نے رُوکھے لہجے میں کہا۔ "کھانا یہاں
سے بھی بن کر جا سکتا ہے۔"

"لیکن حضور ڈاک بنگلے تک پہنچتے پہنچتے ٹھنڈا ہو جائے
گا۔" دینا ناتھ نے بظاہر معقول بات کہی لیکن ٹھیکہ دار جھانسے
میں نہ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاک بنگلے پر کھانے کا انتظام
کیا جائے تو سنتری سنبری مصالحے میں گہرا ہاتھ مارے گا۔ اس
نے چاہا ڈانٹ دے دینا ناتھ کو۔ لیکن دینا ناتھ کی تیکھی نگاہیں
اپنے کلاہ پر مرکوز پا کر وہ کھسیانا سا ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر
اس نے کلاہ کا زاویہ بدل دیا۔ دینا ناتھ بدستور کلاہ کو گھورے
جا رہا تھا۔ اور ٹھیکہ دار کو محسوس ہوا کہ اب تک وہ کئی بار
کلاہ کا زاویہ بدل چکا ہے۔ وہ جھنجھلایا "خیر۔۔۔۔ تم کہتے
ہو تو ڈاک بنگلے پر ہی کھانے کا انتظام کرا دو۔"

دینا ناتھ دل ہی دل میں ہنس دیا۔ اس کا حربہ کار
گر ہو گیا۔ جب کبھی اس کو ٹھیکہ دار سے کوئی بات منوانی
ہوتی تھی۔ تو وہ خاص طریقے سے اپنی نگاہیں ٹھیکہ دار کی کلاہ
پر جما دیا کرتا تھا۔ جیسے کلاہ کو نہ دیکھ رہا ہو۔ بلکہ کلاہ کے نیچے
چھپے گنج کو دیکھ رہا ہو۔ حتیٰ کہ ٹھیکہ دار جھنجھلا کر ہتھیار
ڈال دیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر دینا ناتھ بالکل بھول جاتا

تھا کہ وہ مالک کے سامنے ہے۔ اور مالک چاہے تو نوکری سے
برطرف کر سکتا ہے۔ اس لئے اُس کو مالک کے سامنے سگریٹ
نہیں پینی چاہیئے۔ لیکن کامیابی کی خوشی میں نشہ کی طلب بڑھ
گئی تھی۔ اس لئے اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے کوٹ
کی جیب کی طرف بڑھنے لگا۔ ٹھیکیدار نے اُس کے ارادے
کو سمجھا نپ لیا۔ دینا ناتھ کی دیدہ دلیری اُسے بالکل اچھی نہ
لگی۔ اُس نے حکم دیا۔

"اب بیٹھے بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ تین دن کے بعد آئے
ہو۔ جاؤ۔ ذرا کام کی سدھ لو۔"

دینا ناتھ نے ٹھیکیدار کے لہجے میں کھلی کڑواہٹ
محسوس کی۔ اور اُس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ اپنا داؤ تو کامیاب
ہو گیا تھا۔ کُتا.... چلاتا ہے تو چلاتا رہے۔ اب مزید رُکنا فضول
تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اور باہر جانے لگا۔ رحمٰن بے چارہ
اُس کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہو گا۔

دینا ناتھ کے جاتے ہی ٹھیکیدار کا چہرہ نفرت کی شدت
سے گھناؤنا ہو گیا۔ دروازہ بند کر کے اس نے کلاہ کو بے احتیاطی
سے سنگار میز پر پھینک دیا۔ دراز میں سے دوا کی بوتل نکال لی۔
ہتھیلی پر تیل انڈیل دیا۔ اور گنج پر زور زور سے مالش کرنے
لگا۔ ہر رگڑ کے ساتھ منہ سے گالی نکلتی گئی۔

"حرامی.... سالا.... کام چور.... بدتمیز......."

—— رحمن چولہے کے سامنے دوزانو بیٹھا چولہا جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لکڑیاں گیلی تھیں۔ اوپلے تھے نہیں اِس لئے خالی لکڑیاں آگ نہیں پکڑ رہی تھیں۔ گو چولہا پھونکتے پھونکتے اُس کے سارے بدن میں آگ لگ چکی تھی۔ دھوئیں کے کڑوے مرغوں نے اُس کے سینے میں جلن پیدا کر دی تھی۔ گلا سوکھ گیا تھا۔ آنسو ایسے گر رہے تھے جیسے آبشار وہ بے دم ہو گیا۔ لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری۔ شاید اِس لیے کہ لکڑیاں کبھی کبھی اُس کے سانس کی تمازت سے بھڑک اٹھتیں۔ پر جوں ہی وہ دم سنبھالنے لگتا۔ آگ کی لپٹ لہرا کر دھوئیں میں تبدیل ہو جاتی۔ اور کمرے کے اندر پھیلے کڑوے دھوئیں کی دبیز تہہ میں اضافہ کرتی۔ کمرے میں اتنا دھواں بھر گیا تھا۔ کہ سامنے پڑا عبدالسلام کا لپٹا بستر، کونے میں رکھی مٹی کی ہانڈیاں اور ہانڈیوں سے ذرا اُدھر مٹی کے تیل کا چمکدار کنستر کبھی نہ دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے ٹٹول کر پانی کے گھڑے سے گلاس بھر پانی نکالا چہرے اور آنکھ پہ

کچھ چھینٹے دیئے۔ باقی پانی غٹاغٹ پی گیا۔ سینے کی جلن تو کچھ کم ہوئی پر آنکھوں کا درد بدستور رہا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے بیٹھ گیا۔ تاکہ صاف ہوا میں سانس لے سکے۔ آنسوؤں سے لبریز نگاہیں آس پاس کے مکانوں سے ٹکرا گئیں۔ ہر مکان سے دھوئیں کی موٹی موٹی لکیریں اژدھوں کی طرح آسمان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ نگاہیں کسی کسی مکان کی کھلی کھڑکیوں کے اندر بھی بھٹک گئیں۔ مکانوں کے اندر کہیں کوئی حقہ لئے بیٹھا پی رہا تھا۔ اور کہیں کسی عورت کے پھرن کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ پاس والے مکان میں کوئی کنواری لڑکی اپنے ہاتھوں میں سماوار تھامے چائے بانٹنی بھر رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی بھوک تیز ہوگئی لیکن بھوک سے زیادہ سینے کی جلن ابھر آئی — جیسے گرم گرم چائے کا پیالہ کسی نازک ہاتھ نے اس کے سینے پر گرا دیا ہو۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے گھر ہوتے ہیں۔ مائیں بہنیں اور بیویاں ہوتی ہیں۔ دن بھر تھک ہار کے گھر لوٹ کر کسی کی میٹھی مسکراہٹ کسی کی پیار بھری دلا اور کسی کا تیکھا غصہ ان کی تھکن کو دور کر دیتا ہے۔ اور ایک وہ ہے ......... اکیلا ....

حیران و پریشان اس غیر مکان میں چولہے سے سر ٹکرا رہا ہے۔ محسوس ہوتے ہی اسے اپنے آپ پر رحم سا آگیا۔ واقعی وہ بڑا بد قسمت تھا کوئی بھائی نہ کوئی بہن۔ ایک ماں تھی تو وہ بچپن میں ہی جنت کو سدھار گئی تھی۔ وہ جیتی بانہیں کرتا تو کس سے۔ باپ ہے تو صرف مار پیٹ پر تیار گالی گلوچ پر تیار۔ باپ کا بس چلے تو

کولھو میں جوتتا پھرے اس کو...... بوڑھا..... خبیث...... یکایک رحمٰن کو محسوس ہوا کہ باپ کے متعلق سوچنے سے نہ ہی اس کی بھوک کم ہوئی اور نہ ہی بیٹے کی جلن۔ اسے چاہیئے۔ ذہن کو لگام دے کر، چولہے کی فکر کرے اور کچھ کھا پی کر آرام سے سو جائے۔ صبح سویرے کام پر جانا تھا۔

____ اس نے کمرے کے اندر جھانکا۔ دھواں کچھ کم ہو چلا تھا۔ اور چولہا بجھا پڑا تھا۔ غیر ارادی طور پہ اس کی نگاہیں مٹی کے تیل کے کنستر سے ٹکرا گئیں۔ ذرا سا تیل چولہے میں ٹپکانے سے لکڑیاں بھڑک اٹھیں گی۔ اور وہ چائے بنا سکے گا۔ نہیں.. .... وہ چائے نہیں بنائے گا۔ چائے کا وقت تو گذر گیا تھا اب تو اسے رات کا کھانا بنانا چاہیئے۔ انتڑیاں سوکھی جا رہی تھیں۔ صرف چاول بنا لے گا۔ سبزی بنانے کی سکت نہیں۔ نمک اور پیاز سے گذارہ ہو سکتا ہے۔ اسے چاہیئے۔ تیل کے کنستر سے کچھ قطرے نکال کر لکڑیوں پر چھڑکے۔ ______..... وہ ٹھٹھک گیا۔ کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا۔ اور کوئی اندر آ رہا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں...... سر پہ کالا پگڑ جمائے کوئی آ رہا تھا۔ بھلا کالی پگڑی بھی کوئی پہنتا ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے کالی لگ رہی ہو گی۔ رحمان نو وارد کو پہچان نہ سکا۔

"کون ہو جی تم......." رحمٰن کا بدن تن سا گیا۔ جیسے چوری کرتے کرتے پکڑا گیا ہو۔

"میں ہوں عبدالسلام......" نو وارد نے ایک بڑا سا

سنیلا دروازے کے پاس گراتے ہوئے جواب دیا۔ اور جوتوں کے تسمے کھولنے میں مشغول ہو گیا۔

"اوہ......... عبدالسلام صاحب.... آیئے آیئے.... آیئے بیٹھیے۔...." رحمن کی آواز لڑکھڑا گئی۔ شکر تھا اللہ کا۔ عبدالسلام کچھ لمحے بعد آٹپکتا تو بڑی گت بنتی "بہت دیر کے بعد آپ آئے میں تو روز انتظار کرتا تھا۔ جی ہاں روز انتظار کرتا تھا"۔ رحمن نے اپنے ڈر کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں گم کرنا چاہا۔

عبدالسلام جوتے نکال کر اپنے بستر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "اوہ ..... بہت تھک گیا ہوں ...."

"چائے بناؤں آپ کے لیے۔ بھوک لگی ہوگی ..." رحمن نے پوچھا۔

"ہاں بھوک تو لگی ہے۔ چائے کا وقت نہیں۔ کھانا کھاؤں گا۔" عبدالسلام نے نیم وا آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ رحمن کی پوچھ تاچھ اسے عجیب سی لگی۔ اس لیے اس نے مالکانہ انداز میں پوچھا۔ "تم نے کھانا پکا یا کیا....؟"

"نہیں صاحب ....... ابھی نہیں ...." رحمن نے چولہے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو کھانا ہی بنالو۔ تمہارے پاس راشن تو ہوگا۔" عبدالسلام نے مٹی کی ہانڈیوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ نہ معلوم اس شخص نے کیا گل کھلا بیٹھا ہوگا۔ جاتے وقت تو سامان جانچنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ ویسے ہر چیز قرینے سے ہی سجائی تھی۔ حتیٰ کہ اس کا بستر

کبھی ویسے ہی لپٹا پڑا تھا جیسے وہ چھوڑ گیا تھا۔

"میرے پاس راشن ہے صاحب۔ آپ آرام کرلیں۔ میں چولہا جلائے دیتا ہوں۔ لکڑیاں ذرا گیلی ہیں۔" رحمن نے برخورداری ظاہر کی لیکن دل میں نئی تشویش ابھر رہی تھی۔ عبدالسلام واپس آگیا تھا آج نہیں تو کل کہیں اور ڈیرا لگانا پڑے گا۔ نہ معلوم اب کس در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔

"ارے رحمن شکر کرو کہ گیلی لکڑیاں مل گئیں۔ سردیاں سر پر آنے دو۔ پھر دیکھو گے کہ یہاں کتنا بُرا حال ہو جاتا ہے" عبدالسلام نے اپنی واقفیت کا ثبوت دیا لیکن دل میں خیال آیا کہ اسے رحمن سے مزید واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ کہ اس کے جانے کے بعد کوئی ہنگامہ تو برپا نہیں ہوا۔ جانے کو تو وہ شہر چلا گیا تھا۔ لیکن بیوی بچوں کے بیچ رہ کر بھی اس کا ڈر زائل نہ ہوا تھا۔ ہر آہٹ پر گمان ہوتا کہ پولیس اسے لینے آرہی ہوگی۔ ہر کھٹکے پہ جان نکل جاتی۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر گھر بھر پریشان ہو گیا۔ سوچتے ہوں گے سونا دیدی کی آپ بیتی راس نہ آئی ہوگی پتہ چلے اس کی کرتوتوں کا تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ لیکن اتنے دن کوئی پتہ نہ چلا۔ تو اب کیا خاک چلے گا۔ شاید بھولی نے بدنامی کے ڈر سے راز ظاہر نہیں کر دیا ہے۔ نہ معلوم کون سا نیک کام آڑے آگیا۔ جو اتنے بڑے گناہ کی سزا سے بچ پایا۔ عبدالسلام نے

نے توبہ پڑھی اور خدا کے توکل پر واپس چلا آیا۔ اور اب اسے یقین نہ آرہا تھا کہ وہ اپنے کمرے کے بیچ، اپنے سامان کے درمیان، اپنے بستر سے ویسے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ جیسے پہلے بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے اپنے وجود میں اطمینان اور خوشی کی ایک لہر سی محسوس کی۔

"ارے بھئی لکڑیاں گیلی ہیں تو وہ مٹی کے تیل کا کنستر پڑا ہے۔ ٹپکا دو کچھ تیل لکڑیوں پر۔ منٹوں میں آگ پکڑ لیں گیں۔"

"جی بہت اچھا.....جی" رحمن کے ذہن پر بھا جیسے کسی نے مٹی کا تیل ٹپکا یا ہو۔ "ابھی ڈالتا ہوں صاحب.....ابھی ڈالتا ہوں" رحمن کو یقین نہ آیا کہ عبدالسلام نے ایسی پیش کش کی ہو۔ اس نے کئی بار عبدالسلام کی غیر حاضری میں کنستر سے تیل نکال کر روشنی کی کپی جلائی تھی۔ سوچا تھا۔ مزدوری ملتے ہی وہ تیل خرید کے پورا کر لیگا۔ پر اب تک اُسے کوئی پیسہ نہ ملا تھا۔ شاید اسی لئے اُس نے عبدالسلام کی راشن میں سے بھی کچھ راشن پر ہاتھ مارا تھا۔ عبدالسلام کو اپنا سامان جانچنے کا خیال ہوتا تو آتے ہی جانچ لیتا۔ اب ناپ بھی لے کنستر تو تیل کی سطح کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا رحمن کے بہت سارے ڈر دور ہو گئے۔ اس کی نگاہوں میں عبدالسلام کی وقعت بڑھ گئی۔ اب عبدالسلام کی لمبی لمبی موچھیں بھی اس کے دل میں نفرت کو نہ ابھار سکیں۔

لکڑیاں بھڑک اٹھیں۔ تو اس نے چاول ابالنے کے لیے

ہانڈی چولہے پر چڑھا دی۔ عبدالسلام نے تھیلے میں سے کچھ تازی سبزی نکال کر کاٹنی شروع کی تو رحمٰن کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ ایک عبدالسلام تھا جو بغیر جان پہچان کے اتنی خاطر داری کر رہا تھا۔ اور ایک اُس کا اپنا دوست تھا دینا ناتھ جس کے گھر جانا بھی اب اس کو گوارا نہ تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ دوست دوست کا کام کرے۔ تو شرم کی کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ تو ٹھیک نہیں تھا کہ خدمت گار کی طرح کام میں جوتنے۔ کبھی پانی لاتا۔ کبھی سبزی سودا بازار کا چکر۔ کبھی راشن کی بوری اٹھالاتا۔ اور کبھی جھاڑو دینے کی فرمائش۔ اور جب کوئی کام نہ ہو تو سوما دتی حساب کرنے بیٹھ جاتی تھی۔ کہ اس نے کتنا روپیہ لیا ہے۔——— پہلے دینا ناتھ کو کبھی یہ فکر نہ رہا کرتی تھی۔ اُس کا اپنا پیسہ خرچ ہوتا ہے یا دینا ناتھ کا۔ لیکن جب سے سوما دتی آئی تھی تو دینا ناتھ کا رویہ بدل گیا تھا۔ اب کبھی کبھار ہی ملا کرتا تھا۔ کاش وہ یہاں نہ آتا۔ دینا ناتھ نے اسے نوکری کیا دی تھی جیسے خرید لیا تھا۔ اُسے مزدوری کے پیسے مل جائیں تو وہ واپس چلا جائے۔ نہ جا سکے تو کم از کم دینا ناتھ کا قرضہ تو اتار دے۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ دینا ناتھ نے کبھی پیسے کا تقاضا نہ کیا تھا۔ نہ ہی کبھی اُس نے کسی کام کے لیے کہا تھا۔ سارا قصور سوما دتی کا تھا۔ عورت نہ تھی مصیبت تھی۔ شہر میں ساس سسر کی وجہ سے کچھ نہ چلا کرتا تھا۔ لیکن یہاں آکر دینا ناتھ کو مٹھی میں بند کر لیا ہے۔ دینا ناتھ بیچارہ کرے تو کیا کرے۔ واقعی کیا کرے۔ دودھ پیتا بچہ ہے نا۔۔۔۔ بھلا بیوی پر دوست کو کیسے ترجیح دے ———ہوں!

چولہے پر چاول کی ہانڈی اُبل رہی تھی اور ساتھ ساتھ رحمن کا ذہن بھی اُبل رہا تھا۔ اُس نے سوچا۔ دینا ناتھ نے بیوی کے لیے دوست کو چھوڑ دیا۔ بچپن کے ساتھی کو چھوڑ دیا تو کیا وہ خود بھی بیوی کے لیے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ دے گا۔ بوڑھے باپ کو چھوڑ دے گا۔ جو اسد کی لڑکی کو بیٹے کی بیوی بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ نہیں ........ وہ بیوی کی خاطر اپنے ساتھیوں کو نہیں بھولے گا۔ کبھی نہیں ..... چاہے بیوی کی جان نہ رہے۔ محسوس کرتے ہی غرور کی لہر اس کے چہرے پر اُمڈ آئی۔ اور اس نے بے خیال بلب۔ دادطلب نگاہوں سے عبدالسلام کی طرف دیکھا جو اُسے ٹک ٹک گھورے جا رہا تھا۔

دفعتاً رحمن کی نگاہیں اپنے اوپر پاکر عبدالسلام نے بات چھیڑ دی۔

"کیوں بھئی ...... تمہارا نام کیا ہے۔ میں تو تمہارا نام ہی بھول گیا ہوں۔"

"عبدالرحمن ............ رحمن نے چاول اُتارتے ہوئے جواب دیا۔

"دینا ناتھ نے کہا تھا کہ تم اُس کے دوست ہو۔ تم ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہو" عبدالسلام نے کریدنا شروع کیا۔

"بچپن سے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھیلا کرتے تھے"۔ رحمن کا دل چاہا کہ کہدے کہ وہ ایک دوسرے کے دوست نہیں دینا ناتھ بدل گیا ہے۔ اور دوست کو بھول گیا ہے۔

اور ہاں...... میرے جانے کے بعد گاؤں میں کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا۔ یہ گاؤں کے لوگ بڑے کمینے ہیں۔ ان سے بچ کر رہا کرنا...... ہاں۔“

”ایسی تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی صاحب..... ہاں سنا ہے کہ“...... رحمٰن کو کہتے کہتے رکنا پڑا۔ سبزی پتیلے پر چڑھی تھی۔ مرچ مصالحہ ڈالنا پڑا۔ جواب دینے میں مشغول ہو جاتا تو سبزی جل جاتی۔ پانی ڈالتے ہی تڑ تڑ کی آواز سارے کمرے میں گونج گئی۔ عبدالسلام بے صبر ہو کر جھنجلا اٹھا۔ یہاں تو اس کی جان پر بن آئی تھی۔ اور رحمٰن سبزی بنانے میں مشغول تھا۔ یکایک ایک عجیب سی ترغیب اس کے ذہن میں کوند گئی۔ لیکن پتیلے کی تڑ تڑ اُسے کچھ سوچنے کی مہلت تو دے۔ کہیں اس کا ذہن آوارہ تو نہ تھا......؟

رحمٰن نے پتیلے میں کڑچھی ہلائی تو پتیلا بج اٹھا اور عبدالسلام کا آوارہ ذہن ہوش میں آگیا۔ رحمٰن کہہ رہا تھا۔

”باہر سے کچھ ماہر کام کا جائزہ لینے آ رہے ہیں۔ افسر دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں۔ جسے دیکھو دوسروں کو ڈانٹتا پھرتا ہے۔ جان الجھن میں پھنس گئی ہے۔“

چاہے رحمٰن کی جان الجھن میں پھنس گئی تھی یا کسی اور کی لیکن رحمٰن کی وضاحت نے عبدالسلام کی الجھن دور کر دی اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا ذہن آوارہ نہیں ہے۔ بلکہ اچھی طرح سے کام کر رہا ہے۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے پچھلے واقعات

پر پھر سے سوچا۔ شاید کہیں کوئی موڑ ملے جس سے حالات کا رخ پلٹ گیا ہو۔ ضرور کہیں کوئی ایسا موڑ ہوگا ورنہ پھولی خاموش نہ رہتی۔ گاؤں والوں سے نہ کہتی پر اپنی ماں سے ضرور کہتی۔ ضرور کوئی وجہ ہے۔ یہ لوگ اتنے حساس نہیں۔ کہ بدنامی کے ڈر سے خاموش رہیں گے۔ کہیں پھولی کو اس سے کچھ ......... وہ سوچتے سوچتے رک گیا۔ اُسے یقین نہ آیا کتنی مضحکہ خیز سوچ تھی اس کی ......... اس نے ایک بار پھر بیتے واقعات کو ٹٹولنا شروع کیا۔ پھولی کا اُس سے دور دور رہنا......... اُس سے منہ چرانا......... پھولی کے بدن کی کپکپاہٹ ......... شرم کے مارے ......... پھولی بھولی لڑکی ہے نا...... شہری لڑکیوں کی طرح بے باک نہیں جو اپنی خواہش عیاں کر دے۔ اُسے چاہیے تھا ان اشاروں سے صحیح مطلب اخذ کر لیتا۔ اس کی اداؤں کا مطلب سمجھتا۔ یہی کیا کم ہے کہ پھولی نے کسی سے ذکر نہ کیا۔ ضرور پھولی کو اُس سے.........ارے نہیں......... ہو سکتا ہے۔ کوئی اور بات ہو دبے پاؤں لینے میں کیا حرج ہے۔ اُس کو ایک بار پھولی کا سامنا کرنا چاہیئے جب ایک بار اوکھلی میں سے سر صحیح سلامت باہر نکل آیا تو دوسری دفعہ سر اوکھلی میں ڈالنا خطرناک نہیں ہو سکتا......اُسے ضرور ایک بار پھولی کا سامنا کرنا چاہیئے...... ایک بار ضرور .........،

"سو گئے صاحب ........." رحمان نے اُسے جگایا۔ کھانا تیار

ہو گیا تھا۔ اور اسے خود بڑی سبکی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہیں تو ........ عبد السلام نے لیٹے لیٹے ہی جواب دیا۔

"تو کھانا کھا لو صاحب..... ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے"

رحمن نے کہا۔

"پروس لو بھئی ...... پروس لو..... عبد السلام نے چٹخارے لینے کے انداز میں کہا۔ لیکن اٹھ بیٹھنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس کا ذہن اس کمرے کی چار دیواری سے آزاد ڈل کے کنارے پھولی کے کنوارے جسم کو یاد کر کر کے لذت لے رہا تھا۔

_____ پھولی نے اس واقعے کا ماں سے کوئی ذکر نہ کیا۔ کرتی بھی تو کس ماں سے کرتی۔ ماں اب پہلی سی ماں نہ رہی تھی جو اسے دن دن بھر گود میں اٹھائے پھرا کرتی تھی۔ کانٹا چبھ جاتا تھا تو ہر دن پچکارا کرتی تھی۔ موقعہ بے موقعہ دل بہلایا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی غلطیوں پر اپنے آپ کو ہی گنہگار ٹھہراتی تھی۔ ماں تو بالکل بدل گئی تھی۔ وہ اس واقعہ کا ذکر ماں سے کرتی بھی تو جھیم جھنگھاڑ کے بغیر کچھ نہ ہوتا۔ اور سارے گاؤں میں بات پھیل جاتی۔ اس کا گھر سے باہر نکلنا دوبھر ہو جاتا اور گھر سے باہر نہ نکلے تو بھوکی مریں گے دونوں۔ ویسے اب اس دنیا میں تھا بھی کیا اس کے لئے۔ موت ہی بہتر تھی اس زندگی سے۔ پر بوڑھیا مرنے بھی دے اسے۔ بستر مرگ

سے واپس کھینچ لے گی تاکہ وہ کما سکے اور بوڑھیا کھا سکے۔ اس لئے سچولی نے اس واقعہ کا ذکر ماں سے نہ کیا۔

لیکن ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ وہ اپنے خون کو نہ پہچانے تو کون پہچانے! ورنہ دنیا کے جتنے رشتے ناطے ہیں ان کی تاریخ قلمبند نہ ہوتی۔ اور دنیا کی تاریخ ادھوری رہ جاتی۔ اس لئے جوں ہی بوڑھیا نے کچھولی کو آتے دیکھا تو کچھولی کی چال ڈھال میں اُسے فرق سا محسوس ہوا۔ کچھولی کے پیر سیدھے نہ پڑ رہے تھے۔ پوٹلی اٹھانے کا بھی انداز ایسا نہ تھا۔ جیسے روز ہوا کرتا تھا۔ سارا گاؤں جانتا تھا۔ کہ ان کے پاس سنگھاڑوں کا لائسنس نہیں اس لئے پوٹلی ہر حالت میں گاؤں کی ٹٹولتی نگاہوں سے چھپا کے لائی جاتی تھی۔ لیکن آج کچھولی پوٹلی کھلم کھلا لئے چلی آرہی تھی۔ اُسے معلوم تھا کچھولی نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ تب بھی نہیں جب کچھولی اُس سے لڑ پڑتی تھی۔ یا مار کھاتی تھی۔ پوٹلی میں سنگھاڑے ہوتے تھے۔ سنگھاڑے کو سکھا کر پیسا جاتا تھا۔ اور پسے ہوئے سنگھاڑوں سے موٹی موٹی روٹیاں بنائی جاتی تھیں۔ جو بھوک کے حلق میں ٹھونس دی جاتی تھیں۔ اور بھوک کچھ دیر کے لئے مر سی جاتی تھی۔ بوڑھیا کو بہت بھوک لگتی تھی۔ شاید زمانے بھر کی بھوک اس کی نس نس میں رچ گئی تھی۔ اس لئے جوں ہی کچھولی نزدیک پہنچ گئی۔ تو وہ برس پڑی۔

"کیا بات ہے..... کسی سے لڑ جھگڑ آئی ہو"

پھولی کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ بات کا کوئی جواب دے۔ بھلا کیا جواب دیتی۔ ذرا سی دیر میں تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ کچھ پرانی چیزیں مرکر اسے بے سہارا کر گئی تھیں۔ اور کچھ نئی چیزیں پیدا ہو کر اس کو خوفزدہ کر رہی تھیں جواب دے تو کیا جواب دے۔ لیکن جواب نہ دے تو بوڑھیا دن بھر اس کا ناطقہ بند کر دے۔

"کچھ نہیں ہوا اماں...... کچھ نہیں ہوا" پھولی نے جواب دیا اور پوٹلی بے نیازی سے بوڑھیا کے سامنے پھینک دی۔ لیکن بوڑھیا نے پیچھا نہ چھوڑا۔ پوٹلی یوں پھینک دینا بھی کچھ کم تنک آور بات نہ تھی۔ کچھ غرور ہو گیا ہے۔ دیکھ تو منہ کتنا اترا ہوا ہے" بوڑھیا نے ٹوکا۔

پھولی کے دل میں آیا کہ ماں کے سامنے پھوٹ پڑے۔ اب رو کے نہ جاتے تھے۔ جذبات کے دھارے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے دل کے کنارے دافع کی انتہا نہ ہوئی بلکہ ابتدا ہوئی۔ بھونچال کب کا رک گیا۔ لیکن سوکھے بدن میں لاوے کے ان گنت سوتوں کو جنم دے گیا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ سننا چاہتی تھی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ کھلتے کھلتے کملھا گئے۔ ماں سنگارے کی پوٹلی کو حریص نگاہوں سے ٹٹولنے میں مشغول تھی۔ پھولی کے بدن میں نفرت کی شدید لہر دوڑ گئی۔ اس نے منہ سکیڑ کر جواب دیا۔

"کانٹا چبھ گیا ماں...... کانٹا چبھ گیا" اور جب تک بوڑھیا کچھ کہے وہ دروازے کی دہلیز پار کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

—— پہلے دن پھولی نے کھانا نہ کھایا۔ کھاتی بھی کیوں

کر۔ سنگھاڑے کی روٹی کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں دلی کا
کنارہ ابھر آتا تھا۔ تاریک ذہن میں کسی بھیانک ناؤ کی نوک چبھ
جاتی۔ کسی کے کھردرے بے رحم ہاتھ اس کے جی کو ڈانواڈول
کرتا۔ ناخنوں کے تیز دھار پتے بدن میں چبھ چبھ جاتے۔ کبھی
نفرت کی آگ جلانے لگتی۔ اور کبھی بے نیازی کی برفیلی موجیں منجمد
کرتیں۔ آنکھوں سے بے بسی اور بے کسی کے دھارے رواں ہونے
لگتے اور وہ کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول کر آنسوں پونچھنے لگتی
اسے بھوک محسوس ہوتی۔ انتڑیوں میں بھوک ایک نئے درد کو
جنم دیتی۔ بدن تھکن سے جیسے ٹوٹ رہا ہو۔ سارا ماحول تھکا
تھکا سا محسوس ہوتا۔ اس کا جی چاہتا کہ اٹھ کر اپنے انگ انگ
کو جھنجھوڑ دے۔ تھکے ماحول کو توڑ جھوڑ دے۔ اور گرد گھیرا ڈال
ہوئی دیواروں کو نوچ دے۔ نوچ نوچ کر زخمی کر دے۔ دیواروں
جیسے خاموش لگا ہوں سے اس کی تضحیک کر رہی تھیں۔ ان کی بے
وقوفی پر ہنس رہی تھیں۔ شاید وہ واقعی بے وقوف تھی۔ بے وقوف
نہ ہوتی تو بھوکی کیوں رہتی۔ پیٹ میں بھوک نے تلاطم مچا رکھا
تھا۔ اور وہ تھی کہ زبردستی بھوک سے بے نیاز ایسے واقعات
کی سوچ میں سرگرداں تھی جنھوں نے اس کے بدن پر کوئی ایسی
چھاپ نہ ڈال دی تھی۔ جسکے سہارے اس اس الجھن میں سہارا ملتا
دن میں کئی بار بدن کو ٹٹول ٹٹول کر ...... ایک ایک انگ کو ٹٹول کر
وہ بے حال ہو چکی تھی۔ لیکن کچھ نتیجہ نہ برآمد ہوا تھا۔ رہتی کہ بعد جہد
کا کوئی نشان تک نہ ملا اور دن ضائع ہو گیا۔

—— دوسرے دن وہ اتنی مضمحل ہوگئی کہ ارادہ نہ ہونے کے باوجود وہ روٹی کھانے پر مجبور ہوگئی۔ روٹی شاید انہیں سنگھاڑوں سے بنی تھی جو وہ رومال پہ سے اٹھا لائی تھی۔ اُسے نفرت سی ہوئی۔ جی چاہا روٹی اٹھا کے کھڑکی میں سے باہر پھینک دے اور تھالی سامنے بیٹھی ماں کے منہ پر دے مارے جس کی زبان قینچی کی طرح اسے کاٹے جا رہی تھی۔

"میں پوچھتی ہوں حرامزادی تجھے ہو کیا گیا ہے۔ اچھی بھلی تو ہے۔ کھانا کھانا کیوں چھوڑ دیا۔ تُو سمجھتی ہے میں تمہارے چونچلوں سے ڈر جاؤں گی۔ میری جوتی کو بھی پرواہ۔ میرا کیا ہے۔ میں تو بھیک مانگ کر گزارہ کر لوں گی۔ لوگ تجھ پر ہی تھو کیں گے۔ تجھے پالا پوسا بڑا کیا۔ تیری خاطر دوسرا گھر نہ بسایا۔ کیا اسی لیے کہ تو بڑھاپے میں مجھے دُکھ دے۔ بولتی کیوں نہیں ......... بول ... جواب دے ....... سانپ سونگھ گیا ہے کیا"

بوڑھیا بکتی جا رہی تھی۔ اور وہ روٹی کھاتی جا رہی تھی۔ روٹی نہ کھاتی تو شاید بوڑھیا باتوں کے بجائے لاتوں سے کام لیتی اور اُس میں اپنے آپ کو بچانے کی بالکل سکت تھی۔ بوڑھیا کی ہڈیاں اس کی اپنی نرم نازک ہڈیوں سے کہیں زیادہ سخت تھیں۔ زمانے کی ٹھوکروں نے بوڑھیا کی ہڈیوں میں عجیب سی ہمدردی بھر دی تھی۔

—— روٹی کھلا کر بوڑھیا نے کوشش کی کہ بھولی اپنی کوٹھڑی سے نکل کر گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹائے۔ اس سال موسم کے آثار اچھے نہ تھے۔ گرمیوں کا موسم ہونے کے باوجود مہینے میں دس بارہ

بارش ہوئی تھی۔ لوگ ابھی سے قیاس آرائیاں کرنے لگے تھے۔ شاید فصل بے موقع بارش سے خراب ہو جائے اس لئے اناج کی قیمت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ لیکن گاؤں والوں کو اتنی الجھن نہ تھی جتنی پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس لئے کہ باڑھ آنے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ وُلر کے کنارے دو بڑے باندھ بنائے گئے تھے اور تیسرا باندھ بن رہا تھا۔ سرکار نے دریا کے پشت کنارے اونچے کرنے کا کام بھی شروع کیا تھا۔ نشیبی علاقوں سے پانی کے نکاس کے لئے بجلی کے بڑے بڑے پمپ بھی کہیں کہیں لگائے گئے تھے۔ جسے دیکھو مشغول نظر آتا تھا۔ افسر دن رات جیپوں اور گاڑیوں میں دوڑتے رہتے تھے۔ باڑھ کے خطرے سے نجات محسوس کر کے لوگوں میں بھی کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ اُن کی مرجھائی اُمیدوں پر ہریالی آنے لگی تھی۔ برسوں چھوڑے ویران کھیت پھر سے انسان کی جد وجہد کا مرکز بنا رہے تھے۔ روپے پیسے کی ضرورت پڑی تو کچھ ساہوکاروں نے بھی سر اُبھارنا شروع کیا۔ زمینوں کی نئی حد بندی نے پٹواریوں کی قیمت کئی گنا بڑھا دی۔ آپس میں تنازع جنم لینے لگے۔ ایک آدھ خون بھی ہوا۔ سونہ واری میں زندگی بہار کی آمد کا شور سُن کر ہڑبڑا کر جاگ رہی تھی۔

پھولی کی ماں کے پاس کھیت نہیں تھے صرف مکان کے سامنے وسیع آنگن تھا۔ جو برسوں کی گندگی تلے سکڑ سا گیا تھا۔ گندگی کے ڈھیر جا بجا مہیب پتھروں کی طرح سائے

آنگن میں بکھرے پڑے تھے۔ جیسے آنگن نہ ہو کوڑھ کا کوئی مریض ہو۔ بوڑھیا کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ آنگن کو صاف کر کے چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بدل دے۔ اناج نہ سہی کچھ پھل سبزی تو اُگ آئے گی۔ بوڑھیا کے دل میں جوش تھا۔ ولولہ تھا۔ لیکن بدن میں سکت نہ تھی۔ دو قدم چلنے سے کمر میں درد ہونے لگتا اب تو اُس کے مرنے کے دن تھے۔ پھاوڑا اٹھانا تو درکنار سہارے کے لئے لکڑی تھامنے کو جی چاہتا تھا۔ کبھی گر گئی تو اُٹھنا مشکل ہو گا۔ لیکن بدن کی کمزوری کے باوجود لکڑی تھامنا اُسے منظور نہ تھا۔ پھولی ابھی سے خودسر ہوتی جا رہی تھی۔ ماں کو ناکارہ جان کر ہاتھ سے بالکل نکل جائے گی۔ کاش.... پھولی کچھ کام کرے نہ معلوم کیا ہو گیا ہے۔ حرامزادی کو.... بوڑھیا کو غصہ آ گیا اور وہ پھر کمرے میں چڑھ دوڑی۔

——— کمرے میں پھولی بے سُدھ گھاس کے ڈھیر پر لیٹی سو رہی تھی۔ بال پریشان، گھاس کے تنکوں میں اُلجھے پڑے تھے۔ فرن ٹانگوں سے بے پرواہ رانوں تک چڑھ آیا تھا۔ شلوار ٹانگوں پر پردہ کرنے کے بجائے کھڑکی پر پڑی تھی۔ کھڑکی میں سے دھوپ ٹانگوں پر پھیل گئی تھی۔ اور پھولی کی بے داغ ٹانگوں کو چاندی کی چمک بخش رہی تھی۔ بوڑھیا رُک گئی۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا کہ سامنے پڑی لڑکی اُس کی بیٹی ہو سکتی ہے اُس کی اپنی کوکھ سے نکل آئی ہے۔ جب کبھی اس نے پھولی کو دیکھا تو کیچڑ سے اٹی لتھڑی گندی سی ایک سوکھی سی لڑکی کو دیکھ پائی جو اُس کی بیٹی کم تھی۔

اور کام کرنے کی مشین زیادہ لیکن آج پھولی کو بے حجابانہ سویا پڑا دیکھ کر اُسے اپنا بچپن یاد آیا۔ اپنے سپنے یاد آئے۔ شاید وہ بھی یوں ہی بچپن میں بے فکر سوجایا کرتی تھی۔ یاد کر کے اُس کے دِل میں اِک ہوک سی اٹھی۔ اُس نے پھولی کو جگانا چاہا۔ پھولی کے سینے کے زیر و بم میں اُسے اپنا ماضی رقصاں نظر آ رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر اُن رنگینیوں میں کھو جانا چاہتی تھی جو وہ کئی برس پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ کاش ........ وقت آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کو لوٹ پڑے۔ تو شاید پھولی پھر سے ننھی منی گڑیا میں تبدیل ہو جائے۔ تب شاید اُسے احساس نہ ہوگا۔ کہ پھولی بڑی ہو گئی ہے۔ اور ماں کے ناطے اُسے اپنی بیٹی کی شادی کی فکر کرنی چاہیئے۔ بیٹی کے لئے بر ڈھونڈنا چاہیئے۔ جہیز کا انتظام کرنا چاہیئے۔ سہاگ کا جوڑا...... کانوں کی بالیاں ...... کلائیوں کے لئے کڑے.. ...... برات کے لئے دعوت کا سامان بھی میسر کرنا ہوگا گاؤں والوں کا قرضہ بھی اتارنا ہے۔ کئی دفعہ اُس نے گاؤں والوں کی شادیوں، بیاہوں میں شرکت کی تھی کوئی کب تک دوسروں کا کھاتا پھرے ........ آخر اُس کو گاؤں بھر کو منہ دِکھانا تھا۔ کچھ دور کے رشتہ دار بھی آس لگائے بیٹھے ہوں گے۔ کیا معلوم کوئی زندہ ہے بھی۔ کسی نے خاوند کے مرنے کے بعد سدھ ہی نہیں لی۔ مدد کرنی تو درکنار ........

پھولی نے کروٹ بدل دی، اور بوڑھیا کی سوچ نے بھی کروٹ بدل دی، وہ... جھنجھلا اٹھی۔ پگلا۔ اکیلی بھکارن کیا کرسکے گی۔ کہاں سے زیور کپڑے لائے گی۔ براتیوں کے لئے اناج پیدا کرے گی۔ خود تو دانے دانے کو محتاج تھی۔ کاش پھولی مرجائے یا وہ خود مرجائے۔ تو اس کے بہت سارے دکھ کم ہو جائیں... کاش.. کمرے کے وسط میں کھڑے کھڑے اس کو پھولی کے بڑھتے ہوئے جسم سے نفرت سی ہوگئی۔ یہ پھولی کا جسم نہ تھا۔ پتھر کی ایک بڑی بھاری سِل تھی۔ جو اس کے وجود کا کچومر نکالنے پر تلی تھی۔

وہ آگے بڑھی اور بے دردی سے پھولی کو جھنجھوڑنے لگی۔

"اُٹھتی ہے کہ دوں ایک جھاپڑ... کانٹا کیا چبھ گیا ہے جیسے لقوہ چاٹ گیا ہے۔ بہانے کرتی ہے۔ چل اُٹھ۔"

پھولی گھبرا کر جاگ پڑی "نہیں مارو... میری طبیعت ٹھیک نہیں" پھولی کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے۔

"کیا ہو گیا ہے طبیعت کو۔ اچھی بھلی تو ہے، نہ بخار نہ کچھ۔ آخر بات کیا ہے" آنسو دیکھ کر بڑھیا ذرا پسیج گئی۔

"میرا کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ نہ معلوم ماں کیا ہو گیا ہے مجھے۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا" پھولی نے بےبسی سے کہا۔ اور بڑھیا کے دل پر ایک اور چرکا لگا۔ واقعی پھولی بڑی ہو گئی تھی۔ اس کی شادی ضرور کرنی چاہئے۔ چاہے پھولی کو بیچنا پڑے یا اپنے آپ کو۔ وہ کتنا ہی روکے پھولی کو۔ لیکن زندگی

کہیں رک سکتی ہے۔ جو اس کے روکے رُکے گی۔ خود بھی تو اُس
کی حالت شادی سے پہلے ایسی ہو جایا کرتی تھی۔ برسوں پہلے..
"بیٹی۔ ایسے کام تو نہیں چلے گا۔ جب تک مجھ میں سکت
تھی میں نے گھر چلایا۔ اب ان بوڑھی ہڈیوں میں طاقت نہیں جو
کما سکوں۔ اب تو تم ہی پر سب بوجھ آپڑا ہے۔ چاہے اپنی ماں
کو مار چاہے رکھ لے۔ تمھارے بغیر اس دنیا میں میرا کون ہے۔"
اور بوڑھیا کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگے۔ آج بہت
دن بعد اُسے اپنا خاوند یاد آیا۔

پھولو نے بڑھیا کو کئی بار روتے دیکھا تھا۔ جب
کبھی بوڑھیا اُس سے اُلجھتی تو جھگڑے کی آخری حد بوڑھیا کچھ آنسو
بہا کر ہی پوری کر دیتی تھی۔ لیکن اس رونے میں رونا کم ہوتا تھا
اور غصہ زیادہ۔ پر آج بڑھیا کے آنسوؤں میں غصہ نہ تھا۔ نفرت
نہ تھی بلکہ زندگی بھر کی تلخی انڈی چلی آ رہی تھی۔ اُس کی آہ و
زاری میں بے بسی تھی۔ بے کسی تھی۔ پھولو پر اس تبدیلی کا بہت اثر
ہوا۔ وہ سوچنے لگی کہ اُس کی ماں کا کوئی قصور نہیں کہ وہ بھوک
سے نڈھال ہو کر چیختی ہے۔ سردی گرمی محسوس کر کے چلاتی ہے
ماں کو وقت پر کھانا ملے۔ وہ گرمی سردی سے بچی رہے
تو ماں کبھی جھگڑا نہیں کرے گی۔ کوئی وجہ نہ ہو گی جھگڑنے کی
واقعی یہ اُس کی زیادتی تھی۔ جو وہ سارے الزام ماں کے سر تھوپ
رہی تھی۔ وہ کام کرنا چھوڑ دے گی تو یہی ہو گا کہ ماں مر جائے
گی۔ ماں کے مرنے سے مشکلیں گھٹنے سے تو رہیں۔ خود اُس کا اپنا پیٹ

تھا۔ اپنی بھوک تھی۔ اپنے آپ کو تو نہیں مار سکتی۔ مرنا ہوتا
تو وہ دریا کے کنارے ہی مرگئی ہوتی۔ وقت کے دھارے
پر بند ھ باندھنا مشکل تھا۔ اسے چاہیئے رونا دھونا بھول جائے
وہ دلہر جائے اور سنگھارے اکٹھے کرنا شروع کر دے۔ سردیاں
سر پر آرہی تھیں۔ گھر میں کچھ ہوگا نہیں۔ تو بھوک سے ایڑیاں
رگڑ رگڑ کر مرنا ہوگا۔ اور وہ ابھی مرنا نہ چاہتی تھی۔

—— وہ آگے کو جھکی اور ماں کی آنکھوں سے آنسو
پونچھنے لگی۔ ماں نے فرط محبت سے اُسے گلے لگایا۔ اور وہ
بھی ماں کی گود میں منھ چھپا کے رونے لگی ... زار وقطار
رونے لگی۔ کبھی کبھی بے سہارا ہونے کی بجائے گرم عورت
کو دوسرے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔

____ عبدالسلام منھ اندھیرے میں جاگ پڑا۔ سرہانے رکھی ماچس کی ڈبیا کو ٹٹولا اور تیلی جلائی۔ تیز روشنی میں اس کی بے خواب آنکھیں بھیگ سی اٹھیں۔ ٹمٹاتی روشنی میں رحمان دکھائی دیا اور وہ بے تحاشہ ہنس پڑا۔ رحمان کے سونے کا ڈھنگ عجیب تھا۔ ایک ٹانگ کہیں تھی اور دوسری کہیں۔ ایک ہاتھ میں سر کے بال جکڑے ہوئے تھے اور دوسرا ہاتھ ننگے پیٹ پر اوندھا پڑا تھا۔ شاید منھ بھی کھلا ہوا تھا۔ عبدالسلام اچھی طرح سے نہ دیکھ پایا۔ دیاسلائی بجھ گئی اور کمرہ پھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ پر ابکے عبدالسلام کو اندھیرے سے کچھ ڈر نہ لگا۔ رات بھر جو تناؤ اس کے انگ انگ میں رچ گیا تھا۔ وہ رحمان کے قرب کو محسوس کرکے ٹوٹنے لگا۔ پر آنکھوں کی جلن بدستور قائم رہی۔ وہ تمام رات پل بھر نہ سو سکا تھا۔

عجیب عجیب سے سپنے رات اس کی آنکھوں میں مچلتی نیند کا پیچھا کرتے رہے۔ عجیب سے سپنے دیکھے اس نے کبھی گاؤں

ڈالیے اسے مارنے کو چڑھ دوڑتے ۔ اور بھولی اس کو پھرن کے دامن میں چھپائے پھرتی ۔ کبھی ڈل کی تاریک گہرائیاں پکڑنے لگتیں اور بھولی اُسے اپنی زلفوں کے جال میں پھنسا کر تڑپتی مچھلی کی طرح کنارے پھینک دیتی ۔

—— لحاف ہٹا کر وہ آہستہ سے اٹھا ۔ آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا ۔ آسمان پر تارے ابھی ٹمٹما رہے تھے ۔ ہوا نم تھی اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی ۔ حتیٰ کہ درختوں کے پتوں میں بھی حرکت نہ تھی ۔ کہیں دور کوئی کتا بھونک رہا تھا ۔ لیکن خاموش فضا میں کتے کی آواز بھی کوئی ارتعاش پیدا نہ کر رہی تھی ۔ ساری کائنات پر سکون کی چادر مسلط تھی ۔ جس کی پرچھائیاں اُس کے اپنے ذہن میں بھی سکون پھیلانے لگیں ۔ گاؤں سے دور ہوتے ہوئے اُس نے بید کی ایک ٹہنی توڑ لی ۔ بہت دنوں بعد تازہ مسواک کرنے کو ملا تھی ۔

—— جوں جوں ڈل قریب آتا گیا اُس کے ذہن کا سکون برہم ہونے لگا ۔ جی تو بہت کرتا تھا کہ واپس لوٹ پڑے ۔ ایک دفعہ انجانے میں اُس نے غلطی کی تھی ۔ شاید اُس دن وہ جذبات سے اندھا ہو گیا تھا ۔ لیکن آج وہ جذبات سے عاری پھر وہی غلطی دہرانے جا رہا تھا ۔ اُسے بھولی کے سن کا خیال کرنا چاہیے ۔ چودہ پندرہ برس کی معصوم کلی اور وہ خود ادھیڑ عمر کا آدمی ۔ تین بچوں کا باپ ..... عمر میں دوگنا فرق تھا ۔ کنپٹیوں کے گرد تو بال بھی سفید ہونے لگے تھے ۔ ویسے اُسے حق بھی کیا ہے بیوی بچے ہوتے ہوئے کسی دوسری لڑکی

سے پینگیں بڑھانے کا۔ بیوی بھی کسی اور سے پینگیں بڑھا دے تو کیا
ہو۔ وہ شاید بیوی کا سر پھوڑ دے گا۔ وہ یقیناً بیوی سے دھوکہ کر رہا
ہے۔ ابھی کچھ زیادہ نہ بگڑا تھا۔ اسے چاہئے اپنے قدم واپس موڑے
.... قدم واپس موڑے .... واپس موڑے .... لیکن قدم واپس
نہ مڑے۔ شاید بیوی پاس نہ ہونے کی وجہ سے کسی کشش
کا موجب نہ بنایا شاید وہ پارسا نہ بننا چاہتا تھا۔ پارسا
بن جائے تو بھوکوں مرے۔ چوری کرنا گناہ تھا۔ اور دھوکہ دینا
بھی۔ وہ ان گناہوں کا مرتکب دن میں کئی بار ہوتا تھا۔ سبھی ہوتے
رہتے ہیں حتیٰ کہ اس کے دفتر کا اکونٹنٹ بھی جس کی داڑھی کسی پیر
فقیر سے کم نہ تھی۔ اور جو پانچوں وقت نماز پابندی سے ادا کرتا تھا
ہوں ...... پرہیزگاری کرے تو بیوی بچوں سمیت بھوکوں نہ مرے۔ مہینے
کے پچاس روپے پگار میں کس کس کا پیٹ بھرے۔

عبدالسلام اپنی کشمکش میں غلطاں پیچاں اندھا دھند
آگے بڑھتا جا رہا تھا لیکن اس کا لاشعور اس کے بدن کو اردگرد
پھیلی جھاڑیوں اور درختوں کے سہارے ولر کے گرد بچھی لاانتہا
پگڈنڈیوں کو چھوڑ اسی پگڈنڈی پر لئے جا رہا تھا۔ جس کی حد اس کے
خیالات کی معراج تھی۔ لیکن وہاں پہنچ کر جو بھی سارا ماحول اس پر
عیاں ہو گیا۔ وہ بوکھلا سا گیا۔ آج اس پر واضح ہو گیا کہ اس دن کسی نے بھولی
کی چیخ و پکار سن پائی ہوتی تو اس کا یہ موٹا تازہ جسم ولر کی مچھلیوں
کی خوراک بن گیا ہوتا۔ یہ احساس ہوتے ہی اس کی نگاہیں چاروں طرف
اس انداز سے گھومنے لگیں جیسے سارا گاؤں سرکنڈوں کے پیچھے تاک لگائے

بیٹھا ہو۔ سرکنڈوں کے جھنڈ پریشان تھے اور ایک گھنے جھنڈ
کے پاس رومال پڑا تھا۔ رومال اُسی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔
جیسے وہ خود پھیلا گیا تھا۔ لیکن سنگھاڑوں کا نام نشان نہ تھا
رومال کا رنگ دھوپ اور بارش نے گڈمڈ کر دیا تھا۔ اکڑ کر
وہ کورے کاغذ کی طرح کرکرا ہو گیا تھا۔ اُسے تشویش سی ہوئی۔
شاید بھولی نے رومال کو چھوا بھی نہ تھا۔ چھوا نہیں تو سنگھاڑے
گئے کہاں۔ چرند پرند کھا جاتے تو رومال اسی حالت میں نہ پڑا
رہتا۔ گلنے سڑنے کا تو سوال ہی نہیں۔ سنگھاڑے برسوں گل
سڑ نہ جاتے تھے۔ اور سنگھاڑے بھولی لے گئی۔ تو رومال کیوں چھوڑ
گئی۔ اُس کی جان شبہے میں پھنس گئی۔ جیسے کہ وہ رومال اٹھانا بھی
بھول گیا۔

——— یکایک وہ چونک پڑا۔ نرکلوں میں سرسراہٹ
سی ہو رہی تھی۔ شاید پاؤں کی چاپ بھی آ رہی تھی۔ کوئی آ رہا تھا۔
اُسے منھ اندھیرے یہاں دیکھ لیا تو ...... گھبراہٹ میں وہ اتنا بھی
نہ سوچ سکا کہ جو کوئی اُسے یہاں دیکھ لے گا تو سمجھ لیگا۔ رکھوالی
کا گارڈ قانون کی حفاظت کر رہا ہے۔ دل میں چھپے چور نے اُسے سوچنے
کی مہلت ہی نہ دی۔ اُس نے پلک جھپکتے ہی جست لگائی اور نرکلوں کے
گھنے جھنڈ کو چیرتا سلتا چھپ گیا۔ تیزی میں نرکلوں کی چبھن بھی محسوس
نہ ہوئی بلکہ اپنے آپ کو جلدی سے سنبھال کر اُس نے نرکلوں کی درز میں سے
پگڈنڈی پر نگاہیں جما دیں۔ چاپ کی آواز بڑھتی جا رہی تھی یا شاید دل
کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی وہ فیصلہ نہ کر سکا۔ چاپ کی آواز دھیمی پڑ گئی اس

کے دل کی دھڑکن دھیمی ہوگئی۔ چاپ بڑھنے لگی اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سانس روکے منتظر رہا۔

—— سامنے پگڈنڈی پر چھوٹی ہچکچاتی...... گھبراتی چلی آرہی تھی۔ چلنے کے انداز میں ٹھٹھک سے زیادہ خوف عیاں تھا۔ وہ رومال کے پاس آکر رک گئی اور عبدالسلام کے سینے میں امید انگڑائیاں لینے لگی۔ چھوٹی نے ادھر دیکھا۔۔۔ اُدھر دیکھا۔ جیسے کسی کے دیکھنے کا ڈر ہو۔ عبدالسلام نے اپنے بدن کو سکیڑ لیا۔ چھوٹی نے کلپتے ہوئے ہاتھوں سے رومال اٹھایا۔ رومال کاغذ کے ورق کی طرح اکڑا رہا۔ عبدالسلام کا دل بلیوں اچھل گیا۔ غرور کی ایک تند لہر اُس کے بدن کو چھو گئی۔ وہ محکمہ سنگھاڑے کا نامی گارڈ تھا اُس کے سامنے ماہی گیر تھر تھر بید کی طرح کانپا کرتے تھے۔ اس نے بڑے بڑے مجرم گرفتار کئے تھے۔ اس کا ہر لفظ قانون ہوا کرتا تھا۔ ایسا شخص غلط اندازہ نہیں لگا سکتا۔ چھوٹی اُس کی شخصیت سے واقعی مرعوب ہوگئی ہے اُس کے جال میں اُلجھ گئی ہے۔ اُس کی ہو چکی ہے اب مزید رکنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ نرکلوں کی جھجھن واضح ہو رہی تھی۔ وہ بے دھڑک کھڑا ہوگیا۔

—— چھوٹی کسی کو یکایک سامنے پاکر بوکھلا گئی۔ ہاتھ بے اختیار رومال کو چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔ جیسے رومال نہ ہو۔ بلکہ اُس کی زندگی کی کتاب کا کوئی اہم ورق ہو۔ عبدالسلام کے خد و خال پہچانتے ہی وہ شرم کے مارے دوہری ہوگئی۔ چیخ حلق میں اٹکی پھنسی رہی۔ چہرہ جلنے لگا اور ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ وہ اکڑوں بیٹھنے پر مجبور ہوگئی سر خود بخود گھٹنوں پر گرتا چلا گیا۔

—— عبدالسلام احتیاط سے نرکلوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ پھولی کو دیکھ کر اُس کی خواہش بُری طرح جاگ اٹھی تھی۔ جی چاہ رہا تھا، دوڑ کر جائے اور پھولی کو گود میں اٹھا کر بھینچ لے۔

—— پھولی منھ چھپائے گٹھڑی کی طرح سکڑ گئی تھی۔ جھکے سر کی وجہ سے گردن کا دودھیا رنگ صاف عیاں تھا اور عبدالسلام کو ترغیب دے رہا تھا۔ وہ قدم بڑھا کر پھولی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"پھولی — مجھے معاف کر دو۔ معاف کر دو پھولی۔ میں نے تم سے زیادتی کی۔ معاف کر دو مجھے۔"

آواز دھیمی رکھنے میں عبدالسلام کو کافی جد و جہد کرنی پڑ رہی تھی۔ جذبات امڈ نے کو مچل رہے تھے۔ لیکن وہ پھولی کو بھڑکانا نہ چاہتا تھا۔ ایک دفعہ وہ پھولی کی زندگی میں پنہاں سرکش زندگی سے دوچار ہوا تھا اور پھولی .... ایک سوکھی لڑکی کو سر کرنے میں اُس کا اِتنا لمبا چوڑا جسم چُور چُور ہو گیا تھا۔

—— پھولی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ عبدالسلام یوں پیش آ سکتا ہے۔ وہ تو اُسے درندے سے بدتر سمجھی بیٹھی تھی۔ جس نے اُسے بے رحمی سے کچل دیا تھا۔ اُس کی امنگوں کو مسل دیا تھا اُس کے وجود کو لہو لہان کر دیا تھا۔ وہ بے طرح گھبرا رہی تھی۔ آج وہ ایک بار پھر اُس درندے کے جنگل میں تھی۔ نہ معلوم اب کے کیا حشر ہو۔ ماں کے رونے دھونے نے اور بے درد زمانے نے اُسے پھر سنگھاڑے اِکٹھے کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اُسے اِس جگہ نہ آنا چاہیئے تھا۔ کیا ضرورت تھی اِس جگہ آنے کی۔ اِس جگہ تو وہ لوٹ لی گئی تھی۔ اب خود دوبارہ

لٹنے کو آئی۔ پھر اُسے ڈرنا نہ چاہیے۔ ملکہ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو رکھنا چاہیے۔ عبدالسلام کا رویہ بوکھلاہٹ کے لیئے کافی تھا۔ کہیں عبدالسلام اُسے چوہیا سمجھ کر بلی کی طرح تو نہیں کھلا رہا ہے۔ سر اُٹھا کر اپنی تسلّی کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ لیکن سر اُٹھے کیسے۔ شرم کے مارے دب سا گیا تھا سر......

کوئی کشمکش نہ دیکھ کر عبدالسلام کا دل بڑھ گیا اُس نے آہستہ سے پھولی کو چھوا۔

"واقعی میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کردو پھولی۔ مجھے معاف کردو"۔

—— پھولی کو عبدالسلام کی فریاد ہی عجیب سی لگی۔ کہاں وہ عبدالسلام جس نے تھپڑ مار مار کر اُس کو بے حال کر دیا تھا۔ اور کہاں یہ عبدالسلام جو اُس سے معافی مانگ رہا تھا۔ پھولی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ عبدالسلام کے ہاتھ اُس کی پیٹھ سہلا رہے تھے۔ لیکن آج اِن ہاتھوں میں کوئی سختی نہ تھی یا شاید وہ اِن ہاتھوں کے لمس سے بے خبر تھی۔ سارا ذہن تو عبدالسلام کے منھ سے نکلتے الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھ رہا تھا۔ عبدالسلام کی زبان بدستور الفاظ کو اُگل رہی تھی۔

"پھولی تم جو سزا دو گی مجھے منظور ہے۔ میں نے غلطی کی۔ گناہ کیا۔ بہت بڑا گناہ۔ تم مجھے سزا دو یا معاف کردو۔ تمہاری مرضی"!

—— پھولی جواب دینے سے قاصر رہی۔ گناہ کا لفظ عبدالسلام کے منھ سے بار بار سُن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ عبدالسلام کی دست درازی کا

گو اُس نے کبھی گناہ کے معنی نہ پہنائے تھے۔ عبدالسلام کی زیادتی گناہ ہوتی تو آسمان نہ ٹوٹ پڑتا۔ زمین نہ پھٹ جاتی۔ بھونچال، آندھی، طوفان نہ آتے۔ نہ بھی آتے تو کم سے کم اُسے خود تو کچھ محسوس ہوتا۔ کہیں اُس کا اپنا دل تو گناہگار نہیں۔ جو وہ عبدالسلام کی زیادتی کو گناہ کے معنی نہ پہنا سکی۔ کہیں اُس کی تخلیق ہی تو فطرت کا گناہ نہیں۔ ورنہ عبدالسلام یوں بار بار گناہ کا لفظ نہ دہراتا۔ شاید مرد گناہ نہیں۔ اور عورت گناہ ہے۔ تبھی شاید ماں اُس پر کڑی نظر رکھتی ہے عجیب سی بات ہے۔ عورت گناہ ہے اور وہ عورت ہے۔ کیا ضرورت تھی اسے پیدا ہونے کی؟ کوئی ضرورت نہ تھی۔ اُسے رونا آگیا۔

پھولی کے رونے نے عبدالسلام کو حیرت میں ڈال دیا وہ تو ڈر رہا تھا کہ پھولی شاید بپھر کر اُس کا منہ نوچ لے گی۔ چیخ چیخ کر دُنیا کو اکٹھا کر کے اُس کے کرتوتوں کا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ لیکن پھولی کے غیر متوقع طرزِ عمل نے اُس کے سارے ڈر دور کر دیئے۔ پھولی کچھ دیر رو لے تو شاید رنجش آنسوؤں میں بن کر بہہ نکلے۔ پھر وہ آسانی سے اُس پر قابو پا سکے گا۔ گنوارن جو ٹھہری۔ بھولی بھالی۔ موقعہ نازک تھا اُسے جلد بازی نہ کرنی چاہیئے۔ بلکہ احتیاط سے آگے قدم بڑھانا چاہیئے۔ پھولی کے دل میں اُس کے تئیں رحم اُبھر گیا تو سمجھو کام ہو گیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر پھولی کے پاؤں پکڑ لئے اور آواز میں بے انتہا رقت پیدا کر لی۔

"پھولی تمہیں میری قسم نہ رو ۔ ۔ ۔ نہ رو پھولی ۔ ۔ ۔ مجھ سے تمہارا رونا سہا نہیں جاتا۔"

وہ عبدالسلام کے یوں پاؤں پکڑنے سے گھبرا سی گئی۔ پاؤں پکڑنے کے بہت سارے مطلب تھے۔ لیکن عبدالسلام کے لہجے نے اُسے سہارا دیا۔ بہت درد تھا عبدالسلام کی آواز میں پھولی کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ ایک اپنی ماں تھی۔ جو اُسے گھنٹوں روتا دیکھ کر کبھی پسیج نہ جاتی تھی۔ اور ایک یہ عبدالسلام تھا جو اس کا ذرا سا رونا بھی نہ سہہ سکا۔ آج پہلی بار کسی کو اپنے متعلق متفکر محسوس کر کے اُسے عجیب لذت کا احساس ہونے لگا۔ دل میں جتنی کچھ کدورت تھی وہ دھل گئی۔ جی چاہنے لگا۔ عبدالسلام پاؤں پکڑنے کے بجائے اُسے پکڑ کر گلے سے لگاتے۔ بھینچ بھینچ کر پیار کرے۔ یہاں تک کہ اُس کی ہڈیاں چٹخ جائیں اور جسم میں بچے تناؤ کے پرخچے اڑ جائیں۔ جس تناؤ کو عبدالسلام نے اِسی جگہ جنم دیا تھا۔ اور جس تناؤ نے تب سے اُس کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔

——— پھولی کا بدن ڈھیلا پڑتے دیکھ کر عبدالسلام نے اپنی کوشش تیز کر دی۔ پیر چھوڑ کر اُس نے پھولی کے چہرے سے بازو ہٹانے شروع کئے۔ زبان بدستور چل رہی تھی۔ حتےٰ کہ ہانپتے کرتے کرتے گلا سوکھ گیا۔ لیکن اُس نے رکنے کی جرات نہ کی۔ ستانے کے لئے رُک جائے تو شاید پھولی کا ذہن پھر سے بدھک جائے۔

——— پھولی کا سر جھکا تھا۔ اُس نے گدگدی شروع کر دی۔ پھولی کی آنکھوں میں آنسو سوکھ گئے۔ گدگدی تیز ہونے لگی اور اُس کے منہ پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ سارا وجود وفور جذبات سے ڈانواڈول ہونے لگا اور جب عبدالسلام نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ تو وہ شرم اور خوشی کی لہروں میں بری طرح سے جھکولے کھانے لگی حتیٰ کہ عبدالسلام کے چوڑے چکلے سینے پر سینے پر مجبور ہو گئی۔

رحمان جاگ پڑا تو عبدالسلام کو کمرے میں موجود نہ پایا۔ ———

عبدالسلام شاید مُنہ ہاتھ دھونے گیا تھا۔ رحمان اُٹھا کہ اُس کی واپسی تک چائے تیار کرے۔ عبدالسلام کو وہ ہر حال میں خوش رکھنا چاہتا تھا تاکہ اُسے کچھ اور دِنوں کا آسرا ملے۔ عبدالسلام کے تھیلے سے کچھ نانبائی کی روٹیاں بھی برآمد ہوئیں۔ اُس نے ایک روٹی کا کنارہ توڑ کر منہ میں ڈالا۔ روٹی بہت میٹھی لگی۔ بہت دن ہو گئے تھے اُسے شہر کے نانبائیوں کی بنی روٹی چکھے ہوئے۔ اِس گاؤں کے نانبائی تو چور تھے۔ نہ معلوم کیا الا بلا ملا دیتے تھے آٹے میں اُس نے اندازہ لگایا اور اُس کو یقین نہ آیا۔ صرف پندرہ دِن ہو گئے تھے یہاں آئے اور لگتا تھا جیسے شہر سے آئے ہوئے پندرہ مہینے ہو گئے ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ اُٹھ کے شہر واپس چلا جائے۔ نئی نئی فلمیں، یار دوستوں کی گپ شپ، بازار کی چہل پہل ....... اِن چیزوں کے لیے اُس کا جی ترس رہا تھا اب کے موقعہ ملا تو وہ سرینگر ضرور جائے گا۔ باپ کا مُنہ دیکھے

جیسے صدیاں گزر گیئں تھیں، کیا معلوم باپ اُس کے بغیر کتنا اور بوڑھا ہو چلا ہو گا، مزدوری ملتے ہی وہ باپ کے لئے ایک اچھی سی ٹوپی بھی خریدے گا، خرید و فروخت کا سوال اُٹھتے ہی اُس کا ذہن کئی نازک خیالوں میں اُلجھ گیا، کرنالی کی لڑکی سے اُس کی شادی طے ہونے جا رہی تھی، اُس کے باپ نے بیٹے کی شادی کے لیئے بہت سارا سامان اکٹھا کیا تھا۔ اب کے جو وہ جائے گا شہر تو کچھ نہ کچھ اپنی ہونے والی بیوی کے لیئے بھی خریدے گا، کوئی خوبصورت سا رومال یا خوشبودار تیل کی بوتل ......... ضرور کچھ لے جائے گا، سسر کے دل میں عزت بڑھ جائے گی۔

انہیں خیالات میں مست اُس کو وقت کا کوئی حساب نہ رہا، نہ ہی عبدالسلام کی غیر موجودگی کا کوئی خیال رہا۔ وہ مزے مزے سے کھانا بناتا رہا، حتیٰ کہ خود چائے پینی بھی بھول گیا، کھانا بن چکا تو اُسے چولہے کی گرمی بڑی محسوس ہوئی۔ اُس نے کھڑکی کھول لی، سورج کافی اُوپر چڑھ آیا تھا، کرنیں روشندان تک پہنچ گئی تھیں، تب اُسے احساس ہوا کہ عبدالسلام کمرے میں نہیں ہے، اور اُس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ انتظار کرے، چائے پینی بھی دشوار تھی، جلدی سے اپنا کھانا پوٹلی میں باندھ کر وہ گھر سے باہر نکل آیا، کام کی جگہ پہنچنے تک اُس نے تقریباً ڈیڑھ میل راستہ ناپنا تھا، دوڑ لگائے تو وقت پر پہنچ جائے گا شاید .........

لگنی کے ٹکڑے پر اُسے عبدالسلام ملا۔ رحمان نے جلدی میں مکان کی چابی تھما دی تو عبدالسلام نے پوچھا۔

"یوں بھاگے کہاں جا رہے ہو......"

"صاحب کام پر جانا ہے۔ دیر ہوگئی ہے۔ کھانا بنا لیا ہے اور چائے بھی بنا رکھی ہے۔ ہاں..... گرم کرنی پڑے گی۔"

"کوئی بات نہیں......... میں گرم کر لوں گا...... تم نے چائے تو پی لی"

"نہیں صاحب..... بھلا آپ کے بغیر چائے کیسے پی لیتا......" رحمان نے برخورداری ظاہر کی۔ کسی طور عبدالسلام کو خوش رکھنا تھا۔

"ارے بھئی چائے پی لی ہوتی۔ انتظار ناحق کیا۔ میں ذرا اپنے علاقے کو جانچ رہا تھا" عبدالسلام خواہ مخواہ ہنس پڑا۔

"کوئی بات نہیں صاحب...... آج نہ سہی تو کل سہی...... کام پر جانے میں دیر ہو رہی ہے" رحمان بے صبر ہو گیا۔

"ہاں..... ہاں جاؤ......" رحمان جانے لگا تو عبدالسلام نے دو روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر اُسے پکڑا دیا۔ "دیکھو...... رات کو آتے وقت آدھ سیر گوشت لیتے آنا.... اچھا گوشت خرید لانا"

رحمان کا دل جھوم اٹھا۔ مدتیں ہو گئی تھیں گوشت کھائے ہوئے۔ عبدالسلام کی دریا دلی کے مقابلے میں اُس نے نیکی جتائی۔

"فسٹ کلاس گوشت لے آؤں گا صاحب......... اجری کے بغیر......... ہمارے ہاں شہر میں روز بلا ناغہ گوشت پکتا ہے"

—— رحمان کام پر دیر سے پہنچ گیا، دوڑتے دوڑتے اُس کا دم پھول گیا تھا، حاضری لی جا چکی تھی، مزدوروں نے کام کرنا شروع کیا تھا، اور مزدوروں کا سیٹھ ہوتے پٹھا تا پھر رہا تھا، سیٹھ کو دیکھ کر رحمان کا بدن تن سا گیا، وہ جانتا تھا، دیر سے آنے کی وجہ سے سیٹھ اُس پر برس پڑے گا۔ دن بھر کی غیر حاضری لگائے گا، اور غیر حاضری کے باوجود دن بھر کام لے گا، نہ کرے کوئی مزدور تو مزدوری ملنی مشکل تھی، اور کھیتوں پر کچھ کام نہ تھا، فصل پک رہی تھی، رکھوالی بچے اور عورتیں کر رہی تھیں، اِس سال ہر کوئی سنگھاڑے بھی نہ اکٹھا کر سکتا تھا، حکومت روز بروز سخت ہوتا جا رہا تھا، بیکار بیٹھنے سے تو بیگار بھلی، اِس لئے گاؤں والے جوق در جوق مزدوری کی تلاش میں پھرا کرتے تھے، مزدور کی قیمت گر رہی تھی، وہ تو بھلا ہو دینا ناتھ کا جس کی مہربانی سے اُسے گورنمنٹ ریٹ پر مزدوری ملتی تھی۔ ورنہ باقی مزدوروں کی طرح آدھے ریٹ پر اُس کی گزر ناممکن ہو جاتی۔ کسی مزدور نے کوئی اعتراض کیا تو مزدور کی پٹائی ہوتی تھی، رحمان کو یاد آیا کہ ٹھیکہ دار نے خود ایک مزدور کو بُری طرح سے پیٹا تھا، باقی سب مزدور اپنے ساتھی کو خاموشی سے پٹتے دیکھتے رہے، اُس کے جی میں آیا تھا کہ گنجے ٹھیکہ دار کو ایک لات رسید کر دے تاکہ ٹھیکہ دار

کو بھی محسوس ہو۔ نوکیلے جوتے کی نوک موٹے بدن میں اندر
کتنی دور، کتنی تک کھُب سکتی ہے، اور کھُب کر کتنی اَن
گنت درد کی لہروں کو جنم دیتی ہے۔ لیکن اُس کے پاس چم چم
کرتا ہوا نوکدار بوٹ نہ تھا اور ٹھیکہ دار کے بدن کو چربی کی
دبیز تہوں نے ڈھک رکھا تھا۔ شاید اِسی لئے مزدور کی چیخ
و پکار ٹھیکہ دار کے دل تک نہ پہنچ سکی تھی۔ ویسے رحمان خود
ایک مزدور تھا۔ جھگڑا پڑتا تو مزدوری جاتی رہتی۔ ظاہر تھا دینا
ناتھ پر بھی نزلہ گرتا جس کی وساطت سے وہ اس کام پہ لگ گیا
تھا۔ چُپ رہنے میں سب کی بہتری تھی۔ اور وہ چپ رہا تھا
——— یہ تب کی بات تھی جب رحمان نیا کام پہ آگیا تھا
شہر کا آدمی ہونے کی وجہ سے وہ اِتنا کام نہ کر پاتا تھا جتنا گاؤں
والے کر سکتے تھے۔ سیٹھ نے حسب معمول ڈانٹ دیا تھا پر
دینا ناتھ کے کہنے سُننے سے اب سیٹھ کی زبان بھی خاموش
تھی۔ لیکن مزدوروں پر اُلٹا اثر پڑا۔ مزدور اُس کو ٹھیکہ دار
کا جاسوس سمجھنے لگے۔ نہ اُس سے زیادہ بولتے تھے۔ نہ اُس
کے پاس بیٹھتے تھے۔ رحمان نے پہلے پہل مزدوروں کے رویے
کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ انجانے میں اپنا کھانا لے کر
اُن کے پاس بیٹھتا۔ ٹھیکہ دار کی ڈیل ڈول کا تمسخر اُڑاتا۔
گنجی ناند کا مذاق اُڑاتا اور کبھی کبھی اُن کے گنوار پن کا مذاق اُڑاتا
لیکن مزدوروں نے کبھی آگے شہہ نہ دی۔ اِتنے سارے
آدمیوں کے بیچ ہوتے ہوئے بھی وہ اکیلا رہ گیا۔ وہ لاکھ سمجھاتا۔

پھرے کہ وہ ٹھیکہ دار کا آدمی نہیں صرف دینا ناتھ کا دوست ہے۔ لیکن کسی مزدور کو یقین نہیں آیا۔ بلکہ آخری رشتے کو بیان کر وہ اور بھی بدک گئے۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ وہ اندر ہی اندر مزدوروں ۔۔۔ رکھلنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا مزدوروں کو کوستا اور سُنا سُنا کے کوستا۔

آج جب وہ دیر سے سیٹھ کے سامنے پہنچ گیا۔ تو ہر مزدور کی نگاہ اُس پر مرکوز ہو گئی۔ رحمان کے دل میں اِک ہوک سی اٹھی۔ کاش ......... سیٹھ اُسے ڈانٹ دے۔ یا صرف ٹوک دے۔ کم از کم مزدوروں کی نگاہوں میں نفرت کی شدت تو کچھ سرد پڑتی۔ لیکن سیٹھ مستری سے ڈرتا تھا۔ مستری کے دوست کو ڈانٹ دے تو ناراض ہو جائے۔ مستری ناراض ہو گیا تو وہ مزدوروں سے اپنا کمیشن وصول نہ کر سکے گا۔ اِس لئے سیٹھ نے رحمان کو ڈانٹا نہیں بلکہ ذرا الگ لے جا کر سمجھانے لگا۔

"بھئی رحمان۔ میں جانتا ہوں" تم مستری صاحب کے آدمی ہو۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ میری پرواہ ہی نہ کرو۔"

"میں حاضر ہوں۔ حضور ......... کوئی کام ہے"

رحمان نے انکساری ظاہر کی۔

"ایسا تو کوئی کام نہیں ذرا وقت پر آیا کرو۔ دوسرے مزدوروں کو ترغیب ملتی ہے" سیٹھ اپنا مطلب واضح کرنے سے ہچکچایا۔

"آج دیر ہو گئی ..... کل سے وقت پر آیا کروں گا"
رحمان نے جواب دیا۔ سیٹھ نے اپنا حربہ خالی جاتے دیکھا تو مطلب کی ذرا وضاحت کی۔
"ارے رحمان ...... تم نے عادت ڈال دی ہے سگریٹ پینے کی۔ اب بغیر مانگے بھی پلایا کرو" اور رحمان دل ہی دل میں ہنس دیا۔ لیکن نہ سہی سگریٹ ہی سہی حرامزادہ سٹھا میٹھ۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ جیب میں کوئی سگریٹ نہ تھا۔ جلدی میں وہ سگریٹ لانا بھی بھول گیا تھا۔
"سگریٹ لانا تو بھول گیا۔ آپ کہئے تو دوڑ کے لے آؤں"
رحمان نے مزدوروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو بیٹھ کے ترم روپئے سے مایوس ہو کر پھر سے کام میں مشغول ہو گئے تھے۔ مزدوروں کا ایک گروہ مٹی کھود رہا تھا۔ دوسرا گروہ مٹی کی ٹوکریاں بھر بھر کے بھیجتے بند ہو گیا رہا تھا اور تیسرا گروہ بیلچوں اور پھاوڑوں سے مٹی کو بند ہے یہ اپنی طرف سے جما رہا تھا۔ کبھی کسی مزدور کی نگاہیں اُس کی طرف گھوم جاتیں۔ رحمان کو مزدوروں کی نگاہوں میں رشک اور نفرت کی بجلیاں کوندتی محسوس ہوتیں۔ کچھ دیر مزدوروں میں کانا پھوسی بھی ہوتی اور دو ایک مزدور کام روک کے اُس کی طرف عجیب عجیب سی نظروں سے گھورتے۔
اُس وقت رحمان غصے ہو جاتا۔ جی چاہتا تھا کہ ٹھیکے کی جگہ اُسے تعلقات کیا جائے تو ایک مار مار کر ان سب مزدوروں کی کھال ادھیڑ دے۔ لیکن انکار کے باوجود وہ سمجھ ایک

میل کا چکر گاؤں کی دوکان تک کاٹنے پر آمادہ ہو گیا۔ تاکہ سگریٹ لا سکے اور سگریٹ پھونک پھونک کر اِن مزدوروں کا دل بھی پھونک دے۔ جنہوں نے نفرت بھری نگاہوں سے اُس کے دِل کو پھونک کے رکھ دیا تھا۔

——— شام کو کام بند ہونے سے پہلے آسمان پر گھنگھور بادل امڈ آئے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رواں ہوئے اور سفیدے کے درخت جھومنے لگے ڈلر کی خاموش سطح پر لہروں کے قہقہے کھل اُٹھے۔ دِن کی گرمی ماند پڑ گئی۔ مٹی کے ٹوکرے اُٹھاتے اُٹھاتے اُس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ پسینے سے تر بدن میں ٹھنڈے جھونکوں نے جان ہی ڈال دی۔ وہ دِن بھر کی ساری تھکن کو بھول گیا۔ اپنے ساتھیوں کی سرد مہری بھول گیا۔ سوداوتی کی تلخ کلامی بھول گیا۔ اور ترنگ میں آ کر ایک پیارا سا فلمی گیت گنگنانے لگا۔ گیت کی لے پر اُس کے پیر ناچنے لگے، تھرکنے لگے۔ اور سر پر رکھی مٹی سے بھری ٹوکری بھی مچلنے لگی۔ اُس نے دادِ طلب نگاہوں سے اِرد گرد مزدوروں کی طرف دیکھا۔ مزدور اُسے ایک ٹک گھورے جا رہے تھے۔ اُس کے حلق میں گنگناہٹ مر سی گئی۔ اُس نے ایک مزدور سے پوچھا۔

"کیا بات ہے، تم میری طرف ایسے کیوں گھور رہے ہو۔ کیا پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے مجھے؟"

مزدور رحمان سے تنومند تھا۔ اُس نے کرخت لہجے میں

جواب دیا۔

"بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔ جو گانا گایا جا رہا ہے۔"

رحمان کو مزدور کے لہجے سے چڑ سی ہو گئی۔ اُس نے فلمی انداز میں جواب دیا۔

"دیکھتے نہیں۔ کیسا سہانا موسم ہے۔ خواہ مخواہ گانا گانے کو جی چاہتا ہے۔"

مزدور نے فلمی انداز سے مرعوب ہوئے بغیر پہلے جیسے کرخت لہجے میں کہا۔

"فصل پک رہی ہے۔ بارش آگئی تو ساری فصل خراب ہو جائے گی۔"

تب رحمان کو پتہ چلا کہ اُس کے گانے پر مزدوروں کو کیوں اعتراض ہے۔ لمحے بعد مزدوروں کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھ جاتیں۔ جیسے اپنی نگاہوں سے بادل کو پھیلنے سے روک لیں گے۔ لیکن بادل تن کر بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ واقعی یہ سہانا موسم مزدوروں کے لئے کسی طوفان سے کم نہ تھا۔ اُن کا اعتراض بجا تھا۔ بے چارے غریبوں کی سال بھر کی محنت برباد ہونے کا خطرہ تھا۔ واقعی اُسے گنگنانا نہ چاہیئے بلکہ ہمدردی جتانی چاہیئے۔ لیکن مزدور کا کرخت لہجہ بجا نہ تھا۔ اِن گاؤں والوں نے شاید اُسے شہر کا آدمی سمجھ کر بُزدِل سمجھ لیا ہے۔ کیا پڑی ہے اُسے اِن مزدوروں سے ہمدردی کرنے کی جو اُسے پرایا سمجھتے ہیں۔ ٹھیکیدار

کا آدمی سمجھتے ہیں، اُس سے نفرت کرتے ہیں، وہ گائے گا اور ضرور گائے گا۔ حلق پھاڑ پھاڑ کے گائے گا۔
"میری مرضی ہے گا نا گاؤں یا چپ رہوں۔ میرے نہ گانے سے بادل تھوڑی ہٹ جائیں گے" وہ پھر گیا۔
"تم نہیں گا سکتے......." مزدور ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ رحمان نے چاروں طرف دیکھ لیا۔ ہر مزدور کی نگاہ اُس پر جمی تھی۔ دور، ایک درخت کے نیچے سیٹھ بیٹھا ہوا تھا۔ شاید سو گیا تھا۔ اکیلے نپٹنا پڑے گا ان سب مزدوروں سے۔ آج دب گیا تو عمر بھر دبتا رہے گا۔ یہ شہر کی عزت کا سوال تھا۔ فیصلہ کر کے اُس نے بھی ایک قدم آگے بڑھایا۔ سارے مزدوروں نے کام روک دیا۔ رحمان اور مزدور لڑائی کی شروعات پر اُتر آئے۔ ایک دوسرے کو ناپ ناپ کر گالیاں دینے لگے۔ شورش کر سیٹھ کی آنکھ کھل گئی۔ ماجرا دیکھ کر وہ دوڑا دوڑا آیا اور ڈانٹ ڈپٹ کر دونوں کو الگ کر دیا۔ کام پھر شروع ہوا لیکن رحمان کا موڈ بالکل بگڑ گیا۔ اُس نے گنگنانا چھوڑ دیا۔

——— رات کو جب رحمان دینا ناتھ کے گھر پہنچ گیا۔ تب بھی اُس کا موڈ خراب تھا۔ آنگن میں مالک مکان کی بوڑھی ماں سنگھاڑے چھانٹ رہی تھی۔ رحمان نے حسب معمول آج اُس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ بلکہ سیدھا دندناتا ہوا دروازے تک گیا۔ مکان کے اندر سے سوماوتی کی اونچی آواز سنائی دی۔ شاید سوماوتی بیمار تھی یا شاید دینا ناتھ بیمار تھا۔ آج دن بھر نہ دیکھا تھا۔ موسم خراب تھا۔ بادل چاروں طرف چھائے ہوئے تھے۔ پہاڑوں پر شاید روز بارش ہوا کرتی ہے۔ دریا کا پانی بھی چڑھا چڑھا رہتا تھا۔ یا کہیں سوماوتی کی دردِ زہ نہ ہو۔ حاملہ تو تھی۔۔ ۔۔کہیں ... بچہ وہ بے دھڑک اندر جانے سے ہچکچایا۔ اُس نے آواز دینی مناسب سمجھی۔

"بھئی دینا ناتھ ... دینا ناتھ" اُس کی آواز لگانے کی دیر تھا۔ کہ کوئی سایہ اندھیری راہداری سے الگ ہوگا۔ زینہ چڑھ گیا اور تب اُسے محسوس ہوا کہ مالک مکان کی بیوی چپکے چپکے کان لگا کر دینا ناتھ اور سوماوتی کی باتیں سُن رہی تھی۔ رحمان کو غصہ آگیا۔ واقعی اِس گاؤں کا ہر آدمی کمینہ ہے۔

ان پر بالکل رحم نہ کرنا چاہیئے۔ دینا ناتھ کی آواز نے اُسے مزید سوچنے کی مہلت نہ دی۔

"اندر آؤ بھئی ...... اندر آؤ۔ باہر کیوں کھڑے ہو"

——— سوماتی بیمار نہ تھی۔ اپنے ٹرنک کو کھولے بیٹھی کپڑے الٹ پلٹ رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ روتی جا رہی تھی۔ دینا ناتھ بیوی سے غافل دیوار سے پیٹھ لگائے ہونٹوں میں سگریٹ دابے سوماتی کے آنسوؤں سے بے نیاز اپنے پیروں کو ہلائے جا رہا تھا۔ رحمان کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ میاں بیوی کے جھگڑے میں بولنا مناسب نہ تھا۔ وہ کسی سے مخاطب ہو۔ دینا ناتھ نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔

"بیٹھو بھئی رحمان ...... تم رک کیوں گئے۔ یہ تو روز کا دردِ سر ہے..."

"میں تمھارے لئے دردِ سر ہوں تو بیاہ کر کیوں لائے تھے"

...... سوماتی چیخ پڑی اور رحمان گھبرا گیا۔ اُس کے مُنھ سے بے اختیار نکل گیا۔

"بھابی آہستہ۔ باہر لوگ سُن رہے ہیں۔ وہ سُن لیں گے تو کیا سمجھیں گے۔"

"ہاں ہاں تم بھی اُس کی طرف داری کرو۔ میں تو اُس کے سارے خاندان کی دشمن ہوں" سوماتی اور زور سے رونے لگی۔

"یہ ہوا کیا ...... رحمان نے پوچھا۔

"... ہو گیا تھا ......" دینا ناتھ نے وضاحت کی "یہاں ... کی کثرت ہے۔ کہیں سے ایک چوہا ٹرنک میں گھس گیا اور کپڑوں کا ستیاناس کر دیا۔ کہا تو تھا، گاؤں میں ہیر دمغا سینے کی ضرورت نہیں چاہیے

کپڑے ساتھ لے آنے تھے۔ لیکن صاحبزادی نے کسی کا کہنا مانا ہو
اس خادم کا مان لیتی .....

"ہاں بھابی .... دینا ناتھ نے ٹھیک کہا تھا۔ ویسے اس سال چوہے بہت بڑھے ہیں، گاؤں والے کہتے تھے کہ جس سال چوہے زیادہ ہوتے ہیں اُس سال خوفناک باڑھ آتی ہے اور موسم کے آثار تو تم دیکھ ہی پاتی ہو۔ دریا کا پانی بھی ....." رحمان نے اپنی دانست میں بات بدلنی چاہی لیکن میاں بیوی راضی بھی ہو جاتے۔ دینا ناتھ نے بات پھر اُسی نکتے پر لا کھڑی کی۔

"بھئی۔ تمہاری بھابی مجھ پر الزام دے رہی ہے کہ میں نے ٹرنک جان بوجھ کر کھلا چھوڑا۔ اُس کی عقل کی داد دو ....."

"تم تو چاہتے ہو کہ میں پھٹے پرانے چیتھڑوں میں گزارا کروں۔ نوکرانی جو ٹھہری" سوماتی نے الزام کی وضاحت کی۔

رحمان جھنجھلا گیا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے لڑنے پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ پھر بھی دوستی کے ناطے اُسے دینا ناتھ سے زیادہ ہمدردی تھی اِس لئے اُس نے ایک دفعہ اور بات بدلنے کی کوشش کی۔

"میرا مطلب ہے بھئی کہ ... بس یہ کہنا چاہتا تھا کہ .... دریا میں باڑھ اس میں کسی کا کیا قصور ....."

دینا ناتھ نے اُس کی بات کاٹ کر فیصلہ کن لہجہ میں کہا "چھوڑو بھئی رحمان۔ تم بھی کس کے منہ لگتے ہو ....."

خاوند کی بات سُن کر سوماتی بھوکی شیرنی کی طرح گرج پڑی "ہاں ہاں

غیروں کے سامنے مجھے بے عزت کرو اور اپنا کمینہ پن سب کو دکھاؤ۔"

_____ رحمان سمجھا" گالی کا لفظ سن کر دینا ناتھ نہ معلوم کیا کر بیٹھے گا اب تک دینا ناتھ کے گھر آ سما نے کسی عورت کو ایسی زبان استعمال کرتے نہ سنا تھا۔ لیکن شاید سوانی مت گالیاں دینے کی پہل بہت دنوں سے کر رکھی تھی کیونکہ دینا ناتھ کو غصہ بالکل نہ آیا بلکہ جیسے رحمان کی طرف معذرتانہ نگاہوں سے دیکھا "رحمان کوئی غیر آدمی ہے کیا۔ بچپن سے ساتھ بڑھے ہیں سارے کھیلے ہیں!!"

"تبھی تو یہ کمینہ پن سمجھ گئے ہو۔ جیسی روح ویسے فرشتے" سوانی کے الفاظ سن کر رحمان کا چہرہ لال ہو گیا۔ اب باقی کیا رہا تھا اِس گھر میں۔ اُس سے برتن پھنکوائے گئے۔ جھاڑو دلوائی گئی اور نوکروں جیسا برتاؤ کیا گیا۔ آج گالیاں بھی دی جا رہی ہیں۔ جیسے وہ دینا ناتھ کا دوست نہ تھا بلکہ کوئی کتا تھا۔ جو اس گھر کے چکر لگا رہا ہو۔ اب اِس گھر میں رُکنا فضول تھا۔ بہت پہلے ہوا کا رُخ بھانپ لینا چاہیئے تھا اُسے۔ وہ چپکے سے اٹھا اور باہر جانے لگا۔ دینا ناتھ نے روکنا چاہا۔ تو سوانی گرج پڑی۔

"یار دوستوں کی خاطر بیوی کو ہی چھوڑ دو۔۔۔" اور کیا سیکھ لیا ہے تم نے دوستوں سے۔"

"بکواس۔۔۔" دینا ناتھ بھڑک پڑا "تم بہت آگے بڑھتی جا رہی ہو۔"

"اوہو۔۔۔ اب میں بکواس بھی کرنے لگی ہوں" سوانی نے ڈاڑھیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ "لونڈی کی طرح کام کروں اور جو منہ کھولوں تو منہ نوچتے ہو۔

رحمان نے جوتے پہن لیے تھے۔ میاں بیوی کے جھگڑے میں بنا موڑ پا کر اُس کے قدم غیر ارادی طور پر رُک گئے۔ رحمان جانتا تھا کہ دینا ناتھ بچپن سے خود سر ہے کہیں غصے کے زیرِ اثر سوما وتی پر ہاتھ اٹھا دے تو بُرا ہو گا۔ سوما وتی حاملہ تھی۔ چوٹ لگی تو جان پر بن آنے کا خطرہ تھا۔ اُس نے مداخلت کی "بھئی دینا ناتھ۔ مرد ہو کر تم میں برداشت کا مادہ زیادہ ہونا چاہیئے۔ تم ہی ذرا نرمی برت لو ...."

"نرمی ہی تو دکھائی اب تک جو یہ دن دیکھ رہا ہوں" دینا ناتھ نے بیوی کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اب بُری اپنی باتیں بھول جاؤ۔ مکان والے سُن رہے ہیں۔ کیا سمجھیں گے وہ۔" رحمان نے دینا ناتھ کو غیرت دلا دی اور بوکھلا گیا۔ سوما وتی اُلٹے برس پڑی۔

ہم میاں بیوی چاہے ایک دوسرے کو ماریں ... پیٹیں۔ غیروں کو کیا جو سُنتا ہے تو سُنا کرے۔ میری جُوتی کو نہیں پرواہ"

رحمان کی زبان اب کے نہ رُک پائی۔ سوما وتی کے ہاتھوں وہ کافی بے عزت ہو گیا تھا۔ اُس نے صاف صاف کہہ دیا۔

"بھابی میں تب سے اِس گھر میں آیا کرتا ہوں جب تم بیاہی نہیں گئی تھی۔ کبھی بھابی ...... میں کوئی غیر نہیں۔"

سوما وتی نے خاوند کی اور دیکھا اور طنز بھرے لہجے میں کہا "مرد ہو تو تم جیسا ...... بیوی کا بھی مذاق اُڑواؤ .... ٹھنڈک پڑ رہی ہو گی کلیجے پر ...."

دینا سراسیمہ ہوا۔ رحمان کی خاطر بیوی سے لڑ رہا تھا۔ کیا ضرورت تھی رحمان کو جواب دینے کی۔ سوما وتی بُری سہی لیکن اُس کی بیوی تو ہے۔ اور دوست ہونے کے ناطے رحمان کو اُس کی بیوی کا کچھ تو لحاظ کرنا چاہیئے۔ کچھ نہ سوچ کر اُس نے رحمان کا بانہہ پکڑی سلیپر پہن لیا اور باہر نکل آیا۔ آنگن میں مالک مکان کی ماں اور بیوی

بیتی آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں رحمان اور دینا ناتھ دونوں نادم سے ہوئے۔
رحمان نے آہستہ سے اپنا بازو دینا ناتھ کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اور دونوں خاموشی سے
آنگن طے کرنے لگے۔ آنگن میں جا بجا کیچڑ کے ڈھیر تھے۔

______ بارش کی وجہ سے دریا کا پانی مٹیالا ہو گیا تھا۔ دینا ناتھ نے
مٹیالے پانی پر نگاہیں جما دیں اور رحمان نے ہچکچاتے ہوئے خاموشی کو توڑا
"دیکھا ناتھ بھابی کا رویہ۔ اور اِس پر بھی تم اِصرار کرتے ہو کہ گھر آیا کرو۔"
"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کئی دن سے چڑچڑی ہو گئی ہے۔ شاید اُس کی
طبیعت خراب ہے" دینا ناتھ نے جواب دیا۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ عجیب بہت
ہے اِس دریا کی بھی جو سامنے خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ کبھی اُتار پر تو کبھی چڑھاؤ
پر۔ شاید زندگی اِسی اُتار چڑھاؤ کا نام ہے۔ اور مٹیالا گدلا پانی ۔۔۔۔ چھونے
کو جی نہیں کرتا آج۔

رحمان نے دینا ناتھ کی مایوسی محسوس کی۔ واقعی دُکھی تھا اُس کا دوست
شاید شادی کے بعد ہر ایک دُکھی ہو جاتا ہے۔ شکر ہے اللہ کا کہ اُس کی شادی نہیں
ہوئی ہے۔ ورنہ اُس کی بھی حالت بُری ہوتی۔ دینا ناتھ نے رحمان کی خاموشی محسوس
کی تو کہا۔

"تم اپنی بھابی سے ناراض ہو گیا۔۔۔۔" دینا ناتھ کے لہجے میں بلا کا شکوہ
تھا اور رحمان نے جلدی سے کہا۔

"نہیں اللہ کی قسم کوئی شکوہ نہیں۔ لیکن میرے آنے سے ناحق جھگڑا اُٹھ کھڑا
ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔"

دینا ناتھ نے محسوس کیا۔ دریا کا پانی مٹیالا تو ہے ہی لیکن شام کے ملگجے
نے اُسے اور کالا کر دیا ہے۔ اور اندھیرا بڑھنے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ بھیانک

ہوتا جا رہا ہے۔ شاید دیر ہو رہی ہے۔ جی تو چاہتا تھا رحمان کے سامنے اپنا دل ہلکا کر دے۔ کچھ اپنی کہے کچھ اُس کی سنے۔ لیکن رات رُکی تو نہیں جا سکتی۔ اور سوماوتی گھر پر اکیلی تھی۔ ڈر گئی تو ایسی حالت میں سنبھالنا مشکل تھا۔ کاش رحمان اُس کی مجبوریاں سمجھ سکے۔

"گھر پر ماں جی ناراض ہے۔ تمہارا باپ ناراض ہے۔ رشتہ دار ناراض ہیں۔ تم بھابی کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ تم مرد ہو۔ گھر کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

رحمان دینا ناتھ کے وجود میں چھپے ایسے پھوڑوں کو چھو رہا تھا جن کا احساس دینا ناتھ کو تھا۔ پر اُن کی حدیں واضح نہ تھیں۔ نہ ہی اُس کا جی کرتا تھا۔ کہ اِن پھوڑوں کی حدود کبھی واضح ہوں۔ اتنے برس بیکار رہ کر اُس کی شہرت ہر ایک کی نظروں میں گر گئی تھی۔ اب موقعہ مِل گیا تھا۔ کہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو سکے۔ اور یار دوست تھے کہ آڑے آ رہے تھے۔ اُس نے رحمان کو روکا۔

"رحمان ...... میں یہ سب باتیں سمجھتا ہوں۔ لیکن سوماوتی میری بیوی ہے۔ اُس نے میرے ساتھ گھر بسایا ہے۔ میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔"

"میں چھوڑنے کو کب کہہ رہا ہوں"۔ رحمان ناراض ہو گیا" بھلا مجھے کیا حق ہے ایسی بات کرنے سے۔ وہ تو میری بھابی ہے۔ بہن کے برابر ہے۔ ایسی بات کہنی نہ چاہیئے تھی۔ خیر..... چھوڑ اِن باتوں کو۔ دیر ہو رہی ہے مجھے اجازت دو۔ کھانا بھی بنانا ہے۔"

——— جب کبھی وہ ایک دوسرے سے ناراض ہوتے تھے۔ تو ایک دوسرے کو منا بھی لیتے تھے۔ دینا ناتھ نے رحمان کی ناراضگی بھانپ لی۔ اس لئے اُس کا جی چاہا رحمان کو گھسیٹ کر گھر لے جائے۔ اور دونوں اکٹھے کھانا کھائیں۔ مدتیں ہو گئی تھیں ایک ہی تھالی میں کھانا کھائے۔ لیکن گھر پر سوماوتی منہ پھلائے بیٹھی

ہو گی۔ شاید چولہا بھی نہ جلایا ہو گا۔ کئی بار سوماوتی کے غصے کے صدقے فاقوں کی نوبت آئی تھی۔ رحمان کو گھر لے گیا تو ضرور بھڑک جائے گی پر اپنی ذہنی تسکین کے لئے وہ پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔

"سنا ہے عبدالسلام آ گیا ہے۔ اس کے لئے بھی کھانا بنانا ہو گا۔ ورنہ کھانا میرے ساتھ ہی کھا لیتے۔"

دینا ناتھ کے الفاظ آپس میں کچھ اس انداز سے منسلک تھے کہ رحمان کو ٹھیس سی لگی۔ دینا اب اسے دوسروں کا باورچی ہونے کا بھی طعنہ دے رہا تھا۔ سوماوتی کا رنگ۔ اب دوستی پر بھی چڑھ گیا ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ بھلا کیا جوڑ ہے اُن کا۔ وہ ایک ہانجی کا اَن پڑھ لڑکا اور دینا ناتھ ایک بڑے ٹھیکیدار کا منشی۔ دونوں ہاتھوں سے روپیہ بٹور رہا ہے۔ اب غریب دوستوں کی بے فائدہ دوستی سے کیا غرض۔

"عبدالسلام کل رات کو آ گیا ہے......" رحمان کا لہجہ رُوکھا ہو گیا۔

دینا ناتھ نے رُوکھے لہجے کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا "اب تم کہاں رہو گے......"

رحمان نے سوچا۔ اب دینا ناتھ کے رویئے کی وضاحت اور ضرورت نہیں رہی خود ہی لایا اور خود ہی پوچھ رہا ہے۔ کہ کہاں رہو گے۔ رحمان کا جی چاہا کہہ دے کہ شہر واپس جاؤں گا۔ لیکن شہر میں مزدوری کی سبیل نہ تھی۔ سیاح کشمیر کے سیر سپاٹے کو آتے تھے تو کشتیوں میں بیٹھ کر سیر کرتے پھرتے تھے۔ ہانجیوں کا پیٹ بھی بھرتا۔ پر اس ہندوستان اور پاکستان کے جھگڑے نے سیاحوں کی آمد کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ اور کاروبار ماند تھا۔ کسی طور فیصلہ ہو جاتا تو زندگیوں میں بھی سکون آئے...... بوڑھا باپ بڑی مشکل سے کچھ کر پاتا تھا۔ تو دینا کا

پیٹ نہ بھرتا تھا۔ اُسے کھلانے سے تو رہا۔

"میں نے پوچھا آپ تُم کہاں رہو گے۔۔۔" دینا ناتھ نے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر پھر سے سوال دُہرایا۔ وہ چاہتا تھا رحمان روز کی طرح اُس کی رائے پوچھے۔ تبھی تو پتہ چل جاتا کہ رحمان کے دِل میں کدورت باقی نہیں۔ سو با وقتی آخر بھابی تھی رحمان کی۔ لڑ پڑی تو کیا ہوا۔ گھروں میں ایسا ہوا کرتا تھا۔ لیکن رحمان کے جواب نے اُس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ رحمان نے بدستور رُکھائی سے کہا۔ "اتنی بڑی دُنیا ہے کہیں نہ کہیں جگہ مل ہی جائے گی۔"

"تُم ٹھیک کہتے ہو کہیں نہ کہیں جگہ مل ہی جائے گی!" دینا ناتھ کے لہجے میں بہت زیادہ کڑواہٹ تھی۔ جیسے لہجے کی کڑواہٹ سے دوستی کی ساری مٹھاس ختم کرنا چاہتا ہو۔ "اچھا بھئی میں تو چلا۔ کبھی مُنہ دکھانا اگر جی میں آئے تو۔۔۔"

"آ جاؤں گا کبھی۔۔۔۔۔۔۔" رحمان نے جان بُوجھ کر آواز میں تمسخر پیدا کیا اور گھر کی طرف ہو لیا۔

بھولی کی مار نے دروازے کو دھکا دیا۔ اور
چوکھٹے کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی۔ اب تو کچھ سیڑھیاں چڑھنے
سے سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگتا تھا۔ دروازے کے پٹ
کر کرا کر کھل گئے۔ اور وہ تعجب سے کمرے کے اندر دیکھنے
لگی۔ رحمان ڈھینگ مار اکرتا تھا کہ مکھی کی بھنبھناہٹ تک
سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے لیکن وہ دروازے کی کرکراہٹ
سن کر بھی جاگ نہ سکا۔ بچول کو شاید ڈھینگ مارنے ہی
مزا آتا ہے۔ یا رحمان شاید بہت کام کرنے کی وجہ سے تھکا
پڑا غافل ہو گیا ہے۔ بے چارہ ۔۔۔۔۔۔۔
رحمان اوندھے منہ سویا پڑا تھا۔ بازو پھیلے
پڑے تھے۔ آدھا بستر سے پھسل کر چٹائی پر بکھرا سا
لگتا تھا۔ قمیض کا دامن گردن تک سمٹ آیا تھا۔ اور ساری
پیٹھ ننگی پڑی تھی۔ ریڑھ کی ہڈی کی جگہ دراڑ سی لگتی تھی پسلیوں
کی حدیں گوشت کے موٹے موٹے پٹھے تعین کئے ہوئے تھے۔

ایک ایک پٹھے سے زور اور طاقت کا اظہار ہو رہا تھا۔ چوکھٹے کے سہارے کھڑی پھوپی کی ماں کو ایسے لگا جیسے اُس کے سامنے رحمان نہیں بلکہ اپنا مرحوم خاوند کھڑا ہو یا پڑا ہو۔ وُہی گورا گورا کسرتی بدن ..... وہی مضبوط مضبوط و لرکی مچھلیوں جیسے پٹھے ...... وہی تنی تنی کمان جیسی ریڑھ کی ہڈی۔ یاد آتے ہی اُس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اُس نے آنکھوں کو بے دردی سے مسلا اور شانے بے نیازی سے جھٹک دیئے۔ جیسے شانے جھٹک دینے سے کوئی اپنے ماضی کو جھٹک سکتا ہے کبھی!

جیسے رحمان اُن کے ہاں رہنے کو آیا تھا۔ اُسے اپنا خاوند بار بار یاد آتا تھا۔ رحمان کی آواز بھی اُس کے خاوند جیسی بھاری بھاری لگتی تھی، یا شاید اُس کا آوارہ ذہن رحمان کی بھاری آواز کو زبردستی مرحوم خاوند کی آواز میں ڈھال لیتا تھا۔ مدتیں بیت گئی تھیں خاوند کی آواز سُنے ہوئے۔ بھلا اب آواز کہاں یاد رہی ہوگی۔ اِتنے برس بعد کسی مرد کی بے تکلف آواز کو اپنے مکان کی چار دیواری میں سُن سُن کر اُس کے ذہن نے غیر ارادی طور پر اِس آواز کو اپنے ارمانوں کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔ اپنے مرحوم خاوند کی آواز سے منسلک کر دیا تھا۔ جس کی آواز کبھی اِس مکان کی چار دیواری میں گونج مچاتی تھی یکایک اُسے محسوس ہوا وہ ناحق اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہے۔ رحمان کسی وقت بھی یہ گھر چھوڑ کے جا سکتا ہے۔ جب اپنے تھے وہ ساتھ نہ دے سکے تو پرائے لوگوں کا کیا؟

——— وہ دروازے کی چوکھٹ سے ذرا آگے بڑھی، تو رحمان کا سر بھی نظر آنے لگا۔ رحمان کی آنکھیں نیم وا تھیں مُنہ تکیے کے دباؤ سے کھُل گیا تھا، اور مُنہ میں سے رال بہہ کر تکیے پر گر رہی تھی۔ ماں کے فطری جذبے نے اُسے آگے بڑھنے پر اُکسا دیا۔ کہ پھرن کے کنارے سے رال پُونچھ دے لیکن وہ آگے نہ بڑھی۔ رحمان کہیں جاگ گیا تو شاید کھسیانا ہو جائے۔ بھلا اِس عُمر میں بھی کسی کی رال گرتی ہے۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہو گی۔...... تبھی بے حال پڑا ہے۔

"رحمان...... رحمان بیٹا۔ اٹھو دیر ہو رہی ہے...."

بوڑھیا نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر بڑے میٹھے لہجے میں پکارا۔ لیکن رحمان نہ جاگا۔ بوڑھیا نے چاہا ہاتھ بڑھا کر جھنجھوڑ دے۔ دن بہت چڑھ آیا تھا۔ اور رحمان نے رات کو تاکید کی تھی کہ اُس کو صُبح سویرے جگایا جائے کچھ بڑے افسر کام دیکھنے آرہے تھے۔ لیکن وہ کیسے چھوئے پرائے مرد کو۔ تین مہینے ہو گئے تھے رحمان کو اِس گھر میں رہتے ہوئے۔ اور اُس نے رحمان کے کسی انگ کو آج تک نہ چھُوا تھا۔

عبدالسلام کا بھلا ہو جس نے اُن کی غربت پہ ترس کھا کر رحمان کو اُن کے گھر کرایہ دار بنا دیا۔ بہت بھولا تھا رحمان۔ ہر دم اُسے ماں کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ دل کا کھوٹا ہوتا تو اپنا راشن ہم سے نہ پکواتا۔ شک کرتا کہ ہم راشن بھی

گڑبڑ کر دیں گے۔ لیکن اپنا گھر سمجھ کر بیٹھا ہے۔ اور رحمان
کی بدولت وہ بدقسمت بوڑھیا بھی رُوکھی سُوکھی کھاتی تھی۔ دل
کا بڑا ہوتا تو وقت پر کام بھی نہ دیتا۔ کہ اب یہ صاف بچ رہا تھا
اور پھوپی کے جہیز کی سبیل نکل آئی تھی۔ پگلا اس جنم جلی بوڑھیا
اس جنم جلی بوڑھیا سے اتنا پیار کرتا ہے کہ کہا نہیں جا سکتا۔ کبھی
تیل کی بوتل لایا اور کبھی صابون لایا...... بُڈھو.... چوڑیاں
بھی لے آیا۔ بھلا وہ بوڑھیا...... قبر کے کنارے کیا سنوارے
اپنے آپ کو۔ لیکن یہ سنپیا ماں نے بھی کیسی بھولپن سے کہتا
ماں... "تم تو ڈھی کہاں ہو۔ ذرا بال بنا کے رکھا کرو... بچی
مگو گی" جیسے ماں کا بچہ ہے نا...... ماننا کا بھجو کا ہرج
بھی کیا ہے تو وہ پھوپی... اب بیٹا ہے رحمان اُس کا....

فیصلہ کر کے اُس نے رحمان کا کندھا چھوا
اور دھیرے دھیرے ہلانے لگی۔ رحمان نے شانے جھٹک کر
کروٹ بدل دی اور اُس کے ہاتھ ٹھٹھک گئے۔ جب کبھی
اپنے خاوند کو ڈیلر جانے کے لئے منہ اندھیرے جگانے کی
کوشش کرتی تھی۔ تو وہ بھی اسی انداز سے شانے جھٹک
کر کروٹ بدل لیتا تھا۔ کہیں اور کوئی آفت نہ آجائے۔ اُس
کے منحوس ہاتھ جس سے چھو گئے اُس پر آفت آگئی۔ خاوند
سے پیار کیا وہ نہ رہا۔ روٹی سے پیار ہے وہ نہیں ملتی۔ اب
زندگی کا ایک سہارا اتنی پھوپی۔ وہ بھی دن بہ دن نہ جانے کیوں
دور ہوتی جا رہی ہے۔ شاید وہ خود جنم جلی ہے۔ جس پر پرچھائیں

ڈال دیتی ہے اُسے راکھ کر دیتی ہے۔ محسوس ہوتے ہی
اُس سے کمرے میں نہ رہا گیا۔ وہ اُلٹے پیر واپس لوٹ آئی۔
سیڑھیاں اتر کر وہ باورچی خانے میں گھس گئی
پھولی نے سٹی کی رکابی میں سنگھاڑے کے آٹے کی دو موٹی
روٹیاں پروس رکھی تھیں اور پتیلے میں بغیر دودھ کے
نمکین چائے کھول رہی تھی۔ رحمان نے پہلے کبھی سنگھاڑے
کے آٹے کی روٹیاں نہیں کھائی تھیں۔ اس لیے یہ روٹیاں
ہضم کرنا اُس کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن چاول نام کو بھی نہ
ملتے تھے۔ بارش نے فصل کو نقصان پہنچایا تھا۔ جس کی وجہ سے
قحط کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ جو کچھ چاول بن پاتا تھا وہ
کواپریٹو سوسائیٹی نے برائے نام قیمت پر کسانوں سے زبردستی
شہر کی آبادی کے لیے خرید لیا تھا۔ طوعاً کرہاً رحمان کو بھی
روٹی کھانی پڑتی تھی۔ جہاں گاؤں کے لوگ چار چار روٹیاں کھا
کر بھی ڈکار نہ لیتے تھے۔ وہاں وہ پوری دو روٹی بھی ہضم نہ
کر پاتا تھا۔ ویسے سنگھاڑے کے آٹے کی روٹی بنانا بہت
مشکل تھا۔ خاص خاص لوگ ہی اس آٹے کی روٹی ٹھیک سے بنا
سکتے تھے۔ اس لیے بوڑھیا رحمان کا کھانا خود بنایا کرتی تھی۔
بوڑھیا کو اکیلے آتے دیکھ کر پھولی نے پوچھا " جگا یا نہیں
ماں ......... چائے اُبل اُبل کر کڑوی ہو رہی ہے "
بوڑھیا نے پھولی کی اور دیکھا۔ پھولی کی آنکھوں میں عجیب
سا خمار لہرا رہا تھا۔ گالوں پر دو لال لال نشان سے اُبھر آئے۔

تھے۔ اور سینہ بھی بھرا بھرا لگتا تھا۔ پھولی تیزی سے عورت بنتی جا رہی تھی۔ بوڑھیا کے دل میں ایک نئے فتنے نے سر ابھارا۔

"میرے اٹھائے نہیں اٹھتا۔ جا بیٹی تو ہی جگا دے۔"

"میں ۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔" پھولی پریشان سی ہو گئی۔ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ شرم سے سمٹ سی گئی۔ اور بڑھیا کے دل میں کسک سی اٹھی۔ شاید وہ خود بھی شادی سے پہلے کسی غیر مرد کے سامنے جانے سے ایسے ہی شرما کر سکڑ جایا کرتی تھی لیکن رحمان غیر کہاں تھا۔ اپنا گھر جان کر یہاں رہتا تھا۔ ایک اکیلے نے مکان کے سامنے گندے سڑے ہوئے آنگن کو لہلہاتی کیاری بنا میں بدل دیا۔ لڑکا بڑا سیانا تھا۔ کماؤ تھا۔ محنتی تھا۔ پھولی کی شادی رحمان سے ہو جائے تو ۔۔۔۔۔۔ تو اسے بھی بوڑھاپے میں بیٹا ملے گا۔ کاش رحمان مان جائے۔ اُس نے شہہ دی۔

"گم سُم کیوں کھڑی ہو۔ مجھ سے نہیں جاگتا۔ رحمان غیر تھوڑی ہے جو تو شرماتی ہے۔ جا بیٹی۔ دیر ہو رہی ہے۔" بوڑھیا اپنی دانست میں پھولی کو کھلی ڈھیل دے رہی تھی۔

پھولی نے غصّے سے سر جھٹک کر ماتھے پر بکھرے بال پیچھے کو پھینک دیئے۔ پھرن کے بازو سے ماتھے پر اُبھرے پسینے کے قطروں کو مٹا دیا۔ اور پیر پٹختی ہوئی باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔ بڑھیا سٹھیا گئی تھی۔ جو اُسے بار بار رحمان کے پاس بھیج دیتی تھی۔ بھلا وہ کیوں کر ماں سے کہے کہ جب کبھی اُس کا رحمان سے سامنا ہوتا ہے تو رحمان اُس کو ایسے

گھورنے لگتا ہے جیسے کھا ہی جائے گا۔ کیونکہ کہتے کہ سیٹھ جیوں پر
مڈ بھیڑ ہوتے ہی رحمان کے ہاتھ اُسے نوچنے کو آگے بڑھتے
ہیں۔ آنگن میں کیاریوں میں نلائی گوڑائی کرنے وقت چھیڑنے
پر تُلا رہتا ہے۔ کبھی دے بوڑھیا سے تو شاید ہنگامہ ہو جائے
رحمان کو شاید گھر سے نکال دے پھر شاید عبدالسلام موقعہ
بے موقعہ یہاں نہ آسکے۔ اور خود اُس کی حالت ایسی تھی کہ دو
قدم چلنے سے کمر میں درد ہونے لگتا تھا۔ دولہ جانا تو در کنار
اُس کا بس چلے تو عبدالسلام کا منہ بھی نہ دیکھے۔ اِس کھیل سے
اب دِل اُوب سا گیا تھا اُس کا۔ عبدالسلام کے ساتھ ہر
ملاقات کے بعد بدن ٹوٹ سا جاتا تھا اور دل بُری طرح سے
دھڑکنے لگتا تھا۔ لیکن عبدالسلام سے ملنا ضروری تھا۔ ملاقاتوں
میں ڈھیل پڑ گئی۔ تو شاید عبدالسلام ہاتھ سے نِکل جائے۔ پھر تو
اُس کا خدا حافظ۔ کچھ ہو گیا تو...... وہ آگے نہ سوچ سکی
خیال آتے ہی سارے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور ذہن اُلجھنوں
میں ڈوبنے لگا۔

اُلجھنوں کو زبردستی ذہن کے تاریک نہاں خانوں
میں دھکیل کر اُس نے روشن کمرے میں قدم رکھا۔ رحمان کا منہ
ابھی تک کُھلا پڑا تھا۔ ہونٹوں کے درمیان سے حلق کسی گہری
کھائی کی طرح لگتا تھا۔ گال پر رال نے چمک سی پیدا کی تھی۔ اِس
کے باوجود چھوٹی کو رحمان کا چہرہ بھلا لگا۔ بھرے بھرے
گالوں کے درمیان موٹے ہونٹ پھب رہے تھے، اور نچلے

ہونٹ کا خم بڑا خوبصورت لگتا تھا. جیسے کسی دودھ پیتے بچے نے ہونٹ سکیڑ لئے ہوں. اور اوپری ہونٹ کے اوپر خوبصورتی سے تراشی ہوئی ہلکی ہلکی مونچھوں نے سارے چہرے کو مردانگی بخش دی تھی. پھولی نے سوچا کہ وہ آج ضرور عبدالسلام سے مونچھوں کا ذکر کرے گی. عبدالسلام کی لمبی لمبی گھنی مونچھوں سے وہ کبھی مانوس نہ ہو سکی. عبدالسلام کی مونچھیں دیکھ کر ہر بار پھولی کا ذہن دُلہ کے کنارے اُگی خوفناک جھاڑیوں کی طرف منتقل ہو جاتا تھا. جہاں پہلی بار اس کی مڈبھیڑ عبدالسلام سے ہوئی تھی.

وہ ٹھٹھک گئی. رحمان کی آنکھیں آپ ہی آپ دھیرے دھیرے کھل رہی تھیں. شاید جان بوجھ کر نیند کا بہانہ کئے تھا.

"صبح صبح تم پر نگاہ پڑی. آج کا دن اچھا گزرے گا."

رحمان نے اپنے گال پونچھتے ہوئے کہا یا شاید اس کا منہ چڑایا. وہ شش و پنج میں پڑ گئی. رحمان کی نیند سے بوجھل آنکھیں خمار آلود تھیں. رحمان ہلکی سی نیلا تہہ بند پہنے زیادہ جاذب لگ رہا تھا. وہ فیصلہ نہ کر پائی کہ اسے ڈانٹ دے یا نہیں دے.

"زبان میں تالا پڑا ہے کیا-------؟" رحمان اٹھ کے بیٹھ گیا. اور انگلیوں سے بالوں کو سنوارنے لگا. بال کالے ریشم کے لچھوں کی طرح ملائم تھے. پھولی کا دل چاہا رحمان کے بال اپنی نوکیلی انگلیوں میں الجھا کر جھنجھوڑ دے-----زور زور سے جھنجھوڑ دے

"چائے پی لو......... تیار ہے۔ دیر ہو گئی ہے" پھولی کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"اچھا آتا ہوں......... نہیں......... یہیں لے آؤ" رحمان نے نخرے کرنے شروع کیے اور پھولی جل ہی تو گئی۔

"میں تمہاری لونڈی ہوں کیا..... میں تو ماں کے کہنے سے تمہیں جگانے آئی ورنہ......... " پھولی نے چمک کر کہنا شروع کیا اور رحمان نے ناک سکوڑتے ہوئے بات کاٹ دی "ورنہ کیا کرتی۔ اپنے یہ سوکھے بال نوچتی پھرتی۔ صابون تیل تو برسوں نہیں دیکھا ہے اس سر نے"

"میں بھی سمجھوں ماں کو صابون اور تیل لانے کا کیا مطلب ہے........" پھولی نے بظاہر غصے سے کہا لیکن دل ہی دل میں خوش ہو گئی کہ کوئی تو اُسے صاف ستھرا دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ عبدالسلام نے اُس کے بال یا چہرے کو کبھی دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ تو صرف بدن پر ایسے ٹوٹ پڑتا تھا جیسے کتا ہڈی پر۔

"بال صاف نہیں رکھنے ہیں تو جلا ڈالو..... ورنہ لٹکانے کی کیا ضرورت ہے" رحمان کی بات سن کر پھولی کے تن و بدن میں آگ لگ گئی۔ ذرا ہنس کے دو بول بول دیئے تو سر چڑھ جاتا ہے اب تو گالیوں پر اُتر آیا۔

"چائے پینی ہے تو نیچے آ جاؤ..... یہاں کسی کے نوکر نہیں" پھولی نے سرد لہجے میں کہا اور پیر پٹخ کر دروازے

کی طرف مڑ گئی۔ چشم زدن میں رحمان نے جھپٹا مار کر اُس کے پیر دبوچ لیے۔ اور وہ گھبرا کر دھڑام سے گر گئی۔ ساری ہڈیاں چیخ گئیں اور پیٹ میں درد کا گولہ سا پھٹ پڑا۔ درد کی شدت ناقابل برداشت تھی۔ روکنے کے باوجود اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

پھولی کو روتے دیکھ کر رحمان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ "کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" آواز میں کچھ دیر پہلے کی تیکھی مٹھاس کے بجائے پشیمانی کی کڑواہٹ تھی۔ پھولی کا جی چاہا۔ گالیاں دے، لڑ پڑے، مُنہ نوچ لے۔ کیا سمجھ رکھا تھا اُس کو اِس درندے نے۔ لیکن حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ درد کی شدت سانس کو سنبھلنے کا موقع تو دے۔

"یوں ہی مذاق میں ایسا ہو گیا۔ غلطی ہو گئی۔۔۔۔۔۔" رحمان کی آواز بھرا گئی تھی۔ لیکن سارے الفاظ پھولی کے ذہن میں کٹی پتنگوں کی طرح آوارہ ہو رہے تھے۔ وہ کچھ نہ سمجھ پائی۔ وہ تو پیٹ کے درد سے بے حال تھی۔ ذہن میں اُمڈتی الجھنوں میں سرگرداں تھی۔ اُس کا اندازہ شاید غلط ہے۔ معاملہ واقعی بڑھ چکا ہے۔ اُسے عبدالسلام سے ذکر کرنا چاہیے۔ روز روز یہ بات چھپائی نہ جا سکے گی۔ ماں کو معلوم ہو جائے گا تو زندہ گاڑ دے گی۔ اب کیا ہو گا۔ وہ بے ملاح کے کشتی کی طرح لڑھکتی لڑھکاتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ سیڑھیوں پر کچھ دیر آرام کرنا اُسے ضروری لگا۔

دھیرے دھیرے درد کی شدت کچھ کم ہوئی۔ دھیرے دھیرے

آنکھوں میں اُمڈتی دُھند ہٹنے لگی۔ اور دھیرے دھیرے سانس بھی سنبھلتی گئی۔ پر جی بُری طرح سے متلا رہا تھا۔ سیڑھیوں پر ٹھہرنا شکل آور تھا۔ اپنے سارے اوسان زبردستی یکجا کرتے ہوئے وہ گرتی پڑتی نیچے پہنچ گئی۔ شکر تھا اللہ کا کہ ماں باورچی خانے میں موجود نہ تھی۔ ہوتی تو اُس کے گرنے کی آواز سُن کر اُوپر چڑھ دوڑی ہوتی اور راز فاش ہو جاتا۔ شکر تھا اللہ کا ...... میں نے کانپتے ہاتھوں سے نمکین چائے کا پیالہ بھر لیا اور غٹا غٹ پی گئی۔ جی متلانا بند ہو گیا۔

---

رحمان حیران تھا کہ اِتنی ذرا سی چوٹ پر پھولی کی حالت کیوں غیر ہو گئی۔ شاید عورت ذات بہت نازک ہوتی ہے۔ اور وہ گنوار پھولی کو بھی اپنا جیسا سخت سمجھ بیٹھا۔ لیکن شاید یہ اُس کا قصور نہ تھا بھلا عورت ذات سے پالا ہی کب پڑا تھا۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اُس کی ماں مر گئی تھی اور باپ کے کھردرے مردانہ ہاتھوں نے اُسے پروان چڑھایا ... بجز عورت ذات کے متعلق سوچنا اِس وقت بے فائدہ تھا لیکن بڑھیا کا سامنا کس منہ سے کرے۔ بڑھیا اُسے بیٹے کی طرح پیار کرتی تھی۔ وہ بگڑے گی تو زمین نہ پھٹ جائے گی۔ آسمان نہ ٹوٹ پڑے گا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ دِل کو کیسے سمجھائے۔ پھولی کو دیکھ کر وہ نہ معلوم کیوں بے قابو ہو جاتا ہے۔ سارے وجود پر دہشت سی سوار ہو جاتی ہے، جی چاہتا ہے کہ پھولی کو اپنی گرفت میں پکڑ لے اور ایک ایک ہڈی توڑ دے۔ توڑ کر ...... وہ جھنجھلا اٹھا۔ پھولی کو اُس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ دُنیا بھر سے ہنس بول لیتی ہے۔ اُس سے ہنس کے دو بول کہہ دے تو کون سی آفت آئے گی ... گنوارن ... حرامزادی ... گالیاں دے کر بھی اُس کا ڈر زائل نہ ہوا۔ بڑھیا شاید غصے ہو گئی ہو۔

"چائے بنا رہے ..." پھولی کی آواز آئی اور وہ ٹھٹھک کر راہداری میں کھڑا رہ

گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کون سا قدم بڑھائے، چپکے سے نکل جائے یا سامنا کرے عجیب عورت سے پالا پڑا تھا، ابھی اُس پہ برس رہی تھی اور اب خود ہی چائے پلانے کے لیے بُلا رہی تھی، شاید ڈانٹ دے۔ وہ ہنسی خوشی ڈانٹ برداشت کرے گا۔ خود ڈانٹ دے تو شاید بڑھیا سے شکایت نہ کرے۔ اُس نے قدم باورچی خانے کی طرف بڑھائے۔

ندامت کے مارے اُس کا سر جھکا رہا۔ جلدی جلدی اُس نے روٹی کا ایک چھوٹا ٹکڑا اُٹھا لیا۔ پھولی سے نگاہیں ملانی مشکل ہو رہی تھیں نمکین چائے کا صرف ایک پیالہ پی کر اُس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ بھوک غائب ہو گئی تھی۔

"اور روٹی کھالو ....." پھولی نے پھر ہنسی کی۔ رحمان بوکھلا گیا۔ وہ کچھ جواب دیئے بنا ہی باہر نکل آیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ عورت ذات کو سمجھنے کے لیے اُس میں ذرہ بھر بھی صلاحیت نہیں۔ آنگن میں اُسے پھولی کی ماں ملی۔ اور وہ نگاہیں چُراتے ہوئے کام پر روانہ ہو گیا۔

——— بڑھیا آنگن میں پھیلی کیاریوں میں مُنہمک تھی۔ بینگن کے پودوں میں بڑے بڑے بینگن لٹک رہے تھے۔ وہ ایک ایک بینگن کو ٹٹول رہی تھی۔ جیسے یقین کرنا چاہتی ہو کہ پودوں سے واقعی بینگن لٹک رہے ہیں۔ برسوں بعد تو اُس کا آنگن لہلہا اُٹھا تھا۔ ایک طرف بینگن دکھائی دیتے تھیں تھیں دوسری طرف کدو کی بیلیں اپنا جال پھیلائے، مرچ کی کیاریوں پر پھیلا رکھے ہوئے تھے۔ مرچ کی کیاریاں ہری ہری خوبصورت مرچوں سے بھری پڑی تھیں، کہیں کہیں کوئی لال مرچ اِرد گرد بکھری ہریالی کے بیچ چمکتے ستارے کی طرح لگ رہی تھی۔ کدو کے پودوں میں پیلے پیلے پھول سونے کے کٹوروں کی طرح پھوٹ رہے تھے۔ اور بڑھیا ستاروں اور سونے کے کٹوروں کے بیچ اِتنی مُنہمک تھی کہ اُسے عبدالسلام کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی۔

——— عبدالسلام نے بڑھیا کو دیکھا۔ کیاریوں پر بھرپور نگاہ ڈال

دی اور اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کہ رحمان اس گھر کا ایک فرد بنتا جا رہا تھا۔ کہیں رحمان کا اس گھر میں گھل مل جانا اُس کے لئے نقصان دہ نہ بن جائے۔ پھولی ہاتھ سے نکل گئی تو ... لیکن نہیں پھولی ابھی تھی ہی کیا۔ اُسے رام کر لینا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

"گارڈ بیٹا ..." بوڑھیا نے شاید اُسے دیکھ لیا۔ اور اُسے بڑھیا سے نفرت سی ہو گئی وہ جانتا تھا کہ گارڈ بیٹا پکارنے سے بڑھیا کو برتری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اسلئے ہر کسی موقع پر یہ لفظ استعمال کرنے سے نہیں چوکتی۔ "کیا دیکھ رہے ہو گارڈ بیٹا"

"باغیچہ دیکھ رہا ہوں ماں ..." عبدالسلام نے زبردستی مُنہ پر ہنسی پھیلاتے ہوئے کہا۔ "بہت سبزی اُگ آئی ہے"

"سب تمہاری مہربانی ہے گارڈ بیٹا" بوڑھیا نے اُس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "تم رحمان کو اِس گھر میں کیا لائے۔ مجھے میرا بیٹا لا دیا"

عبدالسلام چوکنا ہو گیا۔ بڑھیا ذہنی طور پر بہت آگے بڑھ آئی ہے۔ اُسے پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ ماں پر جادو کر کے کیا معلوم رحمان کا جادو پھولی پر بھی چل گیا ہو۔ ضرور پھولی پر اثر ہو رہا ہے۔ کچھ دِنوں سے پھولی کے جذبات میں اتنی شدت نہ تھی جتنی پہلے ہوا کرتی تھی۔ اُسے چاہیئے۔ کہ بات بڑھنے سے پہلے تدارک کرے اُس نے بوڑھیا سے کہا۔

"پھولی سے کہنا میں آیا تھا۔ میری ڈیوٹی کا ٹائم بدل گیا ہے۔ سوچا بتا آؤں کہ ڈلر اب کس وقت جانا چاہیئے۔"

پھولی کو ڈلر جانے کی ہدایات دینے کے بہانے وہ پھولی کے گھر بے روک ٹوک جایا کرتا تھا۔ اور اِسی بہانے ملنے کا وقت مقرر کر جاتا۔

"کہہ دوں گی گارڈ بیٹا ..." بوڑھیا نے کہا "چلے کہاں ... چائے تو پی جاؤ"

"نہیں ماں ... دیر ہو رہی ہے۔ کھلیان تک جانا ہے۔ پھر دفتر جانا ہے۔"

عبدالسلام لفظ کھلیان پر زور دے کر واپس جانے کو مڑا۔ اور بڑھیا کسی مسکین بھکارن کی طرح جس کو کسی نے ایک روپیہ خیرات دی ہو ہاتھ اٹھا کر دعائیں دینے لگی۔ "تم پر رحمت خدا کی ... تم ہزار برس جیو ......"

گاؤں سے کافی دور کھیتوں کے بیچ زمین کا ایک چھوٹا سا چوکور قطعہ تھا۔ ارد گرد ہریالے کھیتوں میں وہ مٹیالے جزیرے کی طرح لگتا تھا۔ اور بہت اچھا لگتا تھا۔ فصل کاٹنے کے موقع پر یہ قطعہ سارے گاؤں کا کھلیان بن جاتا۔ قطعے کے ارد گرد چنار کے درخت تھے۔ درخت اتنے گھنے تھے کہ تیز بارش میں بھی زمین نہ بھیگ پاتی تھی۔ چناروں کی ٹہنیاں جالی کی طرح اس قطعے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ چنار کی جڑوں نے بھی کہیں کہیں زمین سے سر اُبھار کر کھلیان کے بیچوں بیچ جالی سا بُن دیا تھا۔ جس کے تانے بانے میں گاؤں کے بچے اپنا مخصوص کھیل "پھماٹھ پکڑو" کھیلا کرتے تھے۔ اور بڑے بوڑھے چنار کے تنوں سے ٹیک لگائے دُکھ سُکھ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن آج کوئی بچہ کوئی کھیل نہ کھیل رہا تھا۔ نہ ہی کوئی بڑا بوڑھا چنار کے تنے سے پیٹھ لگائے سستا رہا تھا۔ اِس سال ارد گرد پھیلے کھیتوں میں فصل گرتی بارش سے اُلجھ رہی تھی۔ اور خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اِس لئے سبھی گاؤں والے اِس کھلیان سے بے خبر گاؤں کے مضافات میں سرگرداں تھے کہ کہیں

سے کچھ کام ملے تو وہ سردیاں گذارہ سکیں۔ فصل ہونی ناممکن تھی۔ اور کھلیان سُونا پڑا تھا۔ کھلیان کے چاروں طرف پھیلے ماحول پر وحشت سی طاری تھی۔ لیکن عبدالسلام اس وحشتناک ماحول سے بے پرواہ ایک چنار کی اُبھری جڑ پر بیٹھا پھُولی کا انتظار کر رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیوں کو بھُلانے کے لئے وہ ایک ٹہنی سے جوتے کو صاف کرنے میں مگن تھا۔ جوتوں سے منوں کیچڑ چمٹ گئی تھی۔ کھیتوں کی منڈیر کے بغیر اِس قطعے پر آنے جانے کے لئے کوئی مخصوص راستہ نہ تھا۔ اور بارش نے منڈیروں کو اتنا خستہ حال بنا دیا تھا کہ عبدالسلام کے پیر کئی دفعہ منڈیر پر سے پھسل کر کھیت کی کچی گیلی مٹی میں دھنس گئے تھے۔

شاید ایک گھنٹہ ہو گیا تھا عبدالسلام کو کھلیان پر آئے ہوئے۔ یا شاید دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ وہ اندازہ نہ لگا سکا۔ کیونکہ کھلیان پر پھیلے چنار کے پتوں سے سورج اچھی طرح سے نہ دکھائی دیتا تھا۔ کاش یہ بارش رُک جائے تو کھلیان میں آنے کے بجائے ڈلر کے کناروں پر پھُولی سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ جہاں پر کسی کی کُریدتی نگاہیں نہ پہنچ پاتی تھیں۔ کھلیان میں آکر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر چنار ہر چنار کی ہر جڑ غیر مرئی نگاہوں سے اُس کی ہر ایک حرکت کو جانچتی رہتی ہو۔ جی تو چاہا واپس چلن دے۔ پھُولی سے آج ملاقات نہ ہوئی تو نہ سہی کبھی اور سہی۔ لیکن بدن ذہن کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہوا۔ آج اُسکے بدن کو پھُولی کی ضرورت تھی۔ بڑی سخت ضرورت تھی۔ پھُولی کے بدن میں وہ سب دُکھ اور جلن بھُلا دینا چاہتا تھا۔ دفتر میں بڑے صاحب کے ساتھ جھگڑے نے خطرناک صورت اختیار کی تھی۔ راز ایک ایک

کر کے اتنا ہو رہے تھے۔ دفتر کے آدمیوں کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ پوری چھپے کئی اسامیوں سے روپے بٹور رہا ہے۔ اور دفتر والوں کا حصہ صاف ہڑپ کر جاتا ہے۔

عبدالسلام کو اعتراف تھا کہ ساتھیوں سے دغا کر کے وہ بہت بُرا کر رہا ہے۔ لیکن حالات کچھ ایسے تھے جن کے سامنے وہ بے بس تھا۔ شہر میں بیوی بچوں کو خرچ بھیجنا پڑتا تھا۔ یہاں اپنا گھر چلانا پڑتا تھا۔ اور کبھی کبھی ماں کی بھی مدد کرنی پڑتی تھی۔ مکان کے کرائے پر ہی تنخواہ کا ایک بہت بڑا حصہ اُٹھ جاتا تھا۔ اتنا خرچ آئے تو کہاں سے آئے۔ گذر کرنی مشکل ہو رہی تھی۔ وہ جوتا تک نہ خرید پایا جوتے کی ایڑھی گھِس گھِس کر ختم ہونے کو آئی تھی۔ کہیں کہیں سلائی بھی اُدھڑ گئی تھی۔ اُسے محسوس ہوا سونے داری آکر وہ بھی اس جوتے کی طرح گھِسا جا رہا ہے۔ اُس کے ذہن کی سلائی بھی اُدھڑ رہی ہے۔ وہ اپنے آپ سے لاپرواہ ہوتا جا رہا ہے۔ اُسے چاہیے کہ جوتے صاف کر کے گھر واپس لوٹ پڑے۔ اب اور انتظار بے کار تھا۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ جوتے صاف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گھر پر دسوں ہانجی ماہی گیر اُس کے جوتے صاف کرنے کے لئے ترستے رہتے تھے۔ واقعی جوتے صاف کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لوٹتے وقت پھر کیچڑ میں لتھڑ جائیں گے۔ مچھلی آئی نہیں اب تک کہیں مچھلی اُسے بھی کسی پرانے جوتے کی طرح نہ بھلا بیٹھی ہو۔

اُس نے سر اٹھا کے گاؤں کی طرف دیکھا۔ اُس کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔ کچھ لی کھیت کی منڈیروں پر قلانچیں بھرتی آرہی تھی مچھلی کی تیزی دیکھ کر وہ حیران سا ہو گیا بھلا مچھلی جیسی چکنی لہر اُس کے قابو میں کیونکر

آ گئی۔ کیسے اُس کے بڑھے بدن کی گرویدہ ہو گئی کنپٹیوں کے پاس بال سفید ہو چکے تھے۔ جوانی اور بڑھاپے کا میل کیسا نکھر رہا تھا۔ شاید سنگھار زدے کے تجھ والوں کے لئے یا شاید کچھ روپہیوں کی چمک سے۔۔۔۔ پھپھولی اور اُس کی قیمت۔۔۔۔۔۔ یا بڑھاپا اور اُس کی قیمت۔۔۔۔۔ اُس نے اپنی سوچ کو لگام دی۔ پھپھولی آ رہی تھی۔ یہی کافی تھا۔ اُس کے اشاروں پر پھپھولی کا ناچنا ہی بہت تھا۔ جی چاہا۔ دوڑ کے جائے اور پھولی کو گود میں اٹھا لائے۔۔۔۔ اب رُکا نہ جاتا تھا۔

پھپھولی پاس پہنچ گئی۔ ہانپتے ہانپتے وہ بے حال ہو گئی تھی۔ چہرہ لال سُرخ ہو گیا تھا۔ بال کی لٹیں ماتھے پر آ رہی تھیں۔ اور سینے کا زیر و بم قیامت خیز تھا۔ عبدالسلام پر سکتہ طاری ہو گیا۔ فرط جذبات سے اُس کے ہاتھ پیر سُن ہو گئے۔ مُنہ کھولے وہ بیوقوفوں کی طرح حُسن کے اِس پیکر کو دیکھتا رہا۔

پھپھولی بہانے بنا کر یہاں پہنچ پائی تھی۔ رحمان نے آنگن میں باغ کیا لگایا تھا جیسے بُڑھیا کی ویران زندگی کو باغ بنایا تھا۔ بڑھیا بیٹی کو موقعہ بے موقعہ بھیجتی۔ کبھی نلائی کرنے کو کہتی۔ اور کبھی گوڑائی کرنے پر مجبور کرتی۔ آج بڑھیا مرچ جمع کرنے کی دُھن میں تھی بڑھیا کا اصرار اتنا زیادہ تھا کہ وہ رُک سکتی تھی پر آج وہ عبدالسلام سے ملے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ کہیں عبدالسلام انتظار سے اُکتا کر واپس نہ جائے اس لئے پیٹ میں درد کے باوجود وہ دوڑ لگانے پر مجبور ہو گئی۔ اور پیٹ میں جیسے کوئی اُودھم مچا رہا تھا۔

"میں تو ڈر گئی تھی کہ تم سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ مرچیں اکٹھا کرتی تھی۔ بڑے بہانے بنا کے آئی ہوں ۔ ۔ ۔ تم کو زیادہ انتظار ۔ ۔ ۔ ۔" پھولی رُک گئی۔ عبدالسلام اُسے ایک ٹک گھورے جا رہا تھا۔ عبدالسلام کے دیکھنے کا انداز اتنا تیز تھا کہ وہ سکڑ سی گئی۔

"کیا بات ہے ۔ ۔ ۔ ۔" اُس نے شرما کر پوچھا۔ عبدالسلام سے کوئی جواب نہ پا کر اُس نے پھر عبدالسلام کو بانچا۔ عبدالسلام کی آنکھیں وفورِ جذبات سے پھٹنے کو آئی تھیں۔ منہ کھلنے کا انداز نتھنوں کی پھڑپھڑاہٹ اور گھورتی پھیلتی آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے وہ اُسے کھا ہی جائے گا۔ شاید اُسے آج کچھ ہو گیا تھا۔ یا شاید عبدالسلام کو روز ہی کچھ ہو جاتا تھا۔ اور وہ خود اندھے جذبات میں بہہ کر کچھ نہ دیکھ پاتی تھی۔ پر آج خود جذبات سے عاری اُسے عبدالسلام اپنے اصلی رنگ میں نظر آیا۔ عبدالسلام کے انگ انگ میں گھناؤنی کثیف ننگی ناچ رہی تھی۔ اور وہ مکروہ سا لگ رہا تھا۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت سی ہو گئی۔ یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ سامنے کھڑے شخص سے پیار کرتی ہے۔ اُس کی ہر حرکت پر اپنے آپ کو لُٹانے کے لئے تیار رہتی ہے۔ اُس کی ہر جنبش، ہر خواہش میں مقید ہے۔ جی تو چاہا چپکے سے واپس چلی جائے۔ لیکن پیٹ میں درد کی ٹیسیں بار بار اُٹھ رہی تھیں۔ اُسے دوڑ نہ لگانی چاہئے تھی۔ کہیں راستے میں گر جاتی تو عبدالسلام سب کچھ سمجھ جاتا۔ اور وقت سے پہلے راز افشا کرنا اُسے منظور نہ تھا۔ اِسی لئے اُس نے

نفرت کے باوجود کہا۔

"یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو جی ...."

"پھولی کے لہجے نے عبدالسلام کو چونکا دیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ شاید بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ ورنہ یوں بے قابو ہو کر پھولی کے سامنے بے جان نہ رہتا۔ بلکہ پھولی کو پاس پاتے ہی لپٹ پڑتا۔ پیار شروع کرتا۔ پیار ہی تو ایک گُر ہے عورت کو قابو میں رکھنے کا۔ شاید بڑھیا نے پھولی کو ڈانٹا بھی ہے۔ پھولی کا چہرہ کچھ اوداس سا تھا۔ بڑھیا زیادتی کر رہی تھی۔ ویسے رونے سے پھولی کی آنکھیں مسنے کیوڑوں کی طرح ابھر آئی تھیں۔

"آؤ .... آؤ .... آؤ بیٹھو ...." عبدالسلام نے کہا اور چبار کی جڑ پر بیٹھ گیا۔ پھولی اُس سے ذرا دور بیٹھ گئی۔ عبدالسلام سے پھولی کا دور بیٹھنا چھپا نہ رہا۔ پھولی ناراض ہے کسی بات پر۔ پھولی کو منانا پڑے گا۔ منانے میں وقت گزرتا ہے اور اُسے دفتر پہنچ کر صاحب کے سامنے پیش ہونا تھا۔ آج اُس کی پیشی تھی۔ کیا معلوم صاحب تبدیل کر دے یا نوکری سے نکال دے۔ وہ پریشان ہو گیا۔

کیا بات ہے۔ آج تم پھر روئی ہو۔۔ کیوں" اُس کی آواز بھی پریشانی سے لبریز تھی۔

"میں روئی نہیں۔ چولہے کا دھواں آنکھوں میں گھس گیا اور آنسو نکل آئے" پھولی کے لہجے میں دھوئیں کی کڑواہٹ تھی۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو ......" عبدالسلام نے بے اعتیاری

ظاہر کی اور ذرا نزدیک آ کے بیٹھ گیا۔

"پھولی نے چاہا۔ اُٹھ کے ذرا دور بیٹھ جائے۔ آج عبدالسلام کا قرب وحشتناک لگ رہا تھا۔ لیکن عورت کی مخصوص دور اندیشی نے اُس کے مشتعل جذبات کو بجھا دیا۔ اُسے عبدالسلام کا ردعمل دیکھنے کا انتظار تھا۔ اپنے لہجے کو زبردستی معمول پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں روئی نہیں۔ تمہیں وہم ہو گیا ہے۔"

"پھر آج تم چپ چپ کیوں ہو......" عبدالسلام پاس آ کر بیٹھ گیا اور اس کی پیٹھ پر ایسے ہاتھ پھیرنے لگا جیسے بدکتے ہوئے گھوڑے پر پھیرا جاتا ہے۔ جذبات کی شدت سے اُس کا سارا ہاتھ تھرتھرا رہا تھا۔ پھولی کی قربت اُسے پاگل کر دیتی تھی۔

"کچھ خاص باتیں کرنی ہیں......" پھولی نے کہا۔ اب کے اُس کی آواز معمول پہ آ گئی تھی گو عبدالسلام کا لمس بڑا کریہہ لگ رہا تھا۔

"بولو.... جلدی بولو.... بولو نا...." عبدالسلام کی آواز شدت جذبات سے لڑکھڑانے لگی۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے اُس نے پھولی کو اپنی طرف کھینچا۔

جب کبھی عبدالسلام کا منہ پھولی کو اپنی گردن کی طرف آتا محسوس ہوتا تو گرم گرم سانس کے بھبکے گردن پہ کیڑوں کی طرح رینگتے محسوس ہوتے۔ اور عجیب سی جھرجھری کا احساس پیدا کرتے تھے۔ جھرجھری میں عجیب سی لذت محسوس ہوتی اور وہ بے قابو ہو جایا کرتی تھی۔ بے قابو ہو کر وہ منہ پھیر کر عبدالسلام کی طرف جھک جایا کرتی تھی سارا ماحول

رینگتا محسوس ہوتا... پھیلتا محسوس ہوتا۔ اور اُس کا سارا وجود پھیلتے پھیلتے لذت کی میٹھی کڑوی لہروں پر ڈوبنے لگتا۔ ڈوبتے ڈوبتے ڈوبنے لگتا۔ تب کہیں ماحول رینگنا بند کر دیتا تھا۔ اِرد گِرد کائنات کے خد و خال ٹھہر جاتے تھے۔ اور اُس کے سارے وجود پر تھکن اور تسکین سی مسلط ہو جاتی تھی۔ لیکن آج عبدالسلام کا منہ پاس آتے محسوس کر کے اُسے جھرجھری تو آئی لیکن جھرجھری میں لذت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ ساری لذت شاید سمٹ کر پیٹ میں درد بن گئی تھی۔ اور وہ عبدالسلام کی طرف منہ پھیر نہ سکی۔

عبدالسلام متحرک گیا۔ اس کی ہلکی سی خواہش پھپھولی کے وجود میں تلاطم پیدا کرتی تھی۔ اتنا تلاطم پیدا کرتی تھی کہ کئی بار وہ خود گھبرا گیا تھا۔ لیکن آج پھپھولی بالکل مردہ تھی۔ کہیں وہ واقعی بوڑھا تو نہیں ہو رہا ہے۔ غیر ارادی طور پر اُس نے اپنا ہاتھ پھپھولی کی پیٹھ سے جدا کیا اور ہاتھ کی پیٹھ پر جھریاں تلاش کرنے لگا۔ پھپھولی کو موقعہ مل گیا وہ کھسک کر ذرا الگ بیٹھ کر بولی۔ "تم نے کہا تھا۔ مجھ سے شادی کرو گے...؟"

"ہاں... ہاں..." عبدالسلام کے دل سے جیسے بڑا بھاری بوجھ سرک گیا۔ تو یہی غم پھپھولی کو کھائے جا رہا ہے۔ بدھو کہیں کا۔ ذرا سی بے اعتنائی پر گھبرانے لگا۔ ہاتھ پر تو جھریوں کا نام و نشان نہیں اتنے مضبوط تھے کہ لوہے کو بھی توڑ مروڑ دیں۔ "میں نے شادی کا اقرار کیا ہے۔"

عبدالسلام نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کا ذہن پھپھولی کے

پریشان بالوں میں ڈھکی چھپی گوری گردن سے پھسل کر بھوری کے پھرن میں گھس جانا چاہتا تھا۔

"چار مہینے ہونے کو آئے۔ اب اور کتنی دیر انتظار کرنا ہوگا" بھوری نے اپنی حرالیشت میں واضح کیا۔ لیکن عبدالسلام کا آوارہ ذہن بھوری کے پریشان بالوں میں بدستور اُلجھا رہا۔ "بھوری مجھ پر بھروسہ رکھو" عبدالسلام کے ہاتھ بے قابو ہوتے جا رہے تھے۔

"بھروسہ تو ہے۔ تبھی تو پوچھ رہی ہوں۔" بھوری نے تکرار جاری رکھی اور عبدالسلام کا ذہن کچھ کچھ سنبھل گیا۔ بھوری آج واقعی بدلی بدلی سی تھی۔

"نہیں کچھ اور بات ہے۔ ورنہ تم یوں کرید کرید کر نہ پوچھتی" عبدالسلام نے بےزاری ظاہر کی۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔۔۔ لیکن تم طلاق تو دو بیوی کو۔ اب انتظار نہیں سہا جاتا۔" بھوری گھوم پھر کر پھر اُسی نکتے پر آگئی۔ آج وہ کسی طور فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔

"تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔ آج سیدھے منہ بات نہیں کرتی ہو۔ ضرور کوئی اور وجہ ہے" بات کی ہیرا پھیری نے عبدالسلام کو بدکا دیا۔

"کہہ تو دیا کوئی بات نہیں۔ تم بات کو ناحق اُلجھاتے ہو۔" بھوری کو بھی غصہ آگیا۔ گھر پر ماں کی ڈانٹ سنو اور گھر سے باہر عبدالسلام کی۔ وہ بھلا کتنا برداشت کرتی رہے گی۔ جیسے وہ انسان نہ تھی مٹی کا ڈھیلا تھی کہ جس نے چاہا ٹھوکر لگا دی۔ لیکن ڈھیلا غصے میں

حسین ہو تا جا رہا تھا۔

"میں کہہ دوں ..." میں کہہ دوں" عبدالسلام سے رہا نہ گیا۔ غصے میں پھولی حسین لگتی ہو تو اُس کی بلا سے۔ اگر پھولی اُس پر وار کرنے سے نہیں چوکتی تو وہ بھی چوڑیاں پہنے نہیں بیٹھا تھا۔ اُس نے بھی وار کیا۔

"تم کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں منانی ہو۔ اسی لئے آج مجھ سے فیصلہ کرنا چاہتی ہو۔" آواز میں اتنا تیز طنز تھا جیسے پھولی کے وجود کے پرخچے اڑانا چاہتا ہے۔

پھولی کو یکایک محسوس ہوا کہ اُس کے پیٹ میں درد کی بڑی تیز ٹیس اُبھری شاید پیٹ سکوڑنے سے یا شاید عبدالسلام کی باتوں سے۔ باتیں نہ تھیں۔ نشتر تھے۔ فیصلہ کرنے کی مہلت نہ تھی۔ درد کی شدت چہرے پر اُبھر آئی۔ اور عبدالسلام کو پھولی کے چہرے نے یقین دلایا کہ وار ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ پھولی ضرور کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہے۔ اُس نے اپنے شک کو الفاظ کے جامے میں ڈھال لیا۔

"رحمان ہے تو گلا گھونٹ دوں اُس کا۔ میں نے اُسے کھلایا پلایا ... اپنے ساتھ رکھا۔ ہزار طرح سے مدد کی اُس کی؟"

"نہیں ... نہیں ... تم غلط سمجھے ... غلط سمجھے ..."

پھولی کے منہ نے بمشکل عبدالسلام کے منہ کو لمحہ بھر کے لئے روک لیا۔ سنبھلنے کا وقت تو ملے۔

عبدالسلام پھر اٹھا۔ کسی نے ٹھیک کہا تھا کہ عورت کو اپنے پیر کی جوتی سمجھ لو۔ ذرا ڈھیل دی تو ہاتھ سے نکل گئی۔ اُس نے دل کی بھڑاس نکالنی شروع کی۔

"یہی بدلہ دینا تھا میرے احسانوں کا۔ تمہارے لئے میں نے بیوی کو چھوڑا۔ بچوں سے غافل ہوا۔ دفتر کے ساتھیوں سے دھوکہ کیا۔ تمہاری وقت بے وقت مدد کی۔ کیا اس لئے کہ تم اوروں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی پھرو۔۔ بولو... جواب دو... بولو۔ میں پوچھتا ہوں؟۔۔۔۔"

پھولی سے اور نہ سہا گیا۔ عبدالسلام کافی آگے بڑھتا جارہا تھا۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ کاش پیٹ کا درد کچھ کم ہو تو سانس سنبھالنے کا موقعہ ملے۔ کمینہ ہے عبدالسلام۔ حرام زادہ ہے عبدالسلام۔ موچھیں اُکھیڑلوں اس کی یا آنکھیں نوچ لوں۔ وہ مررہی تھی اور یہ کتیا کا بچہ.... حرامی کا پلا الزام دیئے جارہا تھا۔ کاش جس کے پیٹ میں اس درندے کے بچے کی بجائے رحمان کا بچہ ہوتا کاش وہ رحمان سے رنگ رلیاں مناتی.... کاش.... اُسے اُبکائیاں سی آنے لگیں۔ کہیں قے نہ ہو جائے۔ قے ہو گئی تو اُس کی صورت مضحکہ خیز ہو جائے گی۔ نہیں... اُسے قے نہیں کرنی چاہئے اُسے قے روکنی چاہیئے۔ عبدالسلام کے سامنے سربلند رکھنا چاہیئے سر بلند رکھ کے عبدالسلام سے بے روک ٹوک آنکھیں ملانی چاہئیں۔ وہ زر خرید لونڈی نہیں۔.... پر یہ حرامی.... یہ کتیا کا بچہ... زبان تو روک لے۔ اُس کو سنبھلنے کا موقعہ تو دے۔

تم سمجھتی ہو۔ میں ناراض ہو کر تمہیں چھوڑ دوں گا۔ اس لئے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہو تو سُن لو میرا فیصلہ۔ تم اگر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر بھی جاؤ تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ ایک سوکھی ہڈی کی طرح بھنبھوڑتا رہوں گا چاہے میرے جبڑے کیوں نہ زخمی ہوں۔ سمجھی ..... تم مجھ سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکو گی۔

عبدالسلام پاگل ہو رہا تھا اُس نے بھوُلی کو کندھوں سے پکڑ کر بُری طرح سے جھنجھوڑ دیا۔ بھوُلی کی چیخ نکل گئی۔

"تم کُتے ہو..... کتیا کے بچے ہو۔۔ تم حرامی..... تم ..... تم....."

بھوُلی کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ غُصے کے مارے اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ دونوں ہاتھ عبدالسلام کے چہرے کی طرف بڑھے جیسے عبدالسلام کو نوچنا چاہتی ہو۔ توڑنا چاہتی ہو۔ مسلنا چاہتی ہو۔ نفرت کی یلغار نے اُس کے چہرے کو ہیبتناک بنا دیا۔ عبدالسلام ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔ بھوُلی عورت نہیں تھی کوئی ڈائن تھی وہ تو شکر تھا اللہ کا کہ خود ہی بے دم ہو کر گر گئی۔ ورنہ نہ معلوم کیا ہوتا۔ شاید اس پر جھپٹ پڑتی۔ یا شاید چیخ چیخ کر سارے گاؤں کو اکٹھا کر دیتی۔ اِن مال زادیوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اُسے محسُوس ہوا کہ کھلیان میں اُس کا اور رُکنا خطرے سے خالی نہیں۔ کسی بھی وقت گاؤں کی نگاہیں اُن کو ٹٹول سکتی ہیں۔ اُس نے جوُتے ہاتھ میں اٹھائے۔ جوتے کیچڑ میں لتھڑنے سے کوئی فائدہ نہ تھا اور جوتوں کے بغیر وہ جلدی سے اِس کھلیان سے دور پہنچ

سکتا ہے۔ اُس نے آخری دفعہ کھپولی کی اور دیکھا جو جڑ سے نیچے زمین پر مری پڑی تھی۔

عبدالسلام کا دل نہ چاہتا تھا کہ کھپولی کو چھوڑ دے۔ کھپولی سے قطع تعلق کرے۔ سونہ واری کی ویران زندگی میں یہی ایک دل بہلاوے کی چیز تو میسّر ہوئی تھی۔ جس کے سہارے دن بیت رہے تھے۔ لیکن وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ کھپولی اُس کے چنگل سے نکل کر کسی اور کے ہتھے چڑھ جائے۔ کھپولی بھی ایک ایسی اسامی تھی جیسی دوسری اسامیاں۔ اور اپنی اسامیوں کو کسی حالت میں بھی دوسروں کے ساتھ مل بانٹنے کا قائل نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کھپولی اُس کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتی ہے۔ سنگھاڑے اکٹھے نہ کر سکے گی تو کھائے گی کیا۔ اِس سال تو زمین والوں کے پاس فصل نہیں۔ بے زمین تو بے موت مارے جائیں گے۔ نہیں ... بلکہ ڈوب جائیں گے۔ جدھر دیکھو پانی کے تالاب اُبھر رہے تھے۔ پانی اِس زمین کو چھوڑ کر جانے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ واقعی عجیب زمین تھی یہاں کی۔ آدمی کی جڑ کھوکھلی کر دیتی ہے۔ خود اُس کی جڑ کھوکھلی ہو گئی ہے۔ صاحب ناراض ہے۔ پندرہ برس کی نوکری ڈانواڈول ہے بتاؤ لہ کرے تو غنیمت ہے۔ اُسے یاد آیا کہ صاحب نے اُسے دس بجے دفتر بلایا ہے۔ اُس نے دیر کرنی مناسب نہ سمجھی اور گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

دفعتاً کھپولی چلائی "بھاگ کہاں رہے ہو۔ ٹھہرو۔" کھپولی کی چیخ میں اتنی تیز گونج ... گھبرا کر اُس کے قدم رک گئے کھپولی

یوں چیختی رہی تو گاؤں پہنچنا محال ہے۔ شاید ایسے ہی موقعوں پر کسی کی جان لینے کا خیال ذہن میں اُبھرنے لگتا ہے۔ وہ ٹھٹھک گیا۔

"گاؤں والوں کو پتہ چلے گا تو تمہاری بوٹی بوٹی اڑا دیں گے!"

پھولی بڑی خوش ہوئی۔ اس کا حربہ ناکام نہ رہا تھا گاؤں والوں کا نام سُن کر عبدالسلام کے چہرے پر وحشت کی پرچھائیاں چھانے لگیں اور اُس کے قدم واپس لڑکھڑانے لگے۔

"کیا کہو گی گاؤں والوں سے......" عبدالسلام کسی درندے کی طرح قدم تول تول کے اٹھا رہا تھا۔

"کہہ دوں گی...... کہہ دوں گی" پھولی کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ شرم کے مارے اس کا چہرہ لال سُرخ ہو گیا۔

"ہاں ہاں۔ بھلا میں بھی سنوں کیا کہہ دو گی گاؤں والوں سے" عبدالسلام کے اعضا غیر ارادی طور پر تن سے گئے۔ وہ شاید باز تھا اور سامنے زمین پر ڈھیری پڑی پھولی ننھی سی چڑیا لگ رہی تھی۔ جس کو باز کی تیز آنکھوں نے مسحور کر رکھا تھا صرف جھپٹ پڑنے کی دیر تھی۔

پھولی کو عبدالسلام کے سپاٹ لہجے سے چڑ سی گئی۔ بھلا شرم و حیا کب تک ساتھ دے گی۔ شرم تو اُسی دن مٹی میں مل گئی تھی جس دن وہ اپنے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوسری دفعہ ڈھیر کے کنارے گئی تھی۔ ڈھیر کے کنارے پڑے رومال کا حشر دیکھنے گئی تھی۔ یا شاید اپنا حشر دیکھنے گئی تھی۔ اب شرمانے سے فائدہ! چپ رہی تو عبدالسلام پر قابو نہ کر سکے گی۔

"کہہ دوں گی"

عبدالسلام کا بدن تن گیا۔

"کہہ دوں گی کہ تمہارا ....."

عبدالسلام کی نگاہوں نے فاصلہ جانچ لیا۔

"کہہ دوں گی تمہارا بچہ میرے پیٹ میں ہے۔"

عبدالسلام کا توازن بگڑ گیا بدن تھرتھر کانپنے لگا سارے بدن سے پسینے کے آن گنت سوتے پھوٹنے لگے۔

"جھوٹ ..... جھوٹ ....." اس کا منہ بے اختیار ہو گیا پھولی جھوٹ کہہ رہی ہو گی۔ جھوٹ کہہ رہی ہو گی۔ ماں زادی... حرام زادی... کاش اُس کے ہاتھوں میں سکت پیدا ہو۔ کاش اُس کی ٹانگوں میں طاقت آ جائے... کاش وہ آگے بڑھ کر پھولی کا منہ دبا سکے .... کاش ....

"یقین نہیں آتا ہے تو ٹٹول کے دیکھ لو" پھولی نے اُسے بوکھلا دیا۔ اُس کا سارا وجود ٹوٹ سا گیا۔ کہاں سہمی سمٹائی۔ شرمائی سی چڑیا جو اس کے ہاتھوں میں جُڑ جُڑ کر ٹوٹ جایا کرتی تھی اور اب یہ سامنے بیٹھی ناگن ..... زہریلی سی ..... پھنکاریں مارتی ہوئی ناگن۔ وہ لاکھ انکار کرے کہ یہ بچہ اُس کا نہیں۔ لیکن ایک عورت کے سامنے اُس کے انکار کی کوئی وقعت نہیں۔

کھلیان کے بیچوں بیچ بظاہر وہ تولے باز کی طرح کھڑا تھا اور پھولی ننھی منھی چڑیا کی طرح اُس کے پاؤں کے پاس ڈھیری پڑی تھی۔ لیکن اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ در اصل پھولی باز کی طرح

کھڑی ہے اور وہ خود بے بس چڑیا کی طرح پھولی کے سامنے رحم کا طلبگار ہے۔ جال کس گیا تھا۔ ہاتھ پیر مارے تو شاید اور اُلجھ جائے۔ اُسے احتیاط سے قدم بڑھانا چاہیئے۔ اُس نے پینترا بدل دیا۔"

"تو یہ بات ہے جس کی وجہ سے تم اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہی تھی" وہ دوزانو بیٹھ گیا "میں بڑا بے وقوف ہوں جو تمہیں رُلا دیا۔"

"میں یقین کرنا چاہتی تھی کہ تم شادی کرنے پر تیار ہو کہ نہیں" پھولی نے بمشکل جواب دیا۔ کاش اس کتّے کے ساتھ اُس کے تعلقات نہ ہوتے۔ ابھی دھتکار رہا تھا اور اب محبت جتا رہا ہے

"میں تیار ہوں۔ تمہارے بغیر میرا جی نہیں لگتا پھولی۔" عبدالسلام نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا اور پھولی کسمسا کر رہ گئی۔ چرب زبانی کی بھی حد ہوتی ہے۔

پھولی کے چہرے پر ابھی آنسو کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ پتوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی سورج کی کرنوں میں قطرے موتیوں کی طرح چمک اُٹھے۔ عبدالسلام کے جذبات دہکنے لگے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کے آنسو پونچھنے چاہیئے۔ پھولی نے اُسے روکا "تم جھوٹ کہہ رہے ہو....."

"نہیں سچ.... تمہاری قسم" عبدالسلام نے کہا لیکن وہ سوچ رہا تھا۔ دفتر کا بڑا صاحب ناراض تھا۔ تبادلہ تو ضرور کرے گا۔ پھر پھولی اُس کی گرد بھی نہیں پا سکتی۔ بہلاتا رہے۔ کچھ دن پھولی کو تو کوئی

راہ نکل ہی آئے گی ۔ اب تو ناراض نہیں " عبدالسلام نے ہاتھ بڑھانا شروع کیا

" نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ " پھوپی نے رُکھائی سے کہا ۔ کیا فائدہ ناراض رہنے سے شادی کے بعد دن اِسی شخص کے ساتھ گذارنے تھے ۔ لیکن پھوپی نے اُس کے ہاتھ کو روکا ۔ طبیعت خراب تھی ۔ دل بھی افسردہ تھا سارے جذبات مر سے گئے تھے " دیر ہو رہی ہے ۔ اب میں چلوں ۔ ۔ "

" تو تم اب بھی مجھ سے ناراض ہو ۔ ۔ ۔ " عبدالسلام نے مصنوعی غصّے کا اظہار کیا ۔

" نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ " پھوپی نے ہتھیار چھوڑ دیئے ۔ کہیں اُس کی سرد مہری محسوس کر کے عبدالسلام پھر نہ بدھک جائے ۔ چیخ چلا کے تو مشکل سے بھرنے پر مجبور کیا تھا اب کے چھوڑ جائے تو وہ گاؤں والوں سے بھی فریاد نہیں کر سکتی ۔ نہ ہی کسی اور سے کہہ سکتی ہے ۔ رُکھائی دکھانے سے سارا کیا دھرا چوپٹ ہونے کا خطرہ تھا اور پھوپی نے سوچا ۔ ۔ مرد بڑے کمینے ہوتے ہیں ۔ عورت کی جان پر بن آئے ۔ اِن کو اپنے مطلب سے کام ہے ۔ ایک تو مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اُوپر سے دھونس جماتے ہیں ۔ ۔ ۔ اُف ۔ ۔ ۔ عورت ہونا بہت مشکل ہے ۔ ۔ ۔ بہت مشکل ۔ ۔ ۔

---

رحمان اندھا دھند پھاوڑا چلا رہا تھا۔ مٹی بارشوں نے نرم کی تھی اس لئے آسانی سے کٹ رہی تھی۔ لیکن پھاوڑے سے چمٹ جاتی۔ پھاوڑا بھاری ہو جاتا اور وہ کام روک کر پھاوڑے کو کوستا۔ پھاوڑے کو کوستے کوستے ساری دنیا کو کوسنے لگتا۔ پھاوڑے کو جھاڑتا اور جھاڑ کر اپنے گھٹنے کے ساتھ کھڑا کرتا۔ تاکہ پھاوڑا زمین پر نہ گر جائے اور جھک کر نہ اٹھانا پڑے۔ جھکنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ کمر اکڑ کر دہری ہو گئی تھی۔ بدن کا زاویہ ذرا اور تیکھا ہو جائے تو سنبھلنا مشکل تھا۔

صبح سے وہ لگاتار پھاوڑا چلاتا آیا تھا۔ اور مزدور حیران تھے کہ یہ شہر کا آدمی جو اس کام سے بالکل مانوس نہ تھا اور نہ ہی کبھی اس کام کو اُن کی رفتار کے برابر کر سکا تھا۔ آج دم لئے بغیر کیوں کر کسی دیو کی طرح کر رہا ہے۔ مٹی کے ٹیلے میں رحمان نے صبح سے مٹی کھود کھود کر ایک لمبی سرنگ سی بنا لی تھی۔ سرنگ کے مکھیے میں اُس کی ننگی گوری پیٹھ بجلی کی طرح چمک جاتی۔ بیچ والے مزدور ٹوکریاں بھرتے

پاتے تھے کہ نئے سرے سے کھدی مٹی کا ڈھیر اُن کے سامنے آ گرتا اور ٹوکری والے مزدور مٹی سے بھری بڑی ٹوکریاں تعمیر ہوتے ہوئے بنڈ پر مشکل ہی سے ڈال آتے تھے کہ اور ٹوکریاں بھری ہوئی رکھی ہوتی تھیں۔ بیچ والے مزدور اور ٹوکریاں اٹھانے والے مزدور کئی تھے۔ پر رحمان اکیلا اُن کے لئے لگاتار کام مہیا کر رہا تھا۔ مزدوروں نے چاہا کہ رحمان کو ٹوک دیں۔ اُن کی تو جان پہ بن آئی تھی۔ بارہ پندرہ آنے دن کی مزدوری کی خاطر وہ اپنی جان نہ دینا چاہتے تھے لیکن مستریوں اور اوورسیئروں کی موجودگی میں وہ رحمان کو ڈانٹ نہ سکے۔ مستری اور اوورسیئر حتیٰ کہ ٹھیکہ دار بھی مزدوروں کے بیچ مکھی کی طرح بھنبھنا رہا تھا۔ بڑا انجینئر بھی اپنے ماتحتوں سمیت دو چار چکر لگا چکا تھا اور ہدایت کر گیا تھا کہ کام ٹھیک سے ہو۔ باہر سے کچھ ماہر کام کا جائزہ لینے کے لئے آ رہے تھے اُن کے استقبال کے لئے رنگین ڈیوڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ پھولوں کے ہار تیار رکھے گئے تھے۔ میز کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ دفتر کے ٹرنکوں میں چینی کے پیالے۔ رکابیاں اور نہ معلوم کیا الا بلا لاکے رکھا گیا تھا۔ کچھ مزدور اس سامان کو ٹرنکوں میں سے نکالنے پر مامور تھے۔ بہت خوش قسمت تھے یہ کچھ مزدور... نہ کچھ کام .... نہ کوئی کاج .... نہ شام کو کام کی زیادتی کی بعد کمر میں درد ہو اور نہ رات کو بازوؤں میں کپک ہوتی رہے بس یونہی ہاتھ ہلاتے جاؤ اور دن کی مزدوری کھری کر لو... سالے لانگری ... بھانڈے مانجنے والے ...

جلن کے مارے گالیاں دینے کے باوجود ہر ایک مزدور کا دل

جا سکتا تھا کہ جا کر ان ملائم چمکدار برف جیسے اُجلے اُجلے پیالیوں اور رکابیوں کو چھولے۔ جن پر بیل بوٹوں کی بہار سی کھل اٹھی تھی میز پر شیشے کا عجیب و غریب کپڑا بچھایا گیا تھا۔ مروڑو تب بھی نہ ٹوٹے۔ کئی مزدور بہانے بنا بنا کر اس کپڑے کو چھو آئے تھے نگاہیں اس کپڑے کے آر پار جاتی تھیں۔ لیکن چینی کے برتنوں کو چھونے کی کسی نے ہمت نہ کی۔ کہیں کوئی برتن ٹوٹ گیا تو مہینہ بھر کی پگار چلی جائے گی۔ یہ سارا سامان شاید ٹھیکہ دار اپنی نئی موٹر میں شہر سے لایا تھا۔ تبھی رنگ برنگی موٹر... دور سے تو نئی نویلی دلھن کی طرح لگتی تھی موٹر کے چاروں طرف لگے شیشوں میں صورت صاف نظر آتی تھی بیٹھنے کی جگہ ذرا دباؤ تو دبتی ہی جائے۔ لیکن نہ معلوم رحمان کس مٹی کا بنا تھا۔ اتنی گھما گھمی کا کوئی اثر نہ ہو پایا۔ ایسے کام میں جتا رہا جیسے عمر بھر کام میں جتا رہا ہے۔ پسینے سے شرابور بدن پر اتنی مٹی جم گئی تھی۔ جیسے ماں کی کوکھ سے ہی مٹی میں لت پت نکل آیا ہے۔

ماں کی کوکھ سے ہی مٹی میں لت پت نکل آیا ہے یا نہ آیا ہو رحمان کو کوئی فکر نہ تھی۔ اگر کوئی فکر تھی تو یہ کہ شش رنگ بڑھتے بڑھتے اتنی لمبی ہو جائے کہ وہ اس اجلی دنیا سے بھاگ کر زمین کے اندھیرے میں پناہ لے۔ زمین کی کوکھ میں ہی سما جائے۔ صبح کے واقعات پیچھا نہ چھوڑ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا۔ اپنے بدن کو گھنٹے گھٹنے پسینہ بہا بہا کر غائب کر دے۔ ان عورتوں کا کوئی بھروسہ نہ تھا۔ چھوٹی سی ناراض ہو کر دھمکی دے سکتی ہے اور کچھ دیر بعد چائے پینے سے لئے

اصرار کر سکتی ہے تو وہ ایک کروٹ اور بدل کر ماں سے شکایت بھی کر سکتی ہے۔ سوچ سوچ کے اُس کا ذہن پھٹنے کو آیا۔ شاید بدن کو تکلیف دینے سے ذہنی تکلیف کچھ کم ہو۔ لیکن پختا وہ کھودتے کھودتے سرنگ کے اندر بڑھتا جا رہا تھا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ لمحہ بھی نزدیک آتا جا رہا تھا۔ جس کی سوچ اُس کے سارے بدن میں تھرتھری کا موجب تھی۔ وہ شام کو گھر کیونکر جا سکے گا! عبدالسلام کے پاس بھی آسرا نہ مل جائے گا۔ عبدالسلام کی وساطت سے ہی وہ بڑھیا کے گھر میں رہتا تھا اور دینا ناتھ کے پاس رہنا اُسے منظور نہ تھا۔ دینا ناتھ کے پاس رہنے کے بجائے کھلے آسمان تلے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر جانا بہتر تھا۔ اب دینا ناتھ سے اُس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ یہیں کام پر علیک سلیک ہو گئی تو ہو گئی ورنہ دونوں کا رویہ ایسا تھا جیسے ایک دوسرے کے ساتھ بڑھے نہیں۔ کھیلے کودے نہیں ہیں۔

کوئی راستہ نہ سوجھ رہا تھا اس اندھیرے میں۔ کاش اُس کے پاس کچھ روپے ہوتے تو سیدھا شہر چلا جائے کاش صرف بس کا کرایہ ہوتا۔ کاش ....... وہ جھنجھلا اٹھا۔ وہ ناحق اپنے آپ کو ہلکان کر رہا ہے ذرا سی چھیڑ ہی تو کی کوئی قتل تو نہیں کیا۔ بھلا کیا ضرورت تھی پھپولی کو اُس کے کمرے میں آنے کی۔ ایک جوان لڑکی کو کسی جوان شخص کے کمرے میں یوں بے دھڑک نہ گھس جانا چاہیے تھا۔ بڑھیا سے شکایت کرتی ہے تو کرتی پھرے۔ بڑھیا کوئی اُس کی سگی ہے جو وہ ڈر جائے گا۔ وہ کرایہ دار ہے وہاں

رہنے کے پیسے ادا کرتا ہے۔ اُس کا بستر ڈالا ہے۔ سامان وہاں ہے۔ وہ جائے گا۔ ضرور جائے گا۔۔۔ بھلا کیوں نہ جائے۔۔۔!

پسینے کے قطرے اُس کی آنکھوں میں بہہ آئے اور بڑے کڑوے لگے۔ اُس نے بے خیالی میں آنکھوں کو مسل دیا۔ ہاتھوں میں لگی مٹی آنکھوں میں گھُس گئی۔ آنکھوں میں شدت کا درد اُمنڈ آیا۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر سُرنگ سے باہر نکل آنے پر مجبور ہو گیا۔ اور تب اُس پر واضح ہو گیا کہ سُرنگ کے اندھیرے میں اُس نے جو کچھ فیصلہ کیا تھا۔ دن کے اُجالے میں اُس پر عمل کرنا دشوار ہے۔ دن کے اُجالے میں سُرنگ کے مردہ اندھیرے کے بجائے چھوٹو کی ماں کا ہیبتناک چہرہ ہو گا۔ بجلی کی طرح تڑپتی آنکھیں ہوں گی۔ سانپ کی طرح لہراتی زبان ہو گی اور نوکیلی کھُردری انگلیاں ہوں گی جو اُس کو نوچنے کے لئے جھپٹ پڑیں گی۔ اُس کی آنکھیں نکالنے پر تُل جائیں گی۔ آنکھوں میں بے انتہا درد محسوس ہوا۔ مزدور بھی کنی کترا گئے اچھا ہوا جو کچھ دیر کے لئے ناکارہ ہو گیا۔ مُہلت تو ملے گی۔ سانس لینے کے لئے۔ دور سے موٹریں بھی آ رہی تھیں۔ سبھوں کا اشتیاق بڑھ گیا۔ شاید ماہر کام کا جائزہ لینے کے لئے آ رہے تھے۔

موٹریں ٹھیک سجی سجائی میز کے پاس رُک گئیں۔ کچھ آدمی اُترے۔ کچھ جانے پہچانے لوگ اپنے افسر تھے اور کچھ لوگ بڑے بڑے جُبّے پہنے انجان آدمی تھے۔ مزدوروں کو یقین نہ آیا کہ یہ منحنی سے آدمی سہمے سہمے سے جو راہ پڑے ڈھیلوں پر چلتے ہوئے لڑکھڑا جاتے تھے، اِن مٹی کے پہاڑوں کے ماہر ہو سکتے ہیں۔ اِن کو دیکھ کر۔۔۔

اِن کے ٹوپ دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آجاتی تھی۔ لیکن زیادہ ہنسی تو افسروں اور اوورسیروں کو دیکھ کر آجاتی تھی جو ڈر کے مارے تھرتھراتے پھر رہے تھے اور گھبرائی ہوئی مرغیوں کی طرح لگتے تھے ٹھیکہ دار کی بڑی بُری حالت تھی۔ کبھی وہ مہمانوں کے پیچھے پھُدکتا پھرتا اور کبھی چائے بنانے والوں کو جلدی سے چائے بنانے کے لئے ڈانٹتا۔ کبھی مستریوں میٹھوں پہ برستا اور کبھی مزدوروں کو للکارتا۔ باولا ہو گیا تھا شاید اور مزدور خوش ہو رہے تھے۔ آج گنجے سالے کو پتہ چل رہا ہوگا کہ ٹھیکہ دار بننا آسان نہیں۔ سب لوگ سانس روکے منتظر تھے کہ کس وقت ماہر بندھ کو جانچ لیں گے۔ پرکھ لیں گے۔ بندھ ٹھیک طریقے سے نہیں بن رہا تھا نہ مٹی ٹھیک سے بچھائی جاتی تھی اور نہ دبائی جاتی تھی۔ مزدور گو اس کام کے ماہر نہ تھے پھر بھی وہ بچپن سے لے کر اب تک اس مٹی سے کھیلتے آئے تھے وہ اتنا تو جانتے تھے کہ سیلاب کا معمولی سا ریلا اِس بندھ کی کمزور مٹی کو چشم زدن میں بہا لے جائے گا اِس لئے مزدور ٹھیکہ دار کی پھٹکار سے بے نیاز اس گھڑی کا انتظار کر رہے تھے جب ماہر سارے کام کو رد کر دیں گے۔

فوٹوگرافر تصویریں لے رہا تھا۔ بجلی کا کوندہ لپکتا اور آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ شرنگ کے اندر رحمان کے ارد گرد آگ سی لگ جاتی اور رحمان کچھ دیر اپنا ڈر بھول کر ان لوگوں کی حرکات سکنات میں منہمک ہو جاتا۔ دینا ناتھ نے آج نیا سوٹ پہن لیا تھا۔ ٹھیکہ دار کی کلاہ میں کلابتون چم چم چمک رہا تھا۔ میز پر رنگ برنگی

مٹھائیوں کے ڈھیر لگے تھے اور ساری فضا تلتے گوشت کے کبابوں کی مہک سے بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔ رحمان کو یہ خوشبو اچھی نہ لگی اس خوشبو نے اس کے پیٹ میں کھلبلی سی مچا دی اور ذہن میں بھی کھلبلی مچنے لگی۔ صبح کھیرولی کے اصرار کے باوجود وہ کچھ نہ کھا سکا تھا۔ بے وقوف کہیں کا..... کچھ کھا لیا ہوتا تو اس وقت آنتوں کا برا حال نہ ہوتا۔ کبابوں کی مہک نے منہ میں لعاب کے ان گنت سوتوں کو جنم دیا۔ جی کرتا تھا کہ دوڑ کر جائے اور میز پر رکھی چیزوں کو کھا جائے۔ نہ کھا سکے تو کم از کم ان مٹی کے ڈھیلوں کو ہی کھا جائے جو پیروں کے آس پاس بکھرے پڑے تھے پیٹ میں بھبک کیا مچل رہی تھی جیسے اس کی ساری زندگی مچل رہی تھی۔ جھنجھلا کر اس نے پھاوڑا سنبھالا اور اپنی جلن مٹی پر صرف کرنے لگا۔

باہر چلے گئے۔ میز ہٹا لی گئی۔ استقبالیہ ڈیوڑھیوں کو توڑ دیا گیا اور فضا میں بسی مہک پھر سے مزدوروں کے پسینے کی بو میں ڈوب گئی۔ سائے بڑھتے گئے..... بڑھتے گئے حتیٰ کہ ایک مخصوص نشان تک پہنچ گئے۔ ہلکی سی سرگوشی فضا میں سرسرائی۔ اور مزدوروں نے ہتھیار رکھنے شروع کئے۔ چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔ لیکن رحمان بدلتے ماحول سے بے نیاز سرنگ کھودتا رہا۔ کئی مزدوروں سے رہا نہ گیا۔ ایک نے تمسخر کیا۔

"ہم جانتے ہیں تم ٹھیکہ دار کے آدمی ہو۔ لیکن وہ لوگ

چلے گئے۔ اب کس کے واسطے یہ جوش و خروش۔ چھٹی ہو گئی ہے۔"

رحمان چونک گیا۔ انگلیاں پھاوڑے سے ایسے چپکی ہوئی تھیں جیسے گوند سے چپکائی گئی ہوں۔ پھاوڑا الگ کرنے سے انگلیوں میں بڑا درد ہونے لگا۔ انگلیاں مروڑتے ہوئے اس نے سرنگ سے باہر نگاہیں دوڑائیں۔ چھٹی کے وقت جتنا جوش و خروش مزدوروں میں پیدا ہوتا ہے وہ آج مفقود تھا۔ سب مزدور بے دل ہو گئے تھے۔ کسی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ ماہروں نے بندھ میں کوئی بھی خامی نہ پائی۔ شاید خامیاں فضا میں بس مہک سے ڈوب گئی تھیں۔ یا شاید بندھ میں کوئی خامی نہ تھی شاید بندھ ٹھیک ہی بن رہے تھے۔ ماہر جو ٹھہرے مزدوروں کا یقین ڈانواڈول تھا۔ عمر بھر کا یقین ٹوٹ جائے تو دل ٹوٹ سا جاتا ہے۔ اس لئے مزدور آج خلاف معمول چپ چاپ ہتھیار واپس کر رہے تھے اور دو دو چار چار کی ٹولیاں بنا کر گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ رحمان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ سب مزدور گھر جائیں گے۔ مزے سے روکھی سوکھی کھائیں گے اور ٹانگیں پسار کر سوئیں گے۔ اور ایک وہ تھا کہ جس کا کوئی گھر نہیں۔ نہ زمین نے منہ کھول کر اسے چھپا لیا اور نہ ہی آسمان نے گر کر اس پہ پردہ تانا۔ اب کیا ہوگا۔ سرنگ میں رات بھر کا آسرا مشکل تھا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور پھاوڑا اٹھانے کو جھکا۔ چوکیدار سامان جمع کرنے کے لئے چلا رہا تھا۔ یکایک آسمان

اتنے زور سے آ گرا کہ سنبھل نہ پایا۔ مگر پھر شدید جھٹکا محسوس ہوا تھا اور زمین اُسے گود میں لینے کے لئے تیزی سے آگے بڑھی۔
جب اُسے ہوش آیا تو سارا بدن جیسے ٹوٹ گیا تھا۔ سر میں درد ہو رہا تھا اور دم گھٹتا جا رہا تھا۔ کوئی اُس کے سینے پہ بیٹھا تھا شاید۔ سانس لینے کے لئے اُس نے چلّانا چاہا۔ وہ کچھ حیران سا ہوا۔ حلق سے ذرا سی بھی آواز نہ نکل پا رہی تھی۔ بلکہ آواز کی گونج ....  اُس کا منہ چڑانے لگی۔ "میں... میں میرا سانس .... اُف .... میرا ....."
منہ پہ کسی کا ... محسوس ہوا۔ جیسے گھاس کے تنکے .. کھردرے کھردرے تنکے اُس کے ہونٹوں کو چھو گئے ہوں۔ یا کسی کی انگلیاں تھیں شاید.... !
" یہ تو نہیں .... چپ چاپ پڑے رہو ! " میٹھی آواز جانی پہچانی سی لگی۔ شاید ماں کی آواز ہو۔ پر ماں تو اُس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی۔ اور اُس نے ماں کی آواز کبھی نہ سنی تھی۔ پھر شاید اُس کی بیوی کی آواز ہو۔ پر نہیں .... نہیں .... بیوی کی آواز بھی نہیں ہو سکتی۔ ابھی وہ دولہا بن کر کہیں نہیں گیا تھا۔ گو بوڑھے باپ نے سب تیاری کر رکھی تھی۔ دُلہن کے ہاتھوں کے لئے کڑے۔ انگلیوں کے لئے انگوٹھیاں۔ گلے میں ڈالنے کے لئے مالائیں۔ پاؤں کے پازیب ... اور .... اور... افوہ نہ معلوم کیا کیا الا بلا بوڑھے باپ نے جوڑ رکھی تھی۔ اُسے ہر چیز کا نام کہاں معلوم۔ وہ تو باپ سے چوری چھپے اُس نے بڑے صندوق

کا تالا کنجی کے بجائے کیل سے کھول کر سب چیزیں دیکھ لی تھیں۔ باپ نے اپنی دانست میں بڑا مضبوط تالا صندوق میں لگا رکھا تھا۔ باپ کو پتہ چل جائے کہ بیٹا چابی کے بغیر بڑے صندوق کا تالا کھول سکتا ہے تو مار مار کے ہڈی پسلی ایک کر دے .... کہیں باپ نے روز کی طرح آج بھی تو نہیں پیٹا ہے۔ انگ انگ میں درد ہو رہا تھا۔ یہ آواز باپ کی آواز کی طرح کھردری نہیں ... پھر یہ لاشور کون؟ اُسے چاہیئے آنکھیں کھول کے دیکھے۔ بھلا آنکھیں موندے کوئی دیکھ سکتا ہے۔ یہ کچھ دکھائی بھی دے۔ کہیں وہ اندھا تو نہیں۔ آخر اُسے کچھ دکھائی کیوں نہیں دیتا۔

"مجھے دکھائی نہیں دیتا ... مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ اُف یہ اندھیرا .... مجھے دکھائی نہیں دیتا۔"

"تیل ختم ہو گیا ہے۔ دیا بجھا پڑا ہے ...." وہ چونک پڑا بڑھیا کی تیکھی آواز تھی۔ ضرور بڑھیا نے ماں سے شکایت کی ہو گی اور گاؤں بھر نے مل کر اُس کو پیٹا ہے۔ بڑھیا نہیں۔ ڈائن ہے کوئی۔ اُسے اُٹھ کے بھاگ جانا چاہیئے ورنہ یہ لوگ مار مار کر اُسے ادھ مُوا کر دیں گے۔

"بیٹا ہلو جلو نہیں۔ آرام سے بیٹھو ورنہ تکلیف بڑھ جائے گی۔" اب کے کھردری انگلیاں شانوں میں کھبتی سی محسوس ہوئیں۔ اور درد کی تیز لہر اُس کے بدن میں رواں ہو گئی۔ شاید یہ لوگ اُس کی ٹانگیں توڑ چکے ہیں۔ ہزار کوشش پر بھی ہل نہ پاتی تھیں۔

"لا بیٹی ... چائے کا پیالہ ...." چمکارنے کی آواز یا غصے کی

پُھنکار۔ کون جانے" بیٹیا۔ چائے پی لے۔ طبیعت ٹھیک ہو جائیگی" چائے —— ہاں —— چائے چاہیئے اُسے بہت بھوک لگی ہے۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ صبح بھی اُس نے صرف ایک پیالہ چائے پی لی تھی۔ کیا وہ دن بھر چائے پر ہی گذارا کرے گا۔ کھانا کیوں نہیں لا دیتے یہ لوگ۔ شاید وہ بھوک سے بے حال ہو گیا ہے کہیں یہ لوگ اُسے بھوکوں تو نہیں مار رہے ہیں۔ کیا بھروسہ ان کا۔

"میں چائے نہیں پیوں گا۔۔۔ مجھے کھانا دو۔۔۔۔ روٹی دو۔ روٹی۔۔۔۔ نہیں روٹی نہیں چاہیئے۔ سنگھاڑے کی روٹی نہیں چاہیئے۔۔۔۔ چھچھڑے نہیں چاہیئے۔ ہوں۔ چاول چاہیئے۔ چاول۔۔۔۔ سفید سفید۔۔۔۔ اُجلے اُجلے۔۔۔۔ موتی جیسے چاول۔۔۔"

"نہیں بیٹیا تم بیمار ہو۔۔۔۔ چائے پی لو۔۔۔ ٹھیک ہو جاؤگے"

بڑھیا کی آواز تھی یا فہوے کی مٹھاس تھی۔ بہت اچھی تھی بڑھیا اُسے اپنے بیٹے کی طرح پالتی تھی۔ چائے پینے کو کہہ رہی تھی۔ زہر پینے کو بھی کہہ دے تو وہ پی جائے گا۔ شاید چائے میں زہر ہے۔۔۔ ضرور زہر ہوگا ورنہ بڑھیا اُسے چائے نہ پلاتی۔۔ بھولی نے ضرور شکایت کی ہے۔ بھولی تو گنوار ہے گنوار۔۔۔ ڈھور۔۔۔ بے رحم۔۔۔ بغیر دودھ کے نمکین چائے سے بھی زیادہ کڑوی۔ اُسے چائے نہیں پینی چاہیئے۔ چائے میں ضرور زہر ہوگا اس لیئے اُسے چائے نہیں نہیں چاہیئے۔

"میں چائے نہیں پیوں گا۔ چائے میں زہر ہے۔ تم لوگ مجھے زہر دے رہے ہو۔ میں چائے نہیں پیونگا"

"سر میں چوٹ آئی ہے۔ کہیں پاگل تو نہیں ہے اماں..."

آواز پتلی اور سُریلی تھی۔ اِتنی پتلی اور اتنی سُریلی کہ اچھے بھلے آدمی کو پاگل بنا دے وہ اِس آواز کو سن کر ہی پاگل ہو گیا تھا۔ کہیں وہ اُٹھ کے کپڑے نہ پھاڑنا شروع کرے۔ سر کے بال نہ نوچ ڈالے۔ لڑنا نہ شروع کرے پھر تو رسیوں میں جکڑ کر پاگل خانے لے جایا جائے گا۔ اور پاگل خانے میں بچے سلاخ دار کھڑکیوں میں سے پتھر پھینکا کریں گے اُس پہ لوہے کی سلاخوں کی چار دیواری میں بند پاگل بھیڑ بکریوں کی طرح جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو کاٹ کھاتے تھے۔ پاگل خانے کے محافظ نہ تو پتھر مارنے والے بچوں کو منع کرتے تھے۔ نہ پاگلوں کو روک لیتے تھے شاید وہ بھی پاگل ہو گئے تھے۔ ورنہ پاگل خانے کی گندگی اور سڑاند میں کون زندہ رہے۔ اچھا بھلا آدمی تو مر جائے۔ وہاں لے گئے تو وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جائے گا۔ کئی پاگل مر گئے۔ وہ پاگل خانے کو اچھی طرح سے دیکھ چکا تھا۔ جب کبھی وہ دینا ناتھ اور وہ سنگھاڑے کھانے اور بادام کے شگوفے دیکھنے ہاری پربت جاتے تو لوٹتے وقت ہاری پربت کے دامن میں پاگل خانہ دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ پاگل خانے جانے سے بہتر ہو گا۔ زہر پی لے۔ واقعی زہر پینا بہتر ہے۔ پیٹ میں ہلکے سے مروڑ اُٹھیں گے۔ ہلکا سا درد ہو گا۔ ہلکے ہلکے بے سدھ ہو جائے گا۔ نہیں کچھ تو ہونا ہو گا۔

میٹھے قہوے کے باوجود منہہ کڑوا ہو گیا۔ زہر ہی تو پی رہا تھا۔

جب یہ لوگ اِس بات پر ہی مُصر تھے تو یوں ہی سہی اب اُس کے لئے
اِس دنیا میں رہا ہی کیا تھا چھُٹکی ناراض تھی - بڑھیا ناراض تھی -
دینا ناتھ ناراض تھا - سونہ داری کے لوگ ناراض تھے حتیٰ کہ سونہ
داری بذات خود ناراض تھی - نہ کہیں گھر نہ گھاٹ - مر بھی جائے
تو کسی کا کیا نقصان ہوگا - کم از کم فہیرے کا مزہ لوٹ لے - فہیرے
کے میٹھے گھونٹ بند بند میں رچ رہے تھے - بند بند کو ڈھیلا کر رہے
تھے آج سے بے انتہا تھکن محسوس ہوئی - شاید موت بے انتہا تھکن کا
ہی نام ہے -

---

رحمان مٹی کے ڈھیر تلے دب گیا گیا کہ بڑھیا کو محسوس ہوا کہ اُس کی اپنی قسمت دب گئی۔ ہر طرف سے مصیبت اُمڈی چلی آرہی تھی۔ عبدالسلام چھٹی لے کر گھر چلا گیا تھا۔ افواہ تھی تبدیل کیا گیا ہے۔ واقعی انصاف نہ تھا اس دنیا میں۔ کسی غریب کی مدد کرو تو دنیا زندہ نہیں رہنے دیتی۔ شاید اُس کی اپنی منحوس پرچھائیں عبدالسلام پر بھی چھا گئیں۔ جب سے عبدالسلام تبدیل ہو کر چلا گیا تھا تب سے پھپھولی سنگھاڑے اکٹھے کرنے کے لئے ڈل جاتے ہوئے کتراتی تھی۔ ٹھیک ہے کہ عبدالسلام کے جانے کے بعد کوئی راہ دکھانے والا نہ تھا۔ لیکن اتنا بھی کیا کہ بالکل ہی جانا چھوڑ دے اور ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھ جائے۔ عبدالسلام کا سہارا عمر بھر کہاں رہتا۔ سہارا ملے یا نہ ملے جینے کی کوشش تو کرنی پڑتی ہے وہ خود بڑھاپے کے باوجود زمانے سے لڑ جھگڑ کر ایک ایک دن چھین رہی تھی۔ گرتے پڑتے کھانا پکاتی تھی۔ برتن مانجتی تھی۔ جھاڑو دیتی تھی۔ عبدالسلام سونہ واری نہ آتا تو کیا اُن جیسے غریب لوگ ڈر جاتا

چھوڑ دیتے۔ وہ تو ان لوگوں کی زندگی تھا۔ خدا مہربان تھا تو عبدالسلام کو اُن لوگوں کی مدد کے لئے سونہ داری بھیج دیا۔ عبدالسلام کے جانے کے بعد خدا اُن کو مارا گیا تو پیٹ تو ابھی ویسے کا ویسا موجود تھا۔ بھوک ابھی بدستور لگتی تھی۔ اور بھوک مٹانے کے لئے اُن کے ہاتھ پیر بدستور صحیح وسلامت تھے اُسے چاہئے تھا کہ لڑکی کو ڈھیل نہ دے۔ بلکہ مارے پیٹے۔ لاڈ پیار سے نہیں مانتی ہے تو ڈانٹ ڈپٹ کر ڈلر جانے پر مجبور کرے۔

بڑھیا نے سوچا اور سماوار کو جانچا۔ سماوار کے کناروں پر ابھی کچھ میل باقی تھی۔ اُس نے اور تھوڑی سی راکھ اٹھائی اور سماوار کے کناروں کو مانجھنے لگی۔ اپنے مکان کے سامنے آنگن میں بیٹھی وہ صبح سے برتن مانجتی رہی تھی۔ مانجھنے کی آواز۔۔۔ کھرر۔۔۔ کھرر خاموش فضا کی بے ہنگم اُداسی کو واضح کر رہی تھی یہ بے اُداسی شاید اُس کے اپنے بے ہنگم ذہن کی پیداوار تھی۔ ورنہ فضا میں اداسی کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ مطلع صاف تھا۔ آسمان بے داغ نیلی چادر کی طرح پھیلا ہوا تھا اور دور پہاڑوں کی چوٹیوں پہ ہریالی سی اُبھر آئی تھی۔ کچھ دیر بعد سورج نکلنے والا تھا۔ دھوپ کی چمکیلی گرم کرنیں آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے آموجود ہوں گی۔ اُس کے ٹھٹھرتے بدن کو گدگدا جائیں گی اور تب شاید اُس کے ذہن کی میل بھی کچھ دیر کے لئے دھل جائے گی۔

اُس نے سماوار رکھ دیا۔ برتن مانجتے مانجتے ہاتھوں میں درد اُبھر آیا تھا اور سامنے ابھی کئی برتن پڑے تھے۔ وہ جھنجھلا اٹھی۔ پچھلی برتن

مانجھتی تو اُس کے جوان ہاتھ منٹوں میں سب برتن مانجھ کے رکھ دیتے۔
نہ معلوم کس کی نظر لگ گئی پھولی کو۔ نہ کوئی کام کرتی تھی اور نہ کسی
کام میں ہاتھ بٹاتی تھی کچھ کہو تو بات کا جواب دینا بھی گوارا نہ کرتی
تھی۔ بس لیٹے لیٹے اونگھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ
کا جواب ایک خاموشی . . . . کئی دفعہ بڑھیا کو اس خاموشی سے ڈر سا
لگا تھا۔ جیسے پھولی کی خاموشی کی تہہ میں کوئی طوفان چھپا پڑا ہے
کریدے تو شاید طوفان پھٹ پڑے اور اُس کی سوکھی ہڈیوں میں
اب اتنی طاقت نہ تھی کہ کسی طوفان میں ٹھہر سکیں۔ وہ سوچتے سوچتے
رُک گئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ بیٹی کے ساتھ شاید زیادتی کر رہی
ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پھولی کی طبیعت خراب ہو اور ماں کو پریشانی سے
بچانے کے لئے ذکر نہ کر رہی ہو۔ آخر کوئی کب تک سنگھاڑے
اکٹھے کرنے کے لئے موقعہ بے موقعہ وُلر کے کناروں پہ سرگرداں
رہے۔ بے چاری پھولی۔ . . کبھی کیچڑ میں لت پت ہوتی تھی اور
کبھی بے موقعہ بارش میں بھیگ آتی تھی۔ ضرور پھولی کی طبیعت
خراب ہے۔ یہی وجہ ہوگی ورنہ ماں لاکھ بُری سہی بچہ ماں کو
سب کچھ بتانے پر مجبور رہتا ہے۔ اپنی ماں جو ٹھہری۔ نہ معلوم
بیماری میں لوگ کیوں بدل جاتے ہیں۔ پھولی بیمار ہے تو منہ سکوڑے
بیٹھی ہے۔ رحمان بیمار ہے تو بچے کی طرح مچلتا رہتا ہے جیسے اپنی
سگی ماں کے سامنے مچلتا ہو۔ خدا کرے رحمان ٹھیک بھلا ہی ہو جائے
تو شاید زندہ رہنے کا کچھ آسرا پیدا ہو۔ سنگھاڑے ختم ہونے کو
آئے تھے۔ ساگ سبزی اُگ آئی تھی تو وہ بارش سڑا گلا رہی تھی

واقعی جب مصیبت آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی ۔ بڑھیا نے سوندھ کر لمبی سانس بھری اور پیالے دھونے لگی ۔

بڑھیا ابھی سارے برتن نہ دھو پائی تھی کہ رحمان کی آواز آئی ۔ لمحہ بھر کے لئے اُس کا چہرہ غصے میں ڈوب سا گیا۔ اس گھر میں جینا وہ بھر ہو رہا تھا جب دیکھو تب رحمان چلاتا رہتا تھا اور وہ چھوٹا رحمان کا دل بہلانے کے لئے حاضر ہو جاتی تھی ۔ کہیں پھولی کو جلن تو نہیں ہو رہی ہے کہ اُس کی ماں اپنی بیٹی کو بھول کر پرائے لوگوں پر نچھاور ہو رہی ہے ۔ لیکن دوسرے لمحے ماتا کی لہر ساری اُلجھن بہالے گئی ۔ رحمان اُس کے جتنا بھی نزدیک آتا جائے گا اِس گھر کا مستقبل اُتنا ہی محفوظ ہوتا جائے گا ۔ رحمان من جائے تو پھولی کی زندگی بھی سنور جائے وہ بھی خوشی کے چار دن دیکھ لے گی پھولی کی خوشی کو محسوس کر کے بڑھیا خود بڑی خوش ہو لی گندے پیالے ایسے ہی چھوڑ کر اُس نے ہاتھ دھو لئے ۔ دروازے کے سہارے کے باوجود لڑکھڑاتے ہوئے ہی اُسے چکر سا آ گیا اور وہ گرتے گرتے بچی ۔ کسی دن ایسی گر جائے گی کہ اٹھ نہ سکے گی اِس لئے جتنی جلدی ہو سکے اُس نے رحمان پر قابو پا لینا چاہیے ۔

رحمان نے اُسے دیکھتے ہی ڈانٹ دیا "تم سنتی ہی نہیں ہو ۔ آوازیں دیتے دیتے میرا گلا سوکھ گیا ۔"

"آ تو رہی تھی ...." ڈانٹ سُن کر وہ بجائے غصے کے مسرور ہو گئی کبھی اُس کا خاوند بھی ایسے ہی ڈانٹ دیتا تھا ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ خاوند کی پکار پہ اُسے آنے میں دیر لگتی تھی کیونکہ تب وہ لنگڑی نہ تھی

"کیا کر رہی تھی اتنی دیر جو جلدی ہی نہ آ سکی" رحمان نے زبردستی بچہ بنتے ہوئے پوچھا۔ بچپن میں اُسے کبھی ایسے ٹھنکنے کی نوبت نہ آئی تھی پیدا ہوتے ہی ماں مر گئی تھی اور رباب کی ڈانٹ پھٹکار نے اُسے وقت سے پہلے بڑا بننے پر مجبور کیا تھا۔

"برتن مانجھ رہی تھی۔ اس لئے آنے میں دیر ہو گئی" بڑھیا رحمان کے پاس بیٹھ گئی ابھی کچھ اور برتن دھونے تھے اور وہ جانتی تھی کہ ایک دفعہ بیٹھ کے وہ جلدی اُٹھ نہ سکے گی۔ اس لئے بیٹھنے کے بجائے رحمان کی بات کا جواب دے کر واپس لوٹ چلنا چاہیے لیکن رحمان کے پاس بیٹھ کر اُسے ایک گونہ سہارا سا ملتا تھا۔

"ارے کچھو لی برتن نہیں مانجھتی؟ عجیب لڑکی ہے اپنا منہہ بھی نہیں دکھاتی۔" رحمان نے شکایت کی۔ بڑھیا کی ممتا کو محسوس کر کے رحمان اپنے آپ کو اس گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا۔

"خدا جانتا ہے اُسے کس کی نظر لگ گئی ہے نہ گھر کا کچھ کام دھندہ کرتی ہے اور نہ ہی ڈھیر جاتی ہے" بڑھیا رونے پر آ گئی۔

"تو پھر گھر کا خرچ کیسے چلتا ہے" رحمان نے اندازہ لگانا چاہا اُسے دو وقت قہوہ ملتا تھا۔ قہوے کے ساتھ نانوائی کی دو دو روٹیاں ملتی تھیں۔ سنگھاڑے کے آٹے کی روٹی کے بجائے چاول کھانے کو ملتے تھے۔

"بیٹا اب تم سے کیا چھپانا وہ جو تم پہلے کرائے کے روپئے دیتے تھے رینچولی کے جہیز کے لئے بچا رکھتی تھی۔ وہی روپئے نانوائی کی کو دیئے۔ میں نے سوچا تم اچھے ہو جاؤ گے تو ڈھیروں روپئے مل

جائیں گے۔" بڑھیا کہتے کہتے شرمندہ سی ہو گئی۔

"ٹھیک کہا ماں۔ ٹھیک کہا۔ میں بھی تو تمہارا بیٹا ہوں۔ تو فکر نہ کرو میں جلد ہی کوئی بندوبست کروں گا۔" رحمان نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "ویسے پھولی سے پوچھ تاچھ کر لو۔ پھولی کہیں بیمار نہ ہو۔" رحمان پھولی کے متعلق بہت کچھ کہنا سننا چاہتا تھا آج اُس کی طبیعت قدرے اچھی تھی۔

"وہ کچھ بتائے بھی۔ جب کبھی پوچھو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ جی چاہتا ہے ہڈی پسلی توڑ دوں اُس کی۔" بڑھیا بپھر گئی۔ پھولی کے ناز نخروں کی وجہ سے اُس کو دن رات اُٹھک بیٹھک کرنی پڑتی تھی۔

"نہیں ماں ... تم ذرا طریقے سے تو پوچھ لو۔ بڑی سمجھدار لڑکی ہے۔" رحمان واقعی پھولی کی سمجھداری کا قائل ہو گیا تھا پھولی سمجھدار نہ ہوتی تو چھیڑ چھاڑ کا ذکر ماں سے ضرور کرتی اور وہ بے موت مارا جاتا۔

"وہ بیٹا سمجھنے کی نہیں۔ لڑکی نہیں مصیبت ہے مصیبت۔ اس سے تو اچھا تھا پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی ... میں تو ...."

رحمان نے بڑھیا کو بات پوری کرنے کی مہلت نہ دی۔ بوڑھیا کے منہ سے پھولی کے متعلق ایسی باتیں سننی اُسے بُری لگتی تھیں۔ ذہنی طور پر وہ اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ پھولی بالکل اپنی لگتی تھی۔ اُس کے انگ انگ میں رچ گئی تھی۔ اسی لئے وہ پھولی کے متعلق کسی سے کچھ نہ سننا چاہتا تھا چاہے وہ پھولی

کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔ پھولی جوان تھی۔ جوانی الھڑ ہوتی ہے
مچل گئی ہوگی تو کیا بُرا ہوا۔ مچل جانا تو عمر کا تقاضا تھا۔ اور مچل
کر شرمانا.... ہائے.... ہو سکتا ہے پھولی اپنے رویے پر پشیمان
ہو تبھی اُس کے سامنے نہیں آئی۔ پھولی کی پشیمانی اپنے تئیں بھانپ
کر اُس کو بڑی مسرت حاصل ہوئی اور اُس نے بڑھیا کو سمجھانا
شروع کیا۔

"ماں.... ڈانٹ کے بغیر پوچھو تو مجھے یقین ہے پھولی سب کچھ
بتا دے گی۔ بچہ محبت چاہتا ہے۔"

رحمان کے طور اطوار نے بڑھیا کو یقین سا دلایا کہ کہیں رشتے
ناطے کی بات چل نکلی تو رحمان کے حامی بھرنے میں دیر نہیں
لگے گی۔ اپنی دانست میں رحمان کتنا ہی بے غرض بننے کی کوشش کرے
لیکن پھولی کے متعلق بات کرنے کے ڈھنگ سے بہت سارے نتیجے
اخذ کئے جا سکتے تھے جو مرد چاہے نہ سمجھ سکے پر عورت بہت جلد
سمجھ لیتی ہے۔ وہ خوشی کے زیر اثر تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
اب کے اُس کا سر بھی نہ چکرایا۔ رحمان کے طور اطوار نے اُس کو
بہت سہارے مہیا کئے تھے۔

"تم کہتے ہو بیٹا تو یہ بھی کر دیکھوں گی.... ہاں یاد آیا بلایا
کیوں تھا بیٹا۔"

"وینا ناتھ آرہا ہوگا اُس کے لئے بھی چائے بنا دینا۔ یہی
کہنے کے لئے بلایا تھا۔ رحمان نے جواب دیا۔ جب سے اُسے
حادثہ پیش آیا تھا۔ وینا ناتھ نے اُس کے پاس آنا جانا

شروع کیا تھا۔ سومانی نے صرف ایک بار خاوند کے ہمراہ مزاج پرسی
کو آ گئی تھی۔ اور سرسری طور پر کچھ لمحوں کے لئے بیٹھ گئی تھی۔ منہ
ایسے پھلا رکھا تھا جیسے دونوں دو سوتنوں کا اکٹھا مل بیٹھنا اچھا
نہ لگتا ہو۔ پھپھی اور بوڑھیا کو وہ بُری طرح سے نظر انداز کر
گئی تھی گو دونوں ماں بیٹیاں اُس کے ارد گرد منڈلاتی رہیں۔
وینا ناتھ نے بھی شاید بیوی کے طور طریقے کو پسند نہ کیا وہ پھر
کبھی بیوی کو ساتھ نہ لے آیا۔ بوڑھیا کبھی پوچھ بیٹھتی تو طبیعت
کی ناسازی کا بہانہ بنا دیا کرتا تھا۔

---

دینا ناتھ نے ٹھیکہ دار کے نئے مکان کے نئی دہلیز پہ قدم بڑھایا۔ مکان پر نیا پلستر کیا گیا تھا اس لئے سارے مکان سے مٹی گارے کی سوندھی سوندھی خوشبو آرہی تھی اور بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ دہلیز کے پاس ہی برآمدے کے داہنے طرف بیٹھک کا کمرہ تھا۔ کمرے میں نئی طرز کی چوڑی ہوادار کھڑکیاں چنی گئی تھیں لیکن کھڑکیوں میں ابھی شیشے نہ جڑے گئے تھے مکان کی دوسری منزل ابھی نا تیار تھی۔ اس لئے پہلی منزل تک ہی آنا جانا تھا ٹھیکہ دار کچھ دنوں سے کٹر روایت پرست اور مذہبی آدمی بن گیا تھا۔ پیروں فقیروں کو ماننے لگا تھا۔ اس لئے جب مسجد کے امام نے مکان میں داخل ہونے کی ساعت مقرر کی تو ٹھیکہ دار نے ادھ بنے مکان میں داخل ہونے کی رسم ادا کی۔ مسجد میں رات بھر چراغاں کرایا۔ نیاز نذرانے گذارے گئے اور نئے مکان کے باغیچے میں ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ گاؤں کے ذی عزت شخص اور سیونہ داری کے سب بڑے افسر مدعو تھے۔ گیشتابول

اور کبابوں کی خوشبو سے سارے گاؤں کی فضا مہک اٹھی۔ مئے ناب پانی کی طرح بہتی رہی۔

اپنے مزدوروں اور گاؤں کے غریب غربا کے لئے ٹھہرے اور باقر خانیوں کا انتظام تھا۔ بے چاروں کو کبھی کبھار ہی یہ چیزیں میسر ہوتی تھیں۔ لہٰذا پیٹ میں بدہضمی نے جنم لیا اور جنم لے کر نعروں کی صورت میں آشکارا ہونے لگی۔ ٹھیکہ دار کے نام کے ایسے زوردار نعرے لگے کہ سارا گاؤں تھرا اٹھا۔ سرمایہ داری کے لوگوں میں کچھ دنوں سے عجیب سی عادت ابھر رہی تھی۔ معمولی سے معمولی واقعے یا ہنگامے پر لیڈروں کے نام کے نعرے لگانے کی عادت سی ہو رہی تھی۔ اس لئے ٹھیکہ دار کے نام کے ساتھ ساتھ ملک کے سبھی لیڈروں کے نام کے نعرے بھی گونج اٹھے۔ حسب معمول دینا ناتھ ایسی باتوں پر دھیان نہ دیتا۔ یہ روز کا دردِ سر تھا اور کئی بار خود اس نے بے مطلب نعروں کا ساتھ دیا تھا لیکن ٹھیکہ دار کے متعلق نعرے سننے اور اس خاص واقعے پر سوچنے کے لئے ایک خاص وجہ کارفرما تھی۔ دعوت کے دوران ٹھیکہ دار نے اسے ایک طرف لے جا کر رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔

"بھئی دینا ناتھ۔ مجھے اس علاقے کے ہر ووٹر کے نام کی فہرست چاہیئے۔ میں سوچتا ہوں الیکشن لڑوں۔ تم کل سے کام پہ جانے کے بجائے یہی کام سنبھالو۔"

شاید اپنا نام بڑے لیڈروں کے نام کے ساتھ سن کر ہی ٹھیکہ دار کے ذہن میں مبہم امید حقیقت کا روپ دھارن کرنے پہ مجبور ہ

ہو گئی تھی۔

ٹھیکہ دار کی راز دارانہ کھسر پھسر یاد آتے ہی وینا ناتھ کے چہرے پر تلخی سی ابھر آئی۔ جب سے اُس کی ڈیوٹی بدل دی گئی تھی تب سے روپئے پیسے کا منہہ دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ تو بھلا ہو سیٹھ اور ماتحتوں کا رندوں کا جن کو ماضی کی یاد اور مستقبل کا خوف دلا کے وہ کچھ روپئے اینٹھنے میں کامیاب ہو جاتا تھا ورنہ کب کا بھوکوں مر گیا ہوتا۔ خالی خولی تنخواہ کے پچپن روپئے میں دو آدمیوں کا گذر آج کل کے زمانے میں ناممکن تھا۔ وینا ناتھ نے سوچا اور ایک ٹھنڈی سی سانس لی۔ یوں سوچنے سے مسئلے حل ہو جاتی تو اب تک اُس کی ساری مشکلیں حل ہو گئی ہوتیں۔ اُس کی ہر خواہش پوری ہو گئی ہوتی۔ ٹھیکہ دار جیسے نئے مکان کی خواہش۔۔۔۔ اچھے خوبصورت کپڑوں کی خواہش۔۔۔ ڈھیر سارے روپیوں کی خواہش اور نہ معلوم اور کتنی ان گنت امیدیں۔۔۔۔ ٹھیکہ دار کے ٹھاٹھ دیکھ کر اُس میں بھی اب ٹھیکہ داروں جیسے انداز پیدا ہو رہے تھے۔ پتلون فولڈنگ کے پاس ذرا سی اُدھڑ گئی تو پہننے کو جی نہیں کرتا تھا۔ کوٹ کے کالر پر میل کی ہلکی سی لکیر اُبھر آتی تو اُبکائیاں آنے لگتی تھیں۔ گو بچپن سے آج تک وہ گند اور میل میں لتھڑ لتھڑ کر پلا تھا اب بھی شاید گھر ہے۔۔۔ وہ سوچتے سوچتے رُک گیا اُسے محسوس ہوا ماضی یاد کرنے سے یہ احساس کمتری پیدا ہو رہا ہے اور آج اس احساس کی کوئی گنجائش نہ تھی بلکہ مستحکم ارادے کی ضرورت تھی ورنہ ٹھیکہ دار

سے بات کرنی ناممکن تھا ۔ وینا ناتھ نے سوچا۔سوچ کر جھپٹ کے اپنے ذہن کا دروازہ بند کر دیا اور بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔۔۔۔

ٹھیکہ دار شوخ پیلے رنگ کے صوفے پر بیٹھا تھا۔سامنے تپائی پہ کاغذ پھیلے پڑے تھے ۔ تپائی پر جھکنے کے سبب سر کی ساری گنج عیاں تھی۔ لیکن وینا ناتھ کو تسلی نہ آئی ۔ شاید اس کا ذہن اب اِس بدبودار گنج سے مانوس ہو چلا تھا۔ محسوس ہوتے ہی وینا ناتھ کو چوٹ سی لگی ۔ اُس کی اہمیت گرتی جا رہی تھی ورنہ ٹھیکہ دار پہلے اُس کی موجودگی میں ننگے سر نہ بیٹھتا تھا۔ وینا ناتھ دبے پیر آگے بڑھا ۔ ٹھیکہ دار نے سر اُٹھانے کی زحمت بھی نہ کی شاید واقعی ٹھیکہ دار اِس نئے مکان میں آکر بدل گیا تھا۔ اُس کی شخصیت میں گمبھیرتا آگئی تھی ۔ چہرے پر نازک سی سپیدی پھیل رہی تھی ۔ جبڑوں کے نیچے اور گردن پر گوشت کی کچھ اور تہیں اُبھر آئی تھیں ۔ ہاتھوں کا کھردراپن مٹتا جا رہا تھا۔ ٹھیکہ دار ذی عزت بنتا جا رہا تھا۔

”آداب عرض ۔۔۔۔“ وینا ناتھ نے پہل کی ۔

”بیٹھو بھئی بیٹھو ۔۔۔۔“ ٹھیکہ دار کا سر اُٹھا۔ وینا ناتھ نے دیکھا ٹھیکہ دار کے جبڑوں کو ایک عجیب سی مُسکراہٹ نے پھیلا رکھا ہے جیسے کسی نے کہیں سے مسکراہٹ چھین کر ٹھیکہ دار کے چہرے پر منڈھ دی ہو۔ نفرت سی ہو جاتی تھی اس مسکراہٹ سے۔ وینا ناتھ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے کے کونوں میں صوفے سجے تھے۔

بیچ فرش قالین بچھا تھا۔ قالین پر بیٹھتے ہوئے وینا ناتھ کو شرم سی آ گئی۔ پر کیا کیا جا سکتا تھا۔ اپنے مطلب کے لئے پیروں تلے بیٹھنا بھی گوارا کرنا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے حضور۔۔۔۔" وینا ناتھ نے بات شروع کرنے کی غرض سے یونہی پوچھ لیا۔

"ووٹروں کی فہرست ( [illegible] ) کر رہا ہوں۔۔۔۔" اور وینا ناتھ جل ہی تو گیا۔ ٹھیکہ دار پڑھنے لکھنے پر تیزی سے دسترس حاصل کر رہا تھا۔ کچھ کچھ انگریزی بھی بولنے لگا تھا۔ یہی حالت رہی تو کچھ دنوں کے بعد اس کی اپنی اہمیت بالکل ختم ہو جائے گی۔

"تو آپ اسی سال الیکشن لڑیں گے۔۔۔۔" وینا ناتھ کو احساس تھا کہ وہ بیوقوفانہ سوال کر رہا ہے۔ ووٹروں کی فہرست بنائی جا چکی تھی۔ الیکشن کے لئے نوکروں کی فوج بھرتی کی جا رہی تھی۔ اشتہارات چھاپے جا رہے تھے۔ اور ووٹروں کے ساتھ اندھا دھند وعدے کئے جا رہے تھے لیکن ایسے بیوقوفانہ سوال کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ ٹھیکہ دار کی کرخت ڈھال میں یہی ایک کمزوری کا نقطہ تھا۔ ورنہ وہ گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ ٹھیکہ دار سر اٹھانے کی زحمت نہ کرتا جیسے وہ نہ بیٹھا ہو۔ کوئی کتا بیٹھا ہو۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اس سال الیکشن لڑوں گا۔" ٹھیکہ دار نے ایسے کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ میرے نوکر ہو کر بھی شک کر سکتے ہو۔ لیکن چہرے پر مسکراہٹ بدستور چپکی رہی۔

"واقعی جناب۔۔۔۔ آپ کے بغیر اس علاقے میں کوئی قابل

شخص نہیں جو لوگوں کے دُکھ تکلیف سمجھتا ہے۔" دینا ناتھ کے اِنکسار نے ٹھیکہ دار کو مجبور کر دیا کہ کاغذات سے دھیان ہٹا کر دینا ناتھ کی طرف مرکوز کرے۔ اُس نے اپنی کمر سیدھی کی۔ ایک لمبی سی جمائی لے کر اپنے داغدار دانتوں کی نمائش کی۔ تھوڑی دیر گنجے سر کے کناروں کو کھُرچ لیا اور تب کہیں مُنہ کھولا۔

"بھئی.... تم ہی بتاؤ۔ میں اس علاقے میں پیدا ہوا۔ پلا۔ میرے بچپن کے سُنہرے دن اسی علاقے کی گھاٹیوں اور ٹیلوں کے درمیان بیت گئے۔ میں یہاں کے ہر آدمی سے واقف ہوں۔ ہر گھر سے واقف ہوں۔ اُن کی تکالیف سے واقف ہوں۔ اُن کی اُمیدوں اور نا اُمیدیوں سے واقف ہوں۔ اُن کی خواہشیں.... اُن کے خیالات... اُن کے غم... اُن کی فکریں.... اُن کی......"

دینا ناتھ بوکھلا گیا۔ اُسے یقین نہ آیا کہ سامنے بیٹھا شخص اُس کا ٹھیکہ دار ہو سکتا ہے۔ کہاں وہ اُکھڑا اُکھڑا لہجہ۔ کرخت آواز اور چہرے پر ابدی منحوسیت اور کہاں آج یہ شُستہ رنگین زبان چہرے پر مسکراہٹ۔ جیسے مسکراہٹ نہ ہو بلکہ چہرے کے اپنے خدوخال ہوں۔ آواز شہد کے قطرے..... الفاظ ہونٹوں میں سے تُل تُل کر نکل رہے تھے۔ روانی کا یہ عالم کہ منٹوں میں ایک بھرپور لیکچر جھاڑ دیا۔ دینا ناتھ حیران و پریشان منہ کھولے ٹھیکہ دار کو تکنے پہ مجبور تھا۔

ٹھیکہ دار نے اِتنے انہماک سے دینا ناتھ کو کچھ سُنتے پا لیا تو اُسے یقین ہو گیا کہ خُدا بھی مدِمقابل آ جائے تو ہار جائیگا۔ اُس کے

لیکچر دینے کے انداز میں یقیناً پختگی آ گئی تھی ورنہ دینا ناتھ جیسا پڑھا لکھا شخص مبہوت نہ ہو جاتا۔ گاؤں کے گنوار سُن پائیں گے۔ تو اُس کے نام کا کلمہ پڑھ لیں گے۔ واقعی ماسٹر صاحب نے لیکچر لکھنے اور اُسے حفظ کرانے میں کافی محنت صرف کی ہے۔ ماسٹر جی کی تنخواہ ضرور بڑھانی چاہیئے۔ ویسے پوری تسلی کرنے کی غرض سے اُس نے دینا ناتھ سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا میں غلط بول رہا ہوں ....."

"نہیں جناب ..... بالکل نہیں۔ جو کچھ آپ نے فرمایا سو فی صدی صحیح فرمایا" دینا ناتھ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ روپیہ اگر خدا نہیں لیکن خدا کی برابری ضرور کر سکتا ہے۔ کچھ دن پہلے ٹھیکہ دار گنوار، ان پڑھ اور جاہل تھا۔ آج روپیہ کی بدولت اُس کی حالت بالکل بدل گئی تھی۔ یہی حالت رہی تو کچھ دنوں میں مسکراہٹ کا مصنوعی پن بھی جاتا رہے گا تب شاید اِس گنجے کے سامنے کوئی بھی سر نہ اٹھا سکے گا۔ کیا معلوم یہ گنج بھی نہ رہے اور ایک وہ ہے کہ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود غربت کی وجہ سے بے عزت ہو رہا ہے۔ گنوار بنتا جا رہا ہے۔ جاہل ..... اُجڈ ..... بے وقوف .....

"تم کیسے آئے ....." ٹھیکہ دار نے اپنی کامیابی کے نشے میں سرشار ہو کر پوچھا۔

"میں جناب رحمان کے متعلق کچھ عرض کرنے آیا ہوں۔ وہ جو مٹی کے ڈھیر تلے دب گیا تھا" دینا ناتھ نے آہستہ سے جواب دیا

ٹھیکہ دار چپ رہا اور دینا ناتھ کا حوصلہ ذرا بڑھ گیا۔ "بہت
بیمار ہے صاحب۔ بستر میں پڑا ہے حضور.... اور غریب
آدمی ہے۔"

"اُس کی اپنی غلطی ہے۔ کسی نے جان بوجھ کر تو نہیں دبایا مٹی
نے۔ کسی کا کیا قصور...." ٹھیکہ دار نے دینا ناتھ کے نرم لہجے
کو جھٹلایا۔

"صاحب قصور تو اُس کی اپنی قسمت کا ہے۔ بیٹھے بٹھائے ناکارہ
ہو گیا" دینا ناتھ نے کہنے کو تو کہا لیکن دل میں سوچا کہ ٹھیکہ دار
سے مرے مرے لہجے میں بات کی تو رحمان کی مدد کر چکا۔ ٹھیکہ دار
سے ایک پیسہ بھی بٹورنا آسان نہ تھا۔

"یہ گاؤں میں کیا افواہ پھیل رہی ہے۔ کیا رحمان کو حادثے
کا معاوضہ ملنا چاہیئے" ٹھیکہ دار کے تیکھے لہجے نے دینا ناتھ کے
ارادوں کو ڈگمگا دیا اور دینا ناتھ گھبرا گیا۔

"جناب.... جناب.... قانون کی رو سے.... کام پر حادثہ ہوا
معاوضہ ملنا...؟" اور ٹھیکہ دار کتے کی طرح بھونک پڑا۔

"تم بھی ایسا سوچتے ہو۔ عقل ماری گئی ہے تمہاری کیا؟"

دینا ناتھ کی جان شکنجے میں پھنس گئی۔ ایک طرف رحمان کا
فکر دامن گیر تھا اور دوسری طرف ٹھیکہ دار کا غصہ.... ٹھیکہ دار
کے چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ غصے کی آگ نے جلا کر راکھ کر دی تھی
سارا چہرہ نفرت سے پھنک رہا تھا۔ دینا ناتھ کو ٹھیس سی لگی۔
یہی بدلہ مل رہا تھا وفاداری کا۔ گنا جو ٹھہرا.... ہوں۔

"صاحب اُسے اکیس دن ہو گئے بستر پہ پڑے پڑے۔ اُسے کچھ نہ کچھ تو ملنا چاہیئے۔ کم از کم ڈاکٹر کی دوائی کے پیسے ...."

وینا ناتھ کے گھبرے لہجے نے جلتے پر تیل کا کام کیا۔ ٹھیکہ دار کے خد و خال پرانی حالت پر آگئے۔ آواز میں مٹھاس کے بجائے کرخت لہجہ نمودار ہو گیا "تمہاری وکالت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

وینا ناتھ کو محسوس ہوا کہ کچھ دیر پہلے لگایا ہوا اندازہ غلط تھا۔ ٹھیکہ دار بدل نہیں گیا تھا بلکہ بدلنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ تاکہ ووٹروں کو رجھا سکے۔ ہوں .... کتّے کی دم۔ خصلت کہیں بدلتی ہے۔ وہ خود غریب سہی لیکن خاندانی شرافت حلیمی تو برقرار ہے۔ محسوس ہوتے ہی احساس برتری کی لہر اُبھر کر اُس کی ساری شخصیت کو اُچھال گئی۔ اُس کا لہجہ بھی کرخت ہو گیا

"میں وکالت نہیں کر رہا ہوں صاحب۔ میری ذمہ داری ہے میں ہی اُسے شہر سے لایا تھا۔"

"میں بھی سمجھوں تم یکایک رحم دل کیوں بن بیٹھے...." ٹھیکہ دار کے طنز میں کئی مطلب پنہاں تھے۔ وہ جواب دیتا لیکن ٹھیکہ دار نے اُسے کوئی مُہلت نہ دی۔

"تم میرے نوکر ہو۔ میری تنخواہ پاتے ہو۔ تمہیں میرے فائدے کے لئے سوچنا چاہیئے۔ نہ کہ مزدوروں کی طرفداری جتا کر روپئے بٹورنے پھرو۔ مجھے اپنے گاؤں والوں پر بھروسہ نہ تھا اِس لئے تمہیں نوکر رکھ لیا۔ سب کام تمہارے سپرد کئے۔ تمہیں مختار بنا دیا۔ کیا؟.. کیا اِس لئے کہ تم میری مہربانیوں کا ناجائز فائدہ

اٹھاؤ.... میں حیران ہوں کہ ......"

ٹھیکے دار کہتا جا رہا تھا اور اُس کے ذہن پہ ہتھوڑے برساتا جا رہا تھا۔ وہ ٹھیکے دار کا نوکر تھا۔ ٹھیکے دار کی تنخواہ پاتا تھا۔ ٹھیکے دار چاہے تو کھڑے کھڑے نوکری سے جواب دے دے۔ رحمان کو حادثہ پیش نہ آتا بلکہ دوسرا کوئی مزدور مٹی کے ڈھیر تلے دب جاتا تو شاید وہ خود کبھی یوں ٹھیکے دار کے سامنے نہ بولتا اور یوں اپنی نوکری خطرے میں نہ ڈالتا۔ رحمان اگر اُس کا دوست ہے تو ٹھیکے دار کو اُس کی دوستی سے کیا غرض۔ اُسے تو کام چاہیے۔ غصے میں آ کے نکال دے تو رحمان کے ساتھ ساتھ خود بھی دربدر ہو جائے۔ شاید ٹھیک کہتی ہے سودامنی کہ اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خالی خولی دوستی کے سہارے بھلا زندگی گذاری جا سکتی ہے کہیں۔ رحمان اگر اس کا دوست ہے تو دوستی کے ناطے اُسے کھلائے پلائے۔ اپنی جیب سے رحمان کی مدد کرے۔ ناحق کچھ روپیوں کی خاطر اپنا مستقبل خراب کرنا دانائی نہیں۔ بے وقوفی ہے۔ شاید وہ واقعی بیوقوف ہے۔ بہت بڑا بے وقوف ....

ٹھیکے دار نے نوکری سے نکالنے کی دھمکی تو دی لیکن اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ الیکشن سر پر تھا۔ پڑھے لکھے آدمیوں کی اشد ضرورت تھی۔ اسے نکال بھی دے تو نہ معلوم حرام خور کون سا فتنہ کھڑا کر دے۔ وہ نا شکر کئی ایسے راز جانتا تھا جن کے عیاں ہونے سے بے حد نقصان کا احتمال تھا۔ اس لئے وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھ کر اُس نے تنبیہ پر اکتفا کی۔"

"دیکھو دینا ناتھ ..... مجھے تمہاری پرانی خدمت کا خیال آرہا ہے۔ ورنہ کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیتا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔"

دینا ناتھ کچھ نہ کہہ سکا۔ اُس نے سوچا کہ کسی وقت اپنے آپ پہ جبر کرنا فائدہ مند ہوتا ہے۔ کافی تگ و دو کے بعد یہ نوکری حاصل ہوئی تھی ورنہ آج کل کے زمانے میں نوکریاں کہاں۔ بی اے۔ ایم اے پاس دربدر پھر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں۔ انجینئروں اور اوورسیروں کی فوج بیکار پھر رہی تھی حالانکہ گورنمنٹ نے قرضے دے دیکر اُن کو ٹریننگ کروائی تھی اور ایک وہ ہے کہ ذرا سی بات پہ اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔"

جوں جوں وہ سوچتا گیا توں توں اُس پر واضح ہوتا گیا کہ اِس کساد بازاری میں کسی سہارے کے بغیر جینا محال ہے۔ ناممکن ہے۔ اس لئے وہ ہر جذبے کو کچل کر چپ چاپ واپس چلا آیا۔



سرماوتی نے ادھ کھلی کھڑکی سے بنی کو آتے دیکھ لیا تو لحاف کے اندر اور ذرا اُوبک کر بیٹھ گئی۔ دیوار سے ٹکا سر دھڑام سے تکیے پر گرا دیا ایک لمبی سی انگڑائی لے کر اپنے ہاتھ پیر یوں پھیلائے جیسے کسی اہم کام کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہی ہو۔ وینا نامنقہ آنگن پار کر کے مکان کی اوٹ میں اوجھل ہو گیا تو اُس نے سر اُٹھا کر اپنا جائزہ لیا۔ اُبھرا پیٹ لحاف کے اندر کوہان کی طرح لگ رہا تھا دو چار گہرے سانس لینے سے لحاف سے ڈھکا پیٹ اُچک اُچک گیا۔ مرد کو محسوس تو ہو کہ عورت کو کیسی کیسی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے سانس لے کر کراہنے کی مشق بھی شروع کی۔ بال پہلے سے پریشان تھے کاجل پھیل کر آنکھوں کے گرد پھیل گیا تھا زور دے کر اُس نے چہرے پر ایسے خدوخال اُبھارے کہ لمحہ بھر میں وہ برسوں کی مریض دکھائی دینے لگی۔ کراہنے کی آواز بتدریج بڑھ گئی اور دوسرے کمرے سے مالک مکان کی بیوی نے پوچھا۔

"پھر درد اُٹھا بہن ۔؟" آواز پر گھبراہٹ طاری تھی ساتویں مہینے میں یوں درد اُٹھنا خطرناک تھا۔ اللہ سلامت رکھے بے چاری کو۔ کہیں

کچھ ہو گیا تو پردیس میں ماری جائے گی۔

"آں......" سوماوتی نے پورا لفظ ادا نہ کیا۔ ہو سکتا تھا کہ آواز میں درد کی شدت نہ عیاں ہو۔ اور کھانڈ اکسپوٹ جائے۔ ذرا سی بات ہو جاتی تھی تو یہ لوگ خواہ مخواہ دخل در معقولات دینے لگتے تھے۔ بچی سے دو باتیں کھل کر کرنی مشکل تھی اِس مکان میں جب دیکھو سر پر موجود۔ صبح دینا ناتھ اُسے اکیلے نہ چھوڑ جاتا اگر مکان والے کی عورتیں ذمہ داری نہ لیتیں۔ ٹھیکہ لے رکھا ہے اِن چڑیلوں نے اُس کی صحت کا.... ہوں۔

"میں نے کہا نا۔ ناف اور پیٹ پر کڑوے تیل کی مالش کر لو۔ پھر تم مالن بھی جاؤ گی" مالک مکان کی بیوی کمرے کے اندر آ ئی اور سوماوتی نے مُنھ پھیر لیا۔ اس عورت کے میل خوردہ کالے کھُردرے ہاتھ.... کڑوے تیل میں لتھڑے ہوئے.... اور اُس کے پیٹ پر.... اُس کو ابکائی سی آئی۔ مالک مکان کی بیوی دوڑی دوڑی گئی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تھوکنے کا برتن اٹھا لائی۔ سوماوتی آپ ہی آپ شرمندہ ہو گئی ایک وہ تھی کہ اِن لوگوں سے نفرت کرلی تھی اور ایک یہ عورتیں ہیں کہ سگی ماں بہن سے بھی زیادہ اُس کا خیال رکھتی ہیں۔ اُبکائی سے وہ بے حال ہو گئی اور تکیئے پر بے سُدھ گر گئی۔

مکان کی دہلیز پر جوتے جھاڑنے کی آواز آئی مالک مکان کی بیوی کا سر ڈھانپتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور سوماوتی نے آنکھیں موند لیں۔ پتہ تو چلے صاحب کو جب کھانا نہیں ملے گا۔ چائے نہیں ملے گی دیکھ تو لے آج بیوی کو اِس حالت میں چھوڑ کر جانے سے سارے گھر کا کاروبار درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ذرا پتہ تو چلے ماں

کے لاڈلے کو ..... دفعتاً وہ رک گئی۔ مالک مکان کی ماں کی آواز آرہی تھی۔ بیٹا بیوی کو واپس گھر بھیج دو۔ پہلا بچہ ہے۔ تم اکیلے نہ سنبھال سکوگے۔"

سوماوتی نے سنا تو آنکھیں موندے نہ رہا گیا وہ کسی بھی حالت میں پتی کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ خدا خدا کر کے ایک ساس سے چھٹکارا حاصل کیا تو یہ دوسری ساس سینے پر مونگ دلنے کو پیدا ہو گئی۔ نہ معلوم ہر بڑھیا ہر جوان عورت کی ساس بننے کی کوشش کیوں کرتی ہے۔

"ماں۔ لاکھ بار کہا پر وہ مانے بھی۔ وہ تو میری جان کھانے پر تُل گئی ہے۔" وینا ناتھ کی آواز نہ تھی۔ زہر کی گولی تھی۔ سوماوتی دل مسوس کے رہ گئی۔ دودھ پیتا بچہ تھا نا اُس کا پتی جو ہر کسی کو اپنی درد بھری کہانی سناتا پھرے .... ہونہہ .... وہ بستر میں اٹھ کے بیٹھ گئی۔ ڈھنڈورا پیٹ جانے سے کوئی فائدہ نہ تھا بھلے ہی وہ درد سے مر ہی کیوں نہ جائے لیکن اب پتی پر اپنی تکلیف کبھی ظاہر نہیں کرنے کی۔ بیوی کو الگ کرنے کے لئے بہانہ درکار ہے نا اُس کے پتی کو ....

"صبح سے درد میں مبتلا ہے۔ بہت پریشان ہے۔" اب کے مالک مکان کی بیوی کی آواز آئی اور سوماوتی کے چہرے پر نفرت کے آثار پھیل گئے کتین ... کتیا .... بڑی حیادار بنتی پھرتی تھی مالک مکان کی بیوی ــ سامنے تو گھونگھٹ کاڑھے پھرتی ہے تو بیٹھ پیچھے باتیں لڑاتی رہتی ہے۔ حسد اور رشک کی لہریں سوماوتی کے ذہن میں رواں ہوئیں اور وہ سانس روکے پتی کا جواب سننے

کی منتظر رہی۔ لیکن اُسے مایوسی ہو گئی۔ وینا ناتھ کی آواز کے بجائے وینا ناتھ کا سایہ دروازے پر پڑا۔ غیر ارادی طور پر سوماوتی نے پہلو بدل لیا۔

"کیا بات ہے۔ زیادہ درد ہو گیا؟" وینا ناتھ کی آواز میں بدستور جھنجھلاہٹ عیاں تھی۔ شاید ٹھیکہ دار کے کچوکے اب بھی دل پر بھاری تھے۔ سوماوتی نے جواب نہ دیا بلکہ اٹھ کر ساڑھی ٹھیک کرنی چاہی۔ یکایک اٹھ کھڑے ہونے سے اُس کا سر چکرایا اور وہ دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی۔

وینا ناتھ سے بیوی کی حالت چھپی نہ رہی اُس کو سوماوتی پر رحم سا آگیا۔ شہر جاتی تو ساس سسر پلکوں پر بٹھاتے نہ معلوم عورت ذات کو عقل کب آئے گی۔!

"تم بیمار ہو۔ اُٹھتے بیٹھنے سے زیادہ تکلیف ہو گی۔ تمہیں آرام کرنا چاہیئے۔" وینا ناتھ نے حلیمی سے کہا۔

"اچھی بھلی تو ہوں....." سوماوتی کا لہجہ روکھا تھا۔

"اٹھ کر دفتر تو نہیں جانا ہے....." وینا ناتھ کو بیوی کی کم ظرفی پر ہنسی آ گئی۔ "بستر پر لیٹی رہو تو آرام سا ملے گا۔"

"کیا چائے نہ بناؤں۔ کھانا نہ بناؤں.... تمہیں یاروں دوستوں کے پاس جانا تو ہوگا۔" سوماوتی بالوں کا جوڑا باندھتی ملحق رسوئی کی طرف چلدی۔

یاروں دوستوں کے پاس......! وینا ناتھ نے الفاظ منہ میں الٹ پلٹ لئے۔ بغیر کسی غصے کے..... نہ لہجے میں کوئی کھردراہٹ

ظاہر ہو گئی اور سوماوتی سنبھل کے بیٹھ گئی۔ آج انہونی سی بات
ہو رہی تھی۔ اُس کے انگ انگ سے بے اعتباری جھلکنے لگی۔

رینا ناتھ جرنیلوں سمیت چٹائی پر بیٹھ گیا۔ جرنیلوں پر کئی
وقتوں سے پالش نہ کی گئی تھی اس لئے بڑے بے رنگ اور بھدے
لگ رہے تھے۔ اُسے چاہئے جوتوں پر جلد سے جلد پالش
چڑھائے ورنہ خراب ہونے کا احتمال تھا۔ ویسے پتلون بھی
فولڈنگ کے پاس پھٹ گئی تھی تھوڑی سی سلائی پتلون کو نیا
روپ بخش دیتی۔ لیکن سوماوتی سوئی دھاگا اُٹھانے کی زحمت
کرے بھی تو! اپنی کنگھی چوٹی سے فرصت مل جائے تو پتی کی بھی
سُدھ لے۔ شاید یہی چھوٹی موٹی باتیں جمع ہو ہو کے میاں
بیوی کے درمیان دیوار کی طرح حائل ہو جاتی ہیں ورنہ
جگہ جائداد کا کوئی جھگڑا نہ تھا۔ مذاق تو یہ تھا کہ دونوں میاں
بیوی اس اونچی ہوتی ہوئی دیوار سے مایوس تھے اور دونوں
میاں بیوی چاہتے تھے کہ یہ دیوار کسی طور ٹوٹ جائے۔ لیکن
سوماوتی توڑنے بھی دے تو..... جب کبھی اُس نے خود
کوشش کی تو سوماوتی نے اپنی طرف سے اس دیوار میں
ایک دو اینٹ کا اور اضافہ کر دیا..... ہوں.....
مذاق..... شاید زندگی بذات خود ایک بڑا مذاق ہے
مذاق نہ ہوتی تو وہ ٹھیکہ دار کی نوازشن کر یوں نہ بیٹھتا بلکہ
اِس پتلون کے پھٹے پائینچوں کی طرح ٹھیکہ دار کی حالت
بھی بنا دیتا۔ جی چاہ رہا تھا کہ بیوی کے یہ خوبصورت بال

بھول ڈالے۔ کھول کر توڑ ڈالے... نوچ ڈالے... اتنے
نوچ ڈالے کہ بیوی کا وجود بکھر جائے..... تحلیل ہو جائے
تب کہیں وہ شاید ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائے اور خنجے
ٹھیکہ دار..... سالے حرامی ٹھیکہ دار کی نوکری غرور سے
ٹھکرا سکے۔"

سوماوتی نے سماوار میں زور شور سے پھونکیں مارنی
شروع کیں تو وہ چونک سا گیا۔ کہیں بیوی کو اُس کی مضحکہ
خیز سوچ کا پتہ چل جائے تو قیامت آ جائے۔ اُس نے پتلون
سے نگاہ اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کا ڈر دور ہو گیا
سوماوتی سماوار میں پھونک مارنے میں مصروف تھی۔ اُس کا
چہرہ سماوار میں دہکتے انگاروں کے طفیل گلابی ہو گیا تھا۔
بالوں کی کچھ لٹیں جوڑے کی بندش سے آزاد ماتھے کا طواف
کر رہی تھیں۔ گو کاجل آنکھوں میں سے پھسل کر گالوں پر
پھیل آیا تھا۔ پھر بھی سوماوتی بڑی دلکش لگ رہی تھی
عجب تو یہ تھا کہ گرم سماوار کی شرارت نے انگ انگ سے
بے اعتباری کافور کر دی تھی اور سوماوتی بڑی معصوم
لگ رہی تھی۔ دینا ناتھ نے موقعہ غنیمت جان لیا۔ کیا معلوم
وہ خود اپنے آپ کو کب تک قابو میں رکھ سکے۔ ٹھیکہ دار
کی لتاڑ ذہن میں اودھم مچا رہی تھی۔ بہانہ ملنے کی دیر تھی
کہیں دیر کر دی تو ٹھیکہ دار کی لتاڑ ذہن سے کھسک کر
باہر نہ نکل آئے پھر تو سب کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔

۔۔ وہ شاید اِس وقت انکار نہ کر سکے گی۔ اُس نے گلے کو کھنکارا
سوماوتی نے سرادار سے سر اٹھایا اور اُس نے یونہی
کہہ دیا۔

"تمہارے پاس کچھ روپئے ہوں تو دے دو۔۔۔۔۔"

سوماوتی چونک پڑی۔ پرپتی کے انہوں نے روپئے نے آج تیار کر دیا تھا شاید آج سنگار بننے کی یہی وجہ تھی۔ جو دھن ہوا اس کا ہی۔ اُس نے بھی یونہی جواب دیا "کیا کرو گے۔۔۔"

"ضرورت پڑ گئی ہے۔ ہو سکے تو دے دو۔۔۔" دینا ناتھ لگا میں جواب دینے پہ مجبور ہو گیا۔

"تمہیں روپئے کی ضرورت ہے" سوماوتی نے ایسے لہجے میں کہا جیسے دینے کا اقرار کر رہی ہو۔ دینا ناتھ آپ ہی آپ نادم ہو گیا۔

پہلا سے شرافت بری ہوتی تو یوں بیوی سے کھٹ پٹ نہ کیا کرتا۔ شاید سب قصور آج کا اپنا تھا۔ عورت تو مرد کی غلام ہوتی ہے جیسے استعمال کرو ویسی خدمت پاؤ۔۔۔

"یہی کوئی چالیس۔ چالیس روپئے۔۔۔" دینا ناتھ نے آہستہ سے کہا۔ اب کے سوماوتی تڑپ سی پڑی۔ روپیہ دو روپئے کی بات ہوتی تو دے دیتی۔ دن کے خرچ کے لیے ہر ترتیب میں دو ایک روپئے ہونے چاہئیں۔ لیکن چالیس پچاس روپئے۔ شاید ماں نے خبر بھجوائی ہوگی اور دونوں بیچ میں نکل گیا۔۔۔

سسر سمجھتے ہونگے کہ بہو راج کر رہی ہوگی گاؤں میں اور گاؤں
کی یہ حالت کہ سبزی خریدو تو چوگنے داموں۔ چاول لو تو آٹھ گنے
دام دو۔ لکڑی سونے کے بھاؤ بک رہی تھی یہ تو اس جیسی
عورت کا ہی کمال تھا جو گھر چلا رہی تھی۔ کوئی اور عورت ہوتی
تو میاں بیوی دونوں بھوکوں مر گئے ہوتے۔"

"اتنے روپئے کیا کرتے ہیں.... گھر بھیجتے ہیں"۔ اس نے
کریدا۔

"نہیں.... نہیں...." دینا ناتھ نے جلدی سے تردید کی۔
وہ جانتا تھا کہ گھر کے نام پر سوماوتی بھڑک جائے گی جب
سے سوماوتی ساتھ آئی تھی۔ وہ ایک پیسہ بھی گھر نہ بھیج سکا تھا
اس لیئے اصل وجہ بتانے میں ہی اس نے اپنی خیریت سمجھی۔

"رحمان بیمار ہے۔ اس کے پاس کوئی پیسہ نہیں...."

"ٹھیکہ دار نے دئے نہیں کیا؟ صبح تو مجھے مرتا چھوڑ گئے
تھے اپنے دوست کی خاطر۔" سوماوتی نے لفظ دوست اتنا کھینچ
کر کہا کہ اس لفظ کا سارا پیار.... ساری مٹھاس نفرت سے
لبریز کریہہ آواز میں تبدیل ہو گیا۔ دینا ناتھ کو برا ضرور لگا
لیکن آج اس نے بیوی سے نپٹنے کا نیا گر پا لیا تھا۔ شاید کام
کر جائے۔ اس لئے اس نے بدستور حلیمی سے جواب دیا۔

"ٹھیکہ دار نے صاف انکار کیا، اور رحمان بڑی مشکل میں ہے"۔

"تو یہاں سدا برت ہے کیا...." سوماوتی اپنے اصلی
رنگ پر آنے لگی۔

دینا ناتھ کو صدمہ سا ہوا۔ شاید وہ جان بوجھ کر بے وقوف بن گیا اور اصلی وجہ بیان کر گیا۔ بدھو کہیں کا۔ شرافت دکھانی چاہی اور عورت کے ایک معمولی اشارے پر قلا بازی کھا گیا۔ اپنی خفت مٹانے کے لئے اُس نے بڑے غرور سے کہا:۔

"رحمان میرا دوست ہے۔ اور دوستی کا تقاضا ہے کہ میں اُس کی اِس مصیبت میں مدد کروں۔"

سوماوتی نے طنز کیا "تو جا کے اُس کی مدد کرو۔ میرے پاس کیوں گھگھیانے آئے ہو۔"

"میں گھگھیانے نہیں آیا ہوں۔ روپئے مانگنے آیا ہوں... روپئے" دینا ناتھ نے للکارا۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔

"میرے پاس خزانہ دھرا ہے کیا۔ یا کوئی روپیوں کی کان ہے"۔ سوماوتی للکار سن کر بالکل نہ ڈری۔

"تمہارے نام پر ڈاک خانہ میں جو روپئے ہیں۔ وہ کیا ہوئے"۔ دینا ناتھ نے پوچھا۔

"تو اب تمہاری نظر اُن پر بھی ہے۔ ساری زندگی میں یہ کچھ روپئے بیوی کے نام رکھ دیئے وہ بھی اب کھٹک رہے ہیں کیا!" سوماوتی کی آواز میں تیز چاقو کی دھار تھی۔ دینا ناتھ تلملا اٹھا۔ دیر ہو رہی تھی اور رحمان کے پاس جانا تھا۔ اِس کے بعد کام پر جانا تھا۔ ٹھیکیدار ناراض تھا۔ دیر سے پہنچنے پر معاف نہیں کرے گا اِس لئے جھگڑا بڑھانے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ اُس نے بیوی کو سمجھانا شروع کیا۔"

"رحمان کو ادھار دینے ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا تو کچھ ہی دنوں میں واپس کر دے گا!"

"پہلے کا ادھار اس نے واپس نہیں کیا اب تک" سوماوتی نے پتی کو یاد دلایا اور دینا ناتھ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سوماوتی کی باتوں میں کچھ کچھ صداقت ضرور ہے۔ لیکن یہ وقت نہ تھا گڑے مُردے اُکھاڑنے کا۔ رحمان بیمار تھا۔ بے آسرا تھا اور اُس کا دوست تھا۔ دوستی کا فرض تھا۔ کہ رحمان کی مدد کسی طور پر کرے۔

"پُرانی باتیں دُہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ روپے دیتے ہیں تو دے دو..... ورنہ میں..."

"ورنہ کیا؟ دوست کی خاطر بیوی کو بیچ دو گے؟" سوماوتی نے بات کی ٹکر لی۔ اور دینا ناتھ کے دل میں بے تحاشہ خیال اُبھرا کہ بیوی کی زبان کھینچ لے۔ زبان نہ تھی تیز دھار کی قینچی تھی اُس سے تو گونگی عورت بھلی!

"میں تمہیں گھر واپس بھیج دوں گا۔ تمہارا میرا نباہ مشکل ہے سمجھی۔" دینا ناتھ نے اپنے زعم میں بڑی چوٹ کی لیکن کبھی بڑی بڑی دھمکیوں سے دب گئی تھی جو آج دب جاتی۔ اُس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"میں بھی دیکھوں تو کیسے بھیجتے ہو مجھے گھر..."

"آج ہی چٹھی لکھ کر کسی کو بلا لاتا ہوں۔ آج سے تیرا میرا ناطہ ختم..." دینا ناتھ نے دھمکی کو واضح کیا۔

یہ رُعب کسی اور پہ جما دینا!" اور سوماوتی کے ہاتھوں سماوار لوٹتے لوٹتے بچا۔ سماوار کا جھنا کا کمرے کی ساری فضا کو جھنجھنا گیا۔ دینا ناتھ نے چہرے پہ بکھرے بال دیکھے موٹی موٹی آنکھوں میں وحشت دیکھی۔ چہرے پہ پھیلے کاجل کی لکیریں دیکھیں۔ گالوں پہ خون کی پرچھائیں دیکھیں۔ جیسے رسوئی کے بلگجے میں اُس کی بیوی نہ تھی بلکہ کوئی ڈائن تھی جو اُس کو چبا جانے پہ تُل گئی ہو۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بیوی کو گھورا اور سپاٹ لہجے میں اپنا فیصلہ سُنایا۔

"ابھی چھٹی لکھے دیتا ہوں۔ اپنا سامان باندھ کے رکھنا۔"

وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہ داری میں مالک مکان کا سارا خاندان کان لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کو اپنے سامنے پا کر اُن میں بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اُن پر برس پڑتا۔ مکان چھوڑنے کی دھمکی دیتا۔ لیکن آج وہ کچھ نہ کر سکا۔ بہت پانی سر کے اوپر سے گذر گیا تھا۔ کوئی چھپ چھپ کے اُس کی باتیں سُنے یا کہیں کوئی دوست دوستی کے بھروسے بیٹھا رہے نور ہے۔ اُسے اب کسی چیز سے غرض نہیں۔ جہاں تک اُس کی ذات کا تعلق ہے اُس کے لئے سارے رشتے ناطے مر گئے۔ صرف ایک کام رہ گیا تھا۔ کہ کسی طور پوسٹ آفس پہنچ جائے۔ کسی طور اِس ڈائن سے چھٹکارا پائے۔ کسی طور آزاد ہو جائے لیکن دِل کے کسی کونے میں رہ رہ کے یہ خیال اُٹھ رہا تھا کہ شاید

پوسٹ آفس پہنچ کر وہ چٹھی نہ لکھ سکے۔ چٹھی لکھ بھی لے۔ تو شاید سمہ ماوتی کے متعلق کچھ نہ لکھ سکے۔ سیماوتی تو اُس کی نس نس میں کسی بڑے دیمک کی طرح رچ گئی تھی اپنی نس نس کو شاید ہی وہ نوچ سکے۔۔۔ شاید ہی نوچ سکے۔



کسی نے چلّا چلّا کر سارا مکان سر پہ اٹھا لیا تب کہیں بلہ کاک کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن وہ ہاتھ پیر ہلا نہ سکا۔ بڑھاپے نے جیسے انگ انگ توڑ کے رکھ دیا تھا۔ اِس پہ مصیبت کہ صبح سویرے اٹھو۔ ٹھنڈ کے باوجود بازار سے سبزی لکڑی خریدنے پھرو۔ واپس آکر بیوی کی ڈانٹ سنو۔ اِس لحاظ سے تو دینا ناتھ کی ماں زیادہ خوش نصیب تھیں۔ ذرا سا چولہا جلالیا۔ دو چار ہانڈیاں اُتاریں اور چھٹی منائی۔ تعجب تو یہ تھا کہ دینا ناتھ کی ماں پہ بڑھاپے کا کوئی اثر نہ تھا اور ایک وہ تھا کہ چند قدم چلنے سے لڑکھڑانے لگتا تھا۔

بدن میں کچھ ہوش سا آگیا تو اُس نے پھرن میں سے کانگڑی نکالی۔ کانگڑی میں سب کوئلے راکھ ہو گئے تھے۔ اُس نے انگلیوں سے راکھ کو کریدا۔ راکھ میں گرمی ضرور تھی پر چنگاری کا نام و نشان نہ ملا۔ شاید چنگاریاں اپنی ہی راکھ میں گھٹ کر مر گئی تھیں۔ بلہ کاک نے سوچا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ اُس کی زندگی اِس کانگڑی کی طرح برباد تھی بلکہ اِس کانگڑی سے بھی بدتر...... اِس کانگڑی کی راکھ کو ہوا دینے کے لئے اُس کی

انگلیاں کوشش تو کر رہی تھیں۔ پر اُس کی اپنی زندگی کی کانگڑی کو کریدنے والا کوئی نہ تھا۔ ہوا دینے والا کوئی نہ تھا۔ بیٹا تھا تو وہ بیوی کو لے کر کہیں موج اڑا رہا تھا۔ بیوی تھی تو اُسے گھر گرہستی سے فرصت نہیں تھی۔ کوئی وقت تھا کہ بیوی اُس سے دو گھڑی جُدا رہنا پسند نہ کرتی تھی۔ اب یہ حال تھا کہ گھنٹوں سُدھ نہیں لیتی۔ کہیں بڑھاپے کے ساتھ ساتھ محبت بھی تو نہیں ٹھنڈی پڑ تی۔

یکایک اُس کے آوارہ ذہن نے پلٹا کھالیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ کوئی بدستور چلا رہا ہے۔ اُسے چاہیئے اُٹھ کے نیچے جائے اور چلانے کی وجہ پوچھ لے۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ اُٹھ نہ سکا۔ اتنی ہی دیر میں سارا بدن ٹھٹھر گیا تھا۔ کاش اُس میں اُٹھنے کی سکت ہوتی کہ کانگڑی میں دو کوئلے ڈال سکے۔ کاش وہ بوڑھا نہ ہوتا ... کاش ... وہ پھر اُٹھا۔ اُس نے ہاتھ تکیئے سے لگائے۔ اور اُٹھنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ بدن کا پور پور جیسے چیخ اٹھی۔ ہڈیوں کی چیخنے کی آواز نے کمرے کی خاموشی میں زندگی سی بھر دی اور اُسے تسکین سی ملی۔ جینے کی خواہش مر جائے تو زندہ رہتے ہوئے بھی انسان مردہ ہے۔ اُس کو چاہیئے ایک ایک پل جیئے۔ اب دن ہی کتنے باقی تھے عمر کے۔ موت سے پہلے مرنا بڑی بے وقوفی تھی۔

سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی اور اُس کے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ "کون ہے ..." بے تحاشہ اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"میں ہوں۔ ڈر لگتا ہے کیا؟" دینا ناتھ کی ماں پھرکی کی طرح کمرے میں داخل ہو گئی۔ بیوی کی تیزی دیکھ کر بلدکاک کے ارادوں کو تقویت سی ملی۔ اُس نے بڑے پیار سے کہا "بڑی عمر ہے تمہاری

تمہارے متعلق سوچ رہا تھا اور تم سامنے آ گئیں۔"

"میں بھی سنوں... کیا سوچ رہے تھے۔" بیوی نے بے اعتباری سے پوچھا۔

"کہہ دوں...." بلدکاک نے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اکڑنے کی وجہ سے ٹانگیں لڑکھڑاہٹ سے لبریز تھیں۔

"کہہ دو...!" دینا ناکھ کی ماں نے حیران ہو کر کہا۔ بھلا ایسی کون سی بات تھی جو نزدیک آ کر کہی جا سکتی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ بلدکاک کی آنکھوں میں نئی چمک سی عود کر آئی تھی۔ پر آنکھوں کے گرد تو بڑھاپے کا جال بدستور تنا تھا۔

"تو سنو..." بلدکاک نے نزدیک پہنچ کر بیوی کے کندھے پکڑ لئے۔ بھرے بھرے کندھوں کے بجائے سوکھی ہڈیاں انگلیوں کی گرفت میں آ گئیں اور اس کا جوش کچھ سرد پڑ گیا۔

بیوی کی یہ حالت دیکھ کر دینا ناکھ کی ماں کچھ گھبرا گئی۔ کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا تھا۔ کندھوں میں نوکیلی انگلیاں بُری طرح سے کھب رہی تھیں۔ جوانی میں اتنی تیز گرفت پسند آتی تھی تو آتی تھی پر اس وقت تو سارے کندھے میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے شانے جھٹکنے چاہے لیکن بلدکاک نے گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی۔ بلدکاک کے ذہن میں یہ خیال سرایت کر رہا تھا کہ کہیں اس کی زندگی کی ہر چنگاری ہی نہ راکھ ہو گئی ہو اور وہ اندھیروں میں ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے تو نجانے پھر کیا ہو کون کون سے ہنگامے جنم لیں گے۔ کیسے فتنے سر اٹھائیں گے بیوی کے کندھے بھرے بھرے نہ سہی پھر بھی سہارے کے لئے کافی تھے قدم آگے

بڑھا کر پیچھے ہٹانا شکست کا اعتراف کرنا تھا اس لیئے اس نے ایک بار پھر بیوی کو یہ کھلا دیا۔

"بتا دوں .... بتا دوں .... بتا دوں۔"

"کچھ کہو گے بھی ....." بیوی گھبرا کر چیخ سی پڑی اور بلدہ کاک کو یقین آ گیا کہ وہ ابھی زندہ ہے اب بھی اس میں اتنا سکت باقی ہے کہ کسی کو اپنے وجود کا احساس دلا سکتا ہے۔ کسی سے اپنی شخصیت منوا سکتا ہے اب بیوی سے مزید چہل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ ہی بغلگیر ہونے کی ضرورت تھی۔ وہ زندہ تھا۔ اس کے ارمان زندہ تھے۔ یہی بہت کچھ تھا اس نے بیوی کے کندھے چھوڑ دیئے اور بات پلٹ دی۔

"بس ذرا .... یہ کہنا تھا ... کہ ... کہ کانگڑی میں کوئلے نہیں ہیں۔"

دینا ناتھ کی ماں کو یقین واثق ہو گیا کہ بلدہ کاک کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا آج۔ ایسے لگتا تھا جیسے کھا ہی جائیگا۔ کندھوں میں ابھی درد سنسنا رہا تھا۔ کاٹ کھانے کو دوڑے تو وہ جان بھی نہیں بچا سکتی۔ بٹیا گھر میں ہوتا تو باپ کو سنبھالتا۔ بٹیا یاد آتے ہی وہ بلدہ کاک کے پاگلپن کو بھول سی گئی "لو چھٹی آئی ہے ... نیچے سیڑھیوں پر پڑی ملی۔"

"تو لیٹ میں پلا رہا تھا لاؤ تو۔" چھٹی کو دیکھتے ہی بلدہ کاک کا لہجہ گھمبیر ہو گیا۔ "دینا ناتھ کی چھٹی ہے۔"

"میں تو پہلے ہی سمجھی تھی۔ بھلا ہمیں اور کون ہے چھٹی لکھنے والا۔" دینا ناتھ کی ماں سہم گئی۔ نہ معلوم بٹیا کس مشکل میں تھا۔ ورنہ چھٹی لکھنے کی اس کی عادت نہ تھی۔

"کیا لکھا ہے ...." اُس کی آنکھ پھڑکنے لگی۔ "اکیلے اکیلے ہی بڑھے گے یا مجھے کبھی کچھ بتاؤ گے" وہ بپتا پہ بے بس پڑی۔ "بہو تو ٹھیک سے ہے۔"

بلدکاک بیوی کی بیتابی پہ ایسے مسکرا دیا جیسے اُس کی ماما کی تضحیک کر رہا ہو "تمہارے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو....." وینا ناتھ کی ماں منہ پھیرنے پہ مجبور ہو گئی۔ آنسو رکنے نہ پاتے تھے۔

ارے پگلی .... "بلدکاک کو رحم سا آ گیا" ہاتھ جوڑ کر نمسکار لکھا ہے بیٹے نے۔ بہو نے بھی لکھا ہے۔

"جگ جگ جئے میرا بیٹا۔ میرا منحوس سایہ نہ پڑے اُس پہ۔ جہاں بھی رہے خوش رہے" وینا ناتھ کی ماں رو پڑی اور بلدکاک کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اُسے یقین نہ تھا کہ وینا ناتھ کی ماں رو پڑے گی وہ تو سمجھتا تھا حسب معمول بہو اور بیٹے کو صلواتیں سنائے گی۔ کئی بار اُس نے خود بہو بیٹے کو کوسا تھا۔ دونوں بوڑھے بے سہارا دن گذار رہے تھے۔ جیسے انہوں نے کسی ننھے کو جنم نہ دیا تھا۔ نہ اُسے پال پوس لیا تھا اور نہ اُس کو بچپن ملنے کا ملا یا تھا۔ نہ ہی کسی ننھے کی شادی چاؤ سے رچائی تھی۔ نہ ہی جیسے کبھی یہ، اپنے ادھورے سپنے منسلک کئے تھے۔ عمر بھر کی ریاضت کے بعد کچھ بھی نہیں ........ کسی ٹنڈ منڈ درخت کی طرح۔ جس کی کوئی ٹہنی نہیں۔ کوئی شاخ نہیں۔ کوئی پھل نہیں۔ بلدکاک نے مرد کی طرح سوچا اور ہر مرد کی طرح اپنے شانے جھٹک کر تلخی کو فراموش کر بیٹھا۔ "اب چپ بھی رہ۔ رونے پیٹنے سے کیا ہو گا

رونا۔ پٹینا تو نیرا کے لئے ہے۔"

"کیا ہوا ...!" وینا ناتھ کی ماں کے منہہ سے بے اختیار نکلا۔

"رحمان مٹی کے ڈھیر تلے دب گیا ہے۔ بستر پر پڑا ہے ...... ویسے بچ گیا ہے۔" بلد کاک کے جواب نے وینا ناتھ کی ماں کے آئینہ پھر سے ابھار دیے۔ اُن کے گھر رحمان کا آنا جانا بچپن سے تھا۔ وینا ناتھ کے ساتھ پلا بڑھا تھا۔ کئی بار نیرا اپنے کام پر جاتے ہوئے بے ماں کے بچے کو اُس کے سپرد کر دیا تھا۔ اور وینا ناتھ اور رحمان میں اُس نے کبھی فرق محسوس نہ کیا تھا بلکہ رحمان وینا ناتھ سے زیادہ پیارا تھا۔ رحمان اُس کی زیادہ عزت کرتا تھا۔ اُس کے کئی چھوٹے موٹے کام کرتا تھا اور کبھی نہ مچلا کرتا تھا۔

"وینا ناتھ کبھی مصیبت میں پھنس گیا ہوگا" بلد کاک نے باپ کی بیٹے کے لئے مخصوص تشویش ظاہر کی۔ "تیمارداری اُس کو کرنا پڑ رہی ہوگی۔ ذرا جلدی سے کانگڑی میں کوئلے ڈال۔ میں نیرا سے مل لوں۔ بغیر کانگڑی کے مجھ سے چلا نہ جائے گا۔"

پتی کی بات نے وینا ناتھ کی ماں کو بے حد رنج پہنچایا۔ خود غرض بننا جا رہا تھا اُس کا پتی۔ رحمان نے کئی دفعہ بلد کاک کے پیر دابے تھے کئی بار دوا دارو لائی تھی۔ حُقے کا پانی بدل دیا تھا۔ ایسی بے لوث خدمت کی تھی کہ اپنا بیٹا بھی نہیں کرتا۔ اور بلد کاک تھا کہ وینا ناتھ کے متعلق تشویش ظاہر کر رہا تھا۔ کہیں واقعی اُس کا دماغ تو خراب نہیں ہو رہا ہے۔ ایک نئی فکر نے اُس کے ذہن جھنجھوڑنا شروع کیا۔

"تمہارے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں کھڑکی میں سے آواز دیتی ہوں نیرا کو۔"

"بلدکاک کانگڑی پھونک رہا تھا کہ نبرا آن پہنچا۔ اُس نے آتے ہی بلدکاک کے ہاتھوں سے کانگڑی چھین لی اور خود پھونکتے ہوئے کہنے لگا۔

"تمہیں دمے کی بیماری ہے۔ کانگڑی نہیں پھونکو۔ لاؤ میں پھونک دوں۔"

بلدکاک سن سا رہ گیا۔ بہت دنوں سے اُس نے نبرا کے ساتھ ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ اُسے پرخاش تھی کہ نبرا اگر رحمان کو دیناناتھ کے ہمراہ سونہ واری نہ بھیجتا تو دیناناتھ اپنے ماں باپ کو یوں بھلا بیٹھتا جب کبھی دونوں ساتھ رہے کچھ نہ کچھ فتنہ کھڑا کر گئے۔ لیکن آج نبرا کے ایثار نے اُسے نبرا کو ٹٹول کر دیکھنے پر آمادہ کیا۔ نبرا کے چہرے پر کوئی خاص تبدیلی ظاہر نہ تھی۔ کچھ جھریوں کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں کچھ اور اندر کو دھنس گئی تھیں۔ داڑھی کے بال کچھ اور سفید ہو گئے تھے۔ شاید نبرا اب بھی وہی نبرا تھا۔ کاٹھ کا اُلو۔ بے اعتنائی برتنے پر بھی کُتے کی طرح حاضر۔ وہ ناحق گھبرا گیا۔ نبرا جیسے آدمی اتنے حساس بن جائیں تو وہ خود کہاں جائے گا۔ کس پر اپنی برتری جتائے گا۔ کیسے ہانکتا پھرے گا۔ دوستی تو بہانہ تھی ورنہ اُن دونوں کا کیا میل۔ وہ خود پڑھا لکھا اور نبرا ان پڑھ۔ یہ دوستی نہیں بلکہ دنیا کی ریت ہوگی کہ طاقتور کمزور پر غلبہ پائے۔

نبرا نے کانگڑی پھونک کر بلدکاک کی طرف بڑھا دی۔ گرمی کی لہروں نے بلدکاک کے فلسفے کی سردی ماند کر دی۔ اُس نے اپنی سوچ بدل کر کہا "نبرا...... دیناناتھ کی چٹھی آگئی ہے۔"

بلدکاک کی بات سن کر نبرا حیران ہو اٹھا۔ دیناناتھ نے اب تک

کتنی چھٹیاں لکھنی ہوں گی۔ اپنے ماں باپ کو نہ لکھے تو کسی کو لکھے گا اور ایک رحمان تھا جو وہاں جا کر ایسے چپ بیٹھا ہے جیسے باپ مر گیا ہو اگر بلدکاک نے بھی کچھ کہنے کے لئے اُسے بُلایا ہے تو وینانا تھ کی ماں کا شک ٹھیک ہے۔ بلدکاک کا دماغ ضرور خراب ہوتا جا رہا ہے۔

"خیریت سے ہے نا وینانا تھ...؟" نبرا نے رسماً پوچھ لیا۔

"رحمان کے متعلق لکھا ہے...." نبرا کے کان کھڑے ہو گئے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنا اشتیاق ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"جلدی کہو.... ٹھیک سے تو ہے؟" نبرا کا ذہن رحمان کی خیر و عافیت میں اتنا اُلجھ گیا کہ بلدکاک کے پاگل پن کو بھی بھول گیا۔

"کچھ زیادہ نہیں ذرا مٹی کے ڈھیر تلے دب گیا ہے.... خطرے سے باہر ہے اور کمزور ہے۔" بلدکاک نے رُک رُک کر کہا کہیں نبرا کو صدمہ نہ پہنچے۔

"اوہ ....." نبرا نے ایک لمبا سانس لیا۔ ذہن ماؤف سا ہو گیا۔

"کافی کمزور ہو گیا ہے۔ اُسے واپس لے آنا چاہئے...." بلدکاک نے اُسے سمجھایا۔

"ہاں..... واپس آنا چاہئے...." حسب معمول نبرا نے بلدکاک کے فیصلے کی تصدیق کی۔

"ابھی تمہیں جانا چاہئے۔ اکیلے تو وہ نہیں آسکتا" بلدکاک نے کہا۔ اور نبرا ٹھٹک سا گیا۔ کچھ (چھپے ہوئے) جذبے کے تحت وہ بوکھلا گیا تھا۔ وہ جذبہ رحمان کے متعلق پوری بات سُن کر پھر سے دب گیا تھا۔

رحمان کو لانا آسان نہ تھا۔ اُس کے پاس جانے کے لئے پیسے نہ تھے۔
بڑی مشکل سے دو وقت کا کھانا مُیسّر تھا۔ اُودھار بھی کوئی دینے سے
رہا۔ اور بلدکاک سے اُودھار مانگنا اُسے منظور نہ تھا۔ بلد کاک پہلا
جیسا بلاکاک نہ رہا تھا اب تو مہینوں صورت دیکھنے تک کا روادار نہ تھا
ویسے کہیں اور سے انتظام ہو بھی جائے تو کشتی شہر میں اکیلی چھوڑ کے
جانا ناممکن تھا۔ کوئی چور اُچکا کشتی نہ سہی چھوٹا انگنکارہ لے کر ہی
بھاگ جائے۔ دفعتاً وہ جھنجھلا اٹھا۔ مر ہی جاتا رحمان تو روز روز
کی مصیبت سے نجات مل جاتی۔ ایک بار ہی رو دھو کے چپ ہو لیتا۔
"دینا ناتھ کے ساتھ آسکتا ہے رحمان۔ میں یہاں کشتی کس کے
بھروسے چھوڑ جاؤں گا" اُس نے نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔
"دینا ناتھ کیسے لے آسکتا ہے۔ اُس کی بیوی ہے وہاں۔ اُس کو
اکیلا چھوڑ کے کیسے آسکتا ہے یہاں اور پھر تو .... پھر تو رحمان تمہارا
بیٹا ہے۔ تمہیں جانا چاہیئے۔"
بلدکاک کے جواب نے نبرا کو خاموش کر دیا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا
تھا بلدکاک۔ بھلا کوئی کیوں لے آئے رحمان کو۔ وہ رحمان کا باپ تھا
اُس نے رحمان کو پیدا کرنے کا گناہ کیا تھا۔ اِس لئے گناہ کی سزا بھی اُسی
کو بھگتنی پڑے گی۔

دینا ناتھ کی ماں نے اُس کی سوچ روک لی "کشتی اسد و کے
پاس چھوڑ جاؤ۔ سمندھی بن رہا ہے تمہارا۔ وہ انکار نہیں کرے گا"
مشکل آسان ہوتی دیکھ کر نبرا کے چہرے پر خوشی کی کوئی علامت
ظاہر نہ ہوئی۔ دراصل وہ بیٹے کو نہ لے آنا چاہتا تھا۔ بیٹے کے

بغیر زندگی کچھ دیر کے لئے ہنگاموں سے محفوظ ہو گئی تھی۔ رحمان کے آنے کے بعد پھر کچھ ہنگامے جنم لینے کا خطرہ تھا۔ باپ کے ناطے وہ کہہ بھی نہ سکتا تھا کہ اُسے بیٹے کے قرب سے تکلیف ہوتی ہے۔ ایک باپ بھلا کیونکر ایسا کہہ سکتا ہے۔ ڈینا نہ کھلی منہ پر۔ بڑی کٹھور تھی ڈینا آرام سے مرنے بھی نہ دیتی تھی۔

"رحمان بیمار ہے۔ گاڑی کا سفر برداشت نہ کر سکے گا" نبرا نے دوسرا بہانہ گھڑ لیا۔ لیکن دینا ناتھ کی ماں نے بہانہ بھی جھٹلا دیا۔ دینا ناتھ کی ماں کے ذہن میں ایک نیا خیال پیدا ہو اٹھا۔ لیکن اُسے یقین نہ تھا کہ بلدکاک اُس خیال کی تائید کرے گا۔ بہو کو دیکھے کافی دن ہو گئے تھے۔ بچوں کے بغیر گھر سنسان... مرگھٹ کی طرح ویران لگتا تھا۔ جس کی چار دیواری میں وہ دو میاں بیوی دو بدروحوں کی طرح

شکارہ ہے تمہارے پاس۔ وہی لے جاؤ اور آرام سے لے آؤ بیٹے کو" اُس نے اپنے خیال کو حقیقت کا روپ دینا شروع کیا۔

"ہاں ٹھیک ہے نبرا..." بلدکاک بیوی کی سمجھداری کا قائل ہو کر بول اٹھا "بڑے آرام سے آسکتا ہے رحمان۔ تم تو بڑے خوش قسمت ہو جو کشتی میں رہتے ہو۔ جہاں جب چاہو جا سکتے ہو گھر بار سمیت"

نبرا پریشان ہو گیا۔ شکارہ لے جانے کو تو لے جا سکتا تھا کیونکہ دریا کا بہاؤ اُس کے ساتھ تھا۔ لیکن واپسی پر بہاؤ کے مقابل کشتی کھینی مشکل تھی۔ اتنی سکت ہوتی تو نوکری اُٹھانے کی نوبت نہ آتی۔ جیسے زندگی بھر کشتی میں سامان ڈھویا کرتا تھا۔ ویسے اب بھی

کے ڈھول سب کو سہانے لگتے ہیں۔ بلد کاک سمجھتا ہے کہ کشتی میں رہنے والے لوگ خوش ہونگے۔ بلدکاک کو کیا خبر۔۔۔۔ بلدکاک کے پاس اپنا مکان ہے۔ اپنا آنگن ہے۔ نہ سیلاب کا خوف نہ طوفان کا ڈر اور نہ ہی ڈوب جانے کی فکر۔ ایک وہ خود ہے کہ ساری زندگی ڈولتا رہا۔۔۔ بہتا رہا۔ نہ کوئی جگہ نہ کوئی سہارا۔ گھاٹ گھاٹ دربدر یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ بلدکاک نے انجانے میں ایک ایسی رگ کو چھیڑا جس میں پیپ اور جلن دوڑتی پھر رہی تھی۔ بلدکاک زندگی بھر اس کا یہ درد نہ سمجھ سکا اب بڑھاپے میں کیا سمجھ پائے گا۔ اس لئے نبرا نے کاک کے بجائے کاک کی بیوی سے کہا۔

"بھابی۔ میں کشتی بھاڑے کے مقابل واپس نہ لے آسکوں گا اور مزدور کرائے پر لینے کے لئے پیسے نہیں رہ

یہی سوچ رہی تھی" وینا ناتھ کی ماں نے بلدکاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" یہ جائیں گے اور بہو کو لے آئیں گے۔ کیوں نہ تمہارے ساتھ ہی شکارے پر۔"

میں نہیں جاؤں گا" بلدکاک بھڑ پڑا۔" تم نے مجھے کتا سمجھ رکھا ہے کیا۔۔۔ مجھے بے عزت کرنا چاہتی ہو۔"

" اپنی بہو کو لانے جانا ہے تو اس میں بے عزتی کی کون سی بات ہے" وینا ناتھ کی ماں بھی بپھر گئی۔ مشکل سے تو ایسا موقعہ ہاتھ لگا تھا اور بلدکاک اپنی ہٹ دھرمی سے اس موقع کو کھو رہا تھا خود بھی آرام سے کشتی پر جا سکے گا اور بہو کو بھی آرام سے کشتی پر لاسکے گا۔

" باوے ہے بیٹا بیوی کو لے کر تمہیں کیسے یہاں چھوڑ گیا۔۔ بلدکاک

نے اپنے زعم میں بڑی چوٹ کی۔

"ہاں ہاں یاد ہے۔" وینا ناتھ کی ماں چمک اٹھی۔ "اپنے ماں باپ سے نہ روکتے تو اور کس سے رُوکتے گا...... بچہ ہی تو ہے ابھی؟"

"ابھی بچّہ ہے..... ہوں......" بلدکاک نے ناک چڑھا کر کہا۔ باپ بننے والا ہے۔ باپ .... اور تم بچہ کہہ رہی ہو اُسے۔"

"تبھی تو تمھیں جانا چاہیئے۔ بہو کا وقت نزدیک آ رہا ہے۔ وہاں گاؤں میں کہیں کچھ ہو گیا تو لوگ کہیں گے۔ ساس سسر نے جان بوجھ کر مار ڈالا بہو کو۔"

بلدکاک بیوی کی بات سن کر ٹھٹک سا گیا۔ ویسے ہی سمبندھیوں سے تعلقات کچھ اچھے نہ تھے۔ آج بہو کی خبر نہ لی تو عمر بھر بات رہ جائے گی۔

بیٹا بھی نہ معلوم کیا سمجھ بیٹھے گا۔ اُسے تو ماں باپ کو چھوڑنے کا بہانہ چاہیئے۔ آج کل کی پود میں بزرگوں کا لحاظ عنقا تھا۔ اُسے جانا چاہیئے کم از کم دنیا کو دکھانے کے لئے جانا چاہیئے۔ چاہے بہو آئے یا نہ آئے پر دل مانے بھی.....

"تم ہی جاؤ نا..... میں بیمار آدمی کہاں کہاں گھومتا پھروں گا۔" اُس نے کہنے کو تو کہہ دیا۔ پر لہجے میں پہلی جیسی تُرشی نہ تھی۔

"سٹھیا گئے ہو کیا۔" وینا ناتھ کی ماں تنک سی گئی۔ "میں جاؤں تو تمہارا یہاں کون خیال رکھے گا۔ کھانا کون پکائے گا۔ کانگڑی تک تو چھنی نہیں جاتی۔ جو لھا پھونک سکو گے کیا......؟"

نیرا میاں بیوی کے جھگڑے کو دیکھ کر اُکتا سا گیا۔ وہاں اُس

کے بیٹے رحمان کی جان پر بن آئی تھی اور یہاں یہ لوگ دنیا داری کی باتوں میں اُلجھ رہے تھے۔ بڑے خود غرض تھے یہ لوگ۔ اُس کے جی میں آیا کہ اُٹھ کے چپکے سے چل دے۔ اِن جیسے لوگوں کے ساتھ اُس کا کوئی سمبندھ نہ تھا۔ کوئی میل نہ تھا۔ لیکن دینا ناتھ کی ماں کے آخری جواب کے انداز نے اُس کے قدم نہ اُٹھنے دیئے۔ ذہن میں عجیب سی ہلچل مچا دی دینا ناتھ کی ماں کے نخروں نے ۔۔۔۔ کتنا پیار، کتنی فکر کتنی شوخی بھری تھی اِس آخری جواب میں۔ عورت کا سارا وجود اُبھر آیا تھا اِن کچھ الفاظ میں۔ بڑا خوش نصیب تھا بلدکاک جو بڑھاپے میں بھی اُسے کسی کے پیار کا سہارا میسّر تھا۔

"تم کہتی ہو تو جاؤں گا" بلدکاک نے ہتھیار ڈال دیئے لیکن چہرے پر خفگی کے بجائے میٹھی سی مسکراہٹ تھی یا شاید اُس کی اپنی پھیکی زندگی پر طنز تھا۔ اکیلے پن پر چوٹ تھی سارے کمرے میں اِس مسکراہٹ نے پیار کی لہریں سی رواں کر دیں جن میں دونوں میاں بیوی اُس کے وجود سے بے نیاز ڈول رہے تھے۔ اُس کے دل میں بے تحاشہ خیال اُبھرا کہ اپنے وجود کی ویرانی بکھیر کر کمرے کی فضا کو قاتل بنا دے اِن کی خوشی سہی نہیں جاتی تھی۔ اُس نے کرخت لہجے میں کہا۔

"بھابی ۔۔ اتنی خود غرضی اچھی نہیں۔ میں نے کہا نا کشتی بہاؤ کے مقابل نہ لا سکے گا۔۔۔۔ تو جاؤں کیسے۔"

"میں بتاؤں ۔۔۔۔" دینا ناتھ کی ماں کا جواب نہ تھا بلکہ التجا تھی "بس سے جانے میں کرایہ لگتا ہے۔ وہ واپس لوٹتے وقت مزدور کو دینا کشتی آرام سے واپس پہنچ جائے گی۔"

نبرا کورے انکار پہ آمادہ تھا لیکن وینا ناتھ کی ماں کے چہرے پہ ماتا کی پرچھائیں رقصاں دیکھ کر رک گیا۔ وینا ناتھ کی ماں کی آنکھوں کے کناروں پہ آنسوؤں کے قطرے ستاروں کی طرح تھرک رہے تھے۔ اُس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا جلن ہو رہی تھی لیکن ستاروں سے بھرے آنکھوں میں ماتا کا اتھاہ سمندر بھی جھلک رہا تھا اُس کا جی نہ چاہا کہ انکار کر کے اِس سمندر میں طوفان بپا کر دے۔ طوفانوں سے اُسے نفرت تھی۔ بے حد نفرت۔ طوفان کشتیوں کو توڑتے ہیں۔ آدمی ڈبو دیتے ہیں۔ وہ خود طوفان میں گھرا ہوا ہے تو اِس میں بلدیکاک کا قصور نہیں۔ بلدیکاک کی بیوی کا قصور نہیں۔ رحمان بیمار تھا وہ آج نہ جائے کل تو جانا پڑے گا۔ بیٹے کو ایسی حالت میں وہاں چھوڑ تو نہیں سکتا۔ بیٹا لاکھ بُرا سہی پر اپنے بدن کا ٹکڑا ہے۔ اگر کسی کو اُس کے آج جانے سے خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو اُس کا کیا جاتا ہے وہ خود خوش نہ سہی۔ کوئی اور تو خوش ہو گا۔ یہ بھی بہت تھا۔ اُس نے جانے کی حامی بھر لی۔



موسم بہت اچھا تھا۔ کئی دنوں کے بعد سورج نے منہ پر سے
بادلوں کا آنچل سرکا لیا تھا۔ چاروں اور دھوپ پھیلی ہوئی تھی جس
نے ساری کائنات کو اُجلی چمک بخش دی تھی۔ نمی دھوپ کے ڈر سے
مارے بُخارات بن بن کر اُڑی جا رہی تھی۔ اُڑتے بخارات کے بیچ زمین
تھرتھراتی نظر آتی جیسے سورج کی تمازت سے جی اُٹھ رہی ہو۔ سارے گاؤں
میں اُبال سا آ گیا تھا۔ بچوں کا شور و غل انگڑائی لے رہا تھا۔ ارمان
جاگ رہے تھے۔ اور زندگی سرگوشی بن کر سارے گاؤں میں گھومتی پھرتی
خاموشیوں کے پردے سرکاتی پھر رہی تھی۔

کھڑکی سے دھوپ کا چوکور قلعہ کمرے کے وسط تک پھیلا ہوا تھا
جس کی روشنی میں کمرے کی کھُردری دیواریں اُبھرتی سی محسوس ہو
رہی تھیں۔ اندھیرے کونے واضح ہو رہے تھے اور گرم رویں کمرے
کی یخ بستہ فضا میں ارتعاش سا پیدا کر رہی تھیں۔ لیکن رحمان اِن
سب چیزوں سے بے نیاز تکیے سے سر لگائے کالی چھت کو گھور رہا تھا۔
جہاں دھوپ کے چوکور قلعے کے بیچ پڑی چینی کے خالی پیالے کی

پرچھائی جم سی گئی تھی۔ رحمان کو کئی بار خیال آیا کہ چھت پر پیالے کی پرچھائی نہیں، اُس کی اُمید کا تارہ ہے۔ کالی کھردری چھت پر پیالے کی پرچھائی کسی ننھے تارے کی طرح جگمگا رہی تھی۔ چھت کو لگاتار گھورتے رہنے سے اُس کی آنکھیں دُکھنے کو آئیں پر آنکھیں جھپکائی اُسے منظور نہ تھیں۔ کیا معلوم آنکھ جھپک گئی۔ ننھا تارہ کھو جائے اور وہ پھر اپنے ذہن کے اندھیروں میں ڈوبنے لگے۔

اُمید کے تارے آنسو بن بن کر اُس کی آنکھوں سے بہے۔ تارہ دھندلا گیا تب کہیں وہ کروٹ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ کھڑکی میں سے روشنی کا سیلاب اندر آ رہا تھا۔ اُس کی تھکی آنکھیں چُندھیا گئیں اور وہ جھنجھلا اٹھا۔ نہ اس کروٹ چین تھا نہ اُس کروٹ۔ جان اُلجھن میں پھنس گئی تھی۔ اُس نے غصے سے ٹانگوں پر سے لحاف دور پھینک دی پاجامہ گھٹنوں سے اوپر چڑھ آیا تھا اور ٹانگیں ننگی تھیں سردی کی لہروں نے ٹانگوں پر بالوں کو کھڑا کر دیا۔ ٹانگیں سوکھ گئی تھیں۔ گھٹنوں اور ایڑیوں کے گرد میل کی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔ اُسے ٹانگوں سے نفرت سی ہو گئی۔ نہ معلوم وہ دن کب آئے گا جب وہ اسی کمرے سے باہر نکل کر دریا پر جا سکے گا اور رگڑ رگڑ کر بدن کو صاف کر سکے گا۔ اُس نے شانے جھٹک دیئے اور کھڑا ہونا شروع کیا لمحہ بھر کے لیئے اُس کا سر چکرا گیا لیکن اس نے دیوار کے سہارے اپنے توازن کو برقرار رکھا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی آوازیں اُسے ترغیب دے رہی تھیں کہ اُٹھ کے باہر جائے۔ باہر جا کر بچوں کے ساتھ کلیلیں کرتا پھرے۔ عورتوں سے چُہل کرے اور جوانوں

سے لڑ پڑے۔ تاکہ اس کی ہڈیاں چٹخ جائیں۔ اتنے دن بستر پہ لیٹنے
سے سارا بدن ٹوٹ سا گیا تھا۔

دفعتاً سیڑھیوں پہ آہٹ ہوئی اور وہ دھم سے بستر پہ گر گیا۔
شاید بڑھیا تھی یا شاید پھوپی ہو وہ اندازہ نہ لگا سکا۔ دروازہ
بند تھا۔ اس نے جلدی سے لحاف ٹانگوں پہ کھینچا اور پکارا۔
"کون ہے ......"

دل دھک دھک دھڑک رہا تھا۔ کہیں پھوپی یا بڑھیا اسے
کھڑا دیکھ لے تو غضب ہو جائے گا۔ اور بھرم ٹوٹ جائے گا وہ تو
جان بوجھ کر اس گھر کے مکینوں سے اپنی حالت چھپائے بیٹھا تھا نہیں
تو وہ کئی دنوں سے اٹھ بیٹھ سکتا تھا۔ کمرے میں گھوم پھر سکتا تھا۔
حتیٰ کہ باہر جانے کی سعی کرے تو گاؤں بھر کا چکر کاٹ سکتا تھا۔
ذرا سی کمزوری باقی تھی ورنہ وہ اب بالکل ٹھیک ہو گیا تھا لیکن
بستر چھوڑ دے تو کیسے۔ اس بستر کے سہارے وہ کئی دنوں کو روکے
بیٹھا تھا۔ گاؤں والوں کا قرضہ تھا۔ مکان کا کرایہ تھا۔ دوائی دارو
کا خرچہ الگ تھا اور کیا معلوم بڑھیا اسے ٹھیک ہوتا دیکھ کر کھانے
پینے کا خرچ بھی مانگ بیٹھے۔ کئی تقاضے تھے جنہیں پورا کرنے کے لئے
اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ کمرے سے باہر جائے تو کس آسرے
پہ۔ دنیا ناتھ نے بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔ شاید ٹھیکیدار کے پاس بھی
نہ گیا ہو۔

دروازہ کھل گیا۔ اندر پھوپی کا بدن عیاں ہو گیا۔ پھوپی حسب
معمول چپ چاپ سر جھکائے اس کی آواز کی منتظر رہی۔ پھوپی کی یہ

اور اُسے بہت پسند تھی۔ جب کبھی پھُولی اُس کے سامنے آتی تھی تو آنکھیں نیچی کئے ہوئے۔ بدن سمیٹے ہوئے چُپ چاپ کھڑی رہتی تھی جیسے شرما رہی ہو۔

"اِدھر تو آنا ......"

اُس کی آواز نے پھُولی کو کمرے کے اندر کھینچ لیا۔ میلے کچیلے فرن میں بھی وہ اچھی لگ رہی تھی۔ بال حسبِ معمول پریشان تھے۔ حسبِ معمول چہرہ جیسے کالک میں لتھڑا تھا۔ رحمان کو محسوس ہوا کہ پھُولی کچھ کچھ فربہ ہوتی جا رہی ہے۔ بدن پر کچھ اور گوشت چڑھ گیا ہے۔ سینے کے نشیب و فراز ڈھیلے ڈھالے فرن کے باوجود نمایاں تھے۔ شانوں کی گولائی اور کولھوں کا اُبھار بھی پھوٹ پڑ رہا تھا۔ اُس کا دِل ڈانوا۔ ڈول ہو گیا۔ نہ معلوم وہ پھُولی کو دیکھ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر کیوں ہو جاتا تھا۔

"کیا چاہیئے ......" پھُولی بدستور سر جھکائے رہی۔ رحمان سے کوشش کے باوجود وہ آنکھیں نہ ملا سکتی تھی۔ اُسے یقین سا ہو چلا تھا کہ اگر وہ رحمان کو نہ ڈانٹتی تو رحمان کو حادثہ پیش نہ آتا۔

"کیا چاہیئے ......" رحمان نے زیرِ لب بڑبڑایا۔ اُسے کیا کچھ نہ چاہیئے تھا۔ پھُولی جان، تو شاید ایک بار اور لڑ پڑے۔ اِس لئے اُس نے بڑی بے چارگی سے کہا "کھڑکی تک سہارا چاہیئے۔ مجھ سے اُٹھا نہیں جاتا۔" کہنے کو تو رحمان کہہ گیا لیکن دل کی دھڑکن بُری طرح سے تیز ہو گئی۔

پھُولی کے چہرے پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہوا۔ اور رحمان کا حوصلہ

ذرا بڑھ گیا۔ پھوپی آگے بڑھ آئی۔ اُس کے ہاتھ رحمان کے ہاتھ میں آ گئے اور وہ ہچکچاتے ہوئے اُٹھا۔ ہاتھوں میں ہاتھ سہی۔ یہ دونوں کا فاصلہ تو میلوں تھا۔ رحمان میں برداشت کی قوت ختم ہو گئی۔ کھڑکی تک صرف چند قدم تھے لیکن وہ ہر قدم پر لڑکھڑا گیا جتنے کھڑکی تک پہنچتے پہنچتے پھوپی اُس کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ جی نہ چاہا کہ اب کبھی پھوپی سے جدا ہو اور پھوپی کی اُلجھن بڑھی۔ بیماری کی وجہ سے رحمان سوکھ تو گیا تھا پھر بھی اُس کا وزن بہت تھا۔ سارا وزن اُس پر جھول گیا تھا بازوؤں کی گرفت کمر کو کاٹے ڈال رہی تھی وہ غصے سے بول پڑی۔ "کھڑکی آ گئی ہے۔۔۔"

رحمان کے ذہن کو جیسے کسی نے چابک مار دیا۔ اُس کے ہاتھ ایک دم پھوپی سے جدا ہوئے لیکن نگاہیں پھوپی کے بدن سے نہ ہٹ سکیں۔ کاش پھوپی کا سہارا میسر ہوتا تو وہ اپنے آپ کو اتنا بے بس نہ محسوس کرتا۔

رحمان کی ٹٹولتی نگاہیں اپنے بدن پر مرکوز پا کر پھوپی گھبرا سی گئی پیٹ میں بچہ اُچھلتا سا محسوس ہوا۔ غیر ارادی طور پر اُس کے ہاتھ پیٹ کے سامنے ان کو سمیٹنے کی خاطر بڑھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر یہ رحمان کے پاس بیٹھی رہے۔ عبدالسلام کی قربت نے اُس کے جسم میں کچھ ایسی رگوں کو گدگدایا تھا کہ وہ موقعہ بے موقعہ جذبات کی شدت سے بے قابو ہونے لگتی تھی۔ انگ انگ میں وحشت بھر اٹھتی۔ بدن ٹوٹنے لگتا کسی کرخت گرفت کی طلب محسوس ہوئی جو اُس کے بدن کو جکڑ کر بکھرنے سے روکے۔ بدن کو ٹوٹنے سے روکے۔ کاش وہ رحمان کی کرخت گرفت

میں جھول جائے۔ کاش پیٹ میں بچہ نہ اُچھلے .... کاش ....

کاش وہ عبدالسلام کی مونچھیں اُکھاڑ سکے .... کاش وہ ہر اُس مرد کی مونچھ اُکھاڑ سکے۔ جن کی وجہ سے اُس کا بدن چھلنی ہو گیا تھا رحمان کی ٹٹولتی نگاہیں نہ تھیں۔ نیشتر تھے جو اُس کے بدن کو چھلنی کر رہے تھے۔ اُسے رحمان سے نفرت سی ہو گئی اور وہ منہ پھیر کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

"میرے پاس نہیں بیٹھو گی ......" رحمان کی آواز میں کئی دُکھ عیاں تھے۔ وہ سہہ نہ سکی۔ ویسے ہی اُس کو کیا کم دُکھ سہنے پڑ رہے تھے۔ ماں کا ڈر، درد کی جلن۔ رُسوائی کا خوف ..... ایک دُکھ ہوتا۔ ایک ڈر ہوتا تو وہ شاید عبدالسلام کی دغا کو نظر انداز کر کے رحمان کی طرف جھک جاتی..... لیکن اتنے سارے دکھ اور وہ ننھی سی جان۔ نہ معلوم یہ مرد کیوں اتنے کمینے ہوتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو عورتوں کی ہڈیوں سے گوشت چن چن کے نوچ لیں اور ہڈیاں تک چبا جائیں ..... درندے ......

"میں تمہاری نوکرانی ہوں کیا..... ہوں" لہجے میں مرد ذات کے برخلاف عورت کے وجود کی بھرپور نفرت جھلک رہی تھی۔

رحمان کا منہ اترتے دیکھ کر وہاں مزید نہ رُک سکی۔ ڈانٹنے کو تو اُس نے رحمان کو ڈانٹ دیا لیکن دل پشیمان ہو رہا تھا۔ بھلا رحمان کا کیا قصور ..... یہ ٹھیک تھا کہ رحمان اُسے دیکھ کر بے قابو ہونے لگتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں درندگی اُمڈ آتی تھی۔ نتھنے کسی بھوکے کتے کی طرح پھڑکنے لگتے تھے اور ہاتھ بے تحاشہ نوچنے کو آگے بڑھتے تھے۔ پھر بھی

رحمان کی زندگی ایک عجیب ہچکچاہٹ سے لبریز ہو گئی تھی۔ اُس کی وحشت میں پیار بھی شامل تھا اُس کے بڑھتے ہاتھوں میں نرمی کی خفیف سی احساس بھی تھی۔ یقیناً اُسے رحمان کی نگاہوں میں عبدالسلام کی نگاہوں جیسی کریہہ بھوک کبھی نہ نظر آئی۔ اور بڑی بات تو یہ تھی کہ رحمان کی بڑی بڑی ڈراؤنی نوکیلی مونچھیں نہ تھیں۔ واقعی کوئی قصور نہ تھا رحمان کا اگر کسی کا قصور تھا تو اُس کا اپنا تھا۔ خود اپنے آپ کو رحمان کے بارے عبدالسلام بھوکے گِدھ کو سونپ دیا۔ کاش وہ ایسا نہ کرتی کاش ماں اُسے سنگھاڑے اکٹھے کرنے پر مجبور نہ کرتی۔ کاش اُسے بھوک نہ لگتی.... کاش۔ اپنی بے بسی۔ بے کسی محسوس کر کے وہ سیڑھیوں پر ہی بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے پر مجبور ہو گئی۔

چھوٹی عورت تھی۔ رو دھو کر اپنے غم غلط کر سکتی تھی۔ روتے ہوئے کوئی دیکھ لے تو پان میں منہ چھپا کر رہ سکتی تھی۔ پر رحمان مرد ہونے کے ناطے رو دھو نہیں سکتا تھا۔ آنسو بہانا اُس کا شیوہ نہ تھا۔ اُسے چاہیے لڑ جھگڑ کر اِس گورکھ دھندے میں سے اپنا راستہ بنا لے۔ لیکن لڑ جھگڑے تو کس کے ساتھ۔ کوئی حریف تو سامنے ہو۔ سب نے اُسے خارش زدہ کُتے کی طرح نظرانداز کر دیا تھا۔ خارش زدہ کُتا.... ورنہ و بنا ناتھ کیوں آنکھیں پھیر لیتا..... کُتا... ہوں ہاں اور کھڑکی پر بیٹھے بیٹھے اُسے بہت دنوں بعد بھولو یاد آیا۔

رحمان اور و بنا ناتھ جب بچپن کی حدود ہی پھلانگنے میں مصروف تھے تو اُن دنوں اُن کے محلے میں ایک تنومند کُتا ہوتا تھا جس کا نام محلے والوں نے بھولو رکھ دیا تھا۔ وہ بڑا لڑاکا کُتا تھا

ہر ایک کا ناک میں دم کر رکھا تھا اس نے۔ کیا مجال جو کسی غیر شخص
کو محلے میں آنے دیتا۔ کوئی دن نہ جاتا تھا جب وہ کسی کے پیچھے
نہ لپکتا یا کسی کا دامن نہ پھاڑ ڈالتا۔ محلے کے بڑے بوڑھوں نے
اسے کئی بار مروانا چاہا پر ہر بار وہ بچ جاتا تھا۔ کبھی زہر بھرا گوشت
کوئی دوسرا کتا کھا جاتا اور کبھی بھولو زہر بھرا گوشت کھاتے ہی قے کر دیتا۔
بارہا اسے محلے کے بچوں نے زہر ملا گوشت کھانے سے روکا تھا۔
جہاں محلے کے بڑے بوڑھے بھولو سے خائف تھے وہاں محلے کے بچے
اس سے مانوس تھے۔ بچے اس کو پونچھ سے کھینچتے۔ گھسیٹتے۔ اس
کے کان مروڑتے۔ اس کی تھوتھنی میں بے خطر ہاتھ ڈال کر دانت
گنتے۔ لیکن بھولو بے حس وحرکت مردے کی طرح بچوں کی زیادتیاں
برداشت کرتا رہتا۔ حتےٰ کہ بچے اس کی پیٹھ پر گھوڑے کی طرح سواری
کیا کرتے تھے۔ اور بھولو خوشی خوشی اُن کو گلی کوچوں میں لئے لئے
پھرا کرتا تھا۔

ایک دن شہر میں کوئی سرکس آ گیا۔ دینا ناتھ اپنے باپ
کے ساتھ تماشا دیکھ آیا لیکن رحمان نہ دیکھ سکا۔ اس کے باپ
کے پاس سرکس دیکھنے کے لئے فالتو پیسے نہ تھے مصیبت تو یہ ہوئی
کہ دینا ناتھ اٹھتے بیٹھتے سرکس کی رٹ لگائے پھرتا تھا۔ کبھی ہوائی
جھولے کے قصے سناتا۔ کبھی شیروں کی خوفناک دھاڑ کا ذکر کرتا۔ اور
کبھی دوڑتے گھوڑوں پر کرتب کرنے والی لڑکیوں کا ذکر کرتا۔ اور
خوب بڑھا چڑھا کر ذکر کرتا تھا۔ رحمان کو کئی بار دینا ناتھ کی باتوں
کا یقین نہ آیا۔ بھلا ہو سکتا تھا شیر دھاڑتے ہوں۔ جھولے جھولتے ہوں

پر دوڑتے گھوڑوں پر کہاں اُچھلا جا سکتا ہے جبکہ بھولو کی پیٹھ پر اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وینا ناتھ لاکھ کہے پر وہ مانے تب بھی؟ ناچار وینا ناتھ کو اپنی سچائی جتانے کے لئے بھولو کو کھڑا کرنا پڑا۔ خود دور سے دوڑتے ہوئے آیا اور بھولو کی پیٹھ پر چھلانگ لگائی۔ تڑاخ کی آواز آئی اور وینا ناتھ بھولو سمیت زمین پر گر گیا رحمان نے قہقہہ مارا۔ وینا ناتھ کھسیانا ہو کر کپڑے جھاڑنے لگا لیکن بھولو نہ اُٹھ سکا۔ وہ زمین پر پڑا پڑا کراہ رہا تھا۔ شاید اُس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وینا ناتھ گھبرا کر بھاگ گیا۔ اور رحمان بھولو کے پاس اکیلا رہ گیا۔ اُس نے کئی بار بھولو کو چمکارا.... تھپکا اور اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن بھولو اٹھ نہ سکا۔ صرف زبان نکال کر زمین کو چاٹ رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر رحمان دوڑا دوڑا گیا اور دریا کنارے سے اپنی ٹوپی میں پانی بھر لایا۔ لیکن بھولو نے....

جب بھولو کی لاش بھنگی نے دریا برد کر دی تو رحمان ڈاڑھیں مار مار کر رویا اور وینا ناتھ اپنے گھر میں بیٹھا محلے کے بہت سارے بچوں کو سرکس کی باتیں سنا رہا۔ جیسے بھولو اُس کا اپنا نہ تھا۔ جیسے بھولو اُس کو پیٹھ پر لاد کے محلے کی سیر نہ کراتا تھا اور جیسے بھولو اُن لوگوں کی آواز سن کر میلوں دور سے دوڑتا ہوا نہ آتا تھا۔ یا جیسے بھولو کی جان اُن کی کھیں کو دنے نہ لی تھی۔ جیسے کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ بھولو کتا تھا اور ایک کتا مر گیا تھا اس میں رونے کی کون سی بات تھی۔ بہت دنوں تک محلے کے بچوں نے اُس کا مذاق اُڑایا۔ اتنا مذاق اُڑایا..... اتنا مذاق اُڑایا۔ کہ وہ بھی اپنی حرکت پر کھسیانا ہو گیا۔

بیتی باتیں دُہرانے سے اُس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔
ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی زندگی بھولو سے بھی بدتر ہے۔ بھولو کی موت پر وہ رو رہا تھا لیکن اُس کی موت پر شاید کوئی نہ روئے۔ نہ بھولی روئے گی۔ نہ بڑھیا روئے گی۔ شاید وتیانا تھ کی آنکھوں میں بھی آنسو نہ آئیں۔ اور کون تھا اس گاؤں میں اُس کا اپنا۔ اُس کی آنکھوں میں بے تحاشہ آنسو اُبھر آئے۔ چاروں اور پھیلی دھوپ کی اُجلی چادر ماند سی پڑ گئی کائنات کا ہر رنگ دُھندلا گیا اور مکان کے سامنے کیچڑ بھرے آنگن پر دُھند کے بادل سے چھانے لگے۔
دُھند کے دبیز تہوں میں بوڑھے باپ کا لڑکھڑاتا وجود اُبھرتا محسوس ہوا۔ شاید وہ بھی اُس کی موت پر نہ روئے جیسے وہ اپنے ذہن کی خودغرض سلوٹوں میں کبھی کا بھول چکا تھا۔ ٹھیک ہی تو تھا بھلا کیوں روئے اُس کا باپ۔ کیا اُنس تھا بوڑھے باپ کو بیٹے سے کون سا مطلب پا رہا تھا وہ بیٹے سے۔ وہ باپ کا لاڈلا کبھی نہ تھا اور نہ کبھی بن سکا شاید اُس کا اپنا وجود بوڑھے باپ کے لئے نفرت کا وجود تھا۔ وہ ماں کے مرنے کے بعد زندہ نہ رہتا تو شاید بوڑھا نیا گھر بساتا۔ نئی شادی کرتا۔ نئے بچے پیدا کرتا۔ شاید یہ بھی ایک وجہ تھی جو باپ نے چار مہینے بیٹے کی سُدھ نہ لی۔ بوڑھا مرجائے تو شاید وہ خود بھی نہ روئے۔
بیٹا ہونے کے ناطے باپ کے متعلق ایسے خیالات ..... تیز دھوپ کی تمازت کے باوجود ندامت کی یخ لہر اُس کے بدن کو منجمد کر گئی۔ انگ انگ میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ کاش

بوڑھے کا لڑکھڑاتا وجود بھی دھندلکے میں گم ہو جائے جذب ہو جائے اور وہ اکیلا ...... بالکل اکیلا اپنے وجود کی ویرانیوں میں بھٹکتا پھرے لیکن نہ معلوم کیوں باپ کا لڑکھڑاتا وجود ڈوب جانے کے بجائے اُبھرتا جا رہا تھا۔ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے قمیض کے دامن سے آنسو پونچھ لئے اور یکایک وہ چونک پڑا۔

اُس کا باپ ایک چھوٹی سی گٹھڑی بغل میں دابے ایک بڑے چھو کے سہارے کیچڑ بھرے آنگن کو پھلانگتا جا رہا تھا۔ وہی نیلی دھاری دار قمیض۔ وہی سفید شلوار جو میل کی بقعار تلے مٹیالا رنگ اختیار کر چکی تھی اور وہی لال کھدّر اسکٹ ... جس کی گہری جیبوں میں وہ خود بہت پہلے۔ بچپن میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر باپ سے چوری چھپے پیسے تلاش کیا کرتا تھا ..... یا شاید چوری کرتا تھا۔ چوری کا احساس ہوتے ہی وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ گال تمتما گئے اور سارے بدن میں بے چینی کی لہر سی دوڑ گئی۔ شاید سورج کی تمازت کا اثر تھا۔ اُس نے سوچنے کی کوشش نہ کی۔ باپ کی آمد نے اُس کے ذہن کو ماؤف سا کر دیا تھا۔

" کیسے آئے ..... " کمرے میں باپ کو داخل ہوتے دیکھ کر اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا اور ساتھ ہی وہ کھسیانا سا ہو گیا۔ باپ بیٹے سے ملنے نہ آئے تو کون آئیگا۔ اُسے چاہئے باپ کی خیر و عافیت دریافت کرے۔ اُس کی صحت کا حال پُوچھے۔ باپ کے چہرے پر بڑھاپے کی چھاپ اور واضح ہو گئی تھی۔ شانے کچھ اور جُھک آئے تھے اور سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ بے چارہ .... اب تو کچھ

سیڑھیاں بھی چڑھ نہیں پاتا...... اس کو باپ کی حالت پر رحم سا آ گیا۔"

نبرے نے بیٹے کو دیکھ لیا تو بھونچکا رہ گیا۔ رحمان گھاس کے تنکے جتنا رہ گیا تھا۔ گوشت ہڈیوں سے اُدھڑ چکا تھا اور پوست ٹکتا لٹکتا لگتا تھا۔ چہرے پر زردی کی چھاپ تھی اور آنکھیں چہرے کی ہڈیوں میں ڈوبی ڈوبی لگتی تھیں۔ جی چاہا جا کے بیٹے کو گود میں اٹھا لے سینے سے چمٹا لے۔ اور اپنی دھڑکنوں سے اُس کے سوکھے بدن میں زندگی رواں کر دے۔ اپنے خون سے اُس کے بدن کو سینچے۔ ایک ایک سانس نچھاور کر دے بیٹے پر۔ لیکن وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ رحمان کے الفاظ نے ماں تا کے ہر سوتے کو جیسے پتھروں سے ڈھک دیا ہو وہ کمرے کے وسط میں جان بوجھ کر کھڑا رہا۔ رحمان سایہ ضرور لگتا تھا لیکن اس سائے میں بڑی تیکھی چبھن تھی۔

باپ کو بدستور کھڑے دیکھ کر رحمان نے اپنی غلطی سدھاری "بیٹھیے..... میں بغیر سہارے کے اُٹھ نہیں سکتا۔"

نبرے کو جھٹکا سا لگا۔ بیٹا اتنی بُری حالت میں اور وہ نخرے کرتا پھرے۔ وہ اور نہ سہہ سکا۔ رحمان کی بے بس آواز نے اُس کی ماں تا کے سوتوں کو آبشار کی روانی دی۔ اُس کے قدم آگے بڑھ گئے اور رحمان اُس کی لپیٹ میں آ گیا۔ بوڑھے ہاتھ بیٹے کے انگ انگ کو چھونے لگے..... انگ انگ کو سہلانے لگے۔

—.:.—

بُڈھے کی آنکھ حسبِ عادت سویرے کھُل گئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کو کچھ نہ دکھائی دیا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ شاید باہر روشنی پھیل گئی تھی لیکن صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا سردی روکنے کے لئے کھڑکی کی درزوں پہ کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا اُس نے گلے کو کھنکھارا۔ گلا سوکھا سوکھا سا لگ رہا تھا۔ کھنکھارنے کی آواز کمرے کی خاموشی میں کریہہ سی لگی اور اُس کے سارے بدن میں جھُرجھُری سی دوڑ گئی۔ سارا بدن ٹوٹا ٹوٹا لگ رہا تھا۔ رانیں اور بازو تو جیسے درد کے بوجھ تلے دب سے گئے تھے دن بھر چپّو چلانا پڑا تھا اِسی لئے شاید تھکن کا غلبہ تھا۔ اب تو وہ کشتی چلانا بھول سا گیا تھا اور وہ اندھیرے میں آپ ہی آپ ہنس پڑا۔ وہ بڑی عجیب باتیں سوچ رہا تھا آج کہیں تھکن نے اُس کے ذہن پر بھی نہ غلبہ پا لیا ہو۔ بھلا مچھلی تیرنا بھول جاتی ہے۔ پرندے پرواز بھول سکتے ہیں جو وہ مانجھی ہو کر کشتی کھینا

بھول جائے۔ کشتی کھینا اُس کی عبادت ہے۔ عبادت بھول جائے تو جئے کیسے۔ اُسے اتنا یقین تھا کہ بوڑھاپا چاہے کتنی ہی یلغار کرے لیکن جب تک اُس کے بدن میں زندگی کی آخری رمق بھی باقی ہے اس کی سوکھی ہڈیاں کشتی کھینے کی حرکات پر ناچتی رہیں گی اور چپو کا کھردرا ڈانڈ ہاتھوں میں آکر خود بخود نرم و نازک بن جائیگا یہ خود فریبی نہ تھی۔ حقیقت تھی۔ بچپن میں چپو نے سہارا دے کر اُسے گھٹنوں گھٹنوں چلنا سکھایا تھا۔ کچھ بڑا ہو کر چپو نے کھلونوں کی ضرورت پوری کی تھی اور وہ گھنٹوں کشتی کے پھٹوں پر بیٹھ کر دریا کی منچلی لہروں سے کھیلتا رہتا تھا۔ چپو نے اُسے تعلیم دی۔ قلم کے بدلے چپو ہاتھ میں تھام کر اُس نے رواں دریا کی وسیع کتاب پر پڑھنا لکھنا سیکھا چپو کے سہارے اُس کی زندگی کی کشتی دنیا کے بے رحم تھپیڑوں پر بہتی رہی۔ اور بوڑھاپے میں چپو لاٹھی بن کر اُس کو سہارا دئے جا رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا چپو چلانے سے اُس کے بدن میں کوئی تھکن نہیں ہوئی۔ بلکہ اگر تھکن ہوئی ہے تو اِس کمرے کے گھٹے گھٹے ماحول کی وجہ سے ہوئی ہے۔ نہ کہیں کشتی کے پھٹوں کے کرکرانے کی آواز تھی اور نہ کہیں لہروں کی میٹھی چپ چپ کی آواز....

نبرے کو عادت تھی کشتی کے کھردرے پھٹوں پر سو جانے کی اور کشتی رات بھر پانی کے ہچکولوں پر ایسے ڈولا کرتی تھی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے پلنگڑے کو ہولے ہولے جھلا رہی ہو۔ بچے کو ہولے ہولے سُلا رہی ہو۔ لیکن اِس کمرے کے مردہ ماحول میں وہ رات بھر نہ سو سکا تھا۔ سارے کمرے پر موت کا سکوت طاری

تھا۔ کئی دفعہ ایسے لگا تھا جیسے موت نے اپنے ٹھنڈے پنجے بڑھا دئے ہیں۔ ڈر اور خوف کروٹوں میں بدل گئے تھے۔ پر ان کروٹوں نے بھی مردہ کمرے میں کوئی جنبش نہ پیدا کی

بستر میں اب اور نہ رہا جاتا تھا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں تھیں۔ اب کے اندھیرے میں سویا رحمان سائے کی طرح واضح ہو گیا۔ دروازے کی چوکھٹ کے پاس ہلکی سی اُجلی لکیر بھی دکھائی دینے لگی اور دروازے کے سہارے کھڑے چپڑ کی موٹی کالی لکیر تو غیبی سہارا ثابت ہوئی کہ وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ احتیاط سے کپڑے کیے کھڑکی کی درزوں سے جھانکا اور کھڑکی کے پٹ وا کیے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں مایوسی کی چبھن تھی۔ روشنی بھی پوری طرح نہ پھیلی تھی۔ کہیں کہیں ستارے نظر آ رہے تھے جیسے بجھے انگارے ہوں۔ شاید دُھند نے اُنہیں ڈھک رکھا تھا۔ نا اُس نے چاہا رحمان کو جگائے۔ اُس سے باتیں کرے۔ کچھ اپنی کہے۔ کچھ اُس کی سُنے۔ ذہن میں کئی تشنہ سوال اور وہم بھیا رہے تھے۔ بڑھیا کون ہے؟ اُس کی بیٹی کیا ہے؟ گھر کا مالک کہاں ہے؟ بڑھیا کے انداز پریشان کُن تھے۔ رات کھانا ایسے کھلایا تھا جیسے وہ کرایہ دار قسم کا باپ نہ تھا بلکہ کوئی سگا تھا۔ بڑھیا نئی نویلی دُلہن کی طرح شرما گئی تھی اس کے سامنے اور وہ لوگ کھلا کر کھانا نہ کھا پایا تھا۔ گو کھانا بڑا مزیدار بنا تھا۔ برسوں بعد ایسا کھانا میسر ہوا تھا۔ نہ نمک کم نہ زیادہ۔ چاول میں ایک بھی کنکر نہ تھا اور

پیوند دینے کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ پیوند دینے والی کے ہاتھوں کی داد دیئے بغیر نہ رہا جائے۔ ہر ایک نوالے میں اتنی مٹھاس تھی جیسے ہر نوالے میں کسی کا پیار تحلیل ہو چکا تھا۔ اُس کے منہہ میں پانی بھر آیا۔ مزا لینے کے لئے وہ رات کا کھانا پھر سے یاد کرنے لگا حتیٰ کہ وہ رحمان کو جگانا بھول گیا۔

جب دوسری دفعہ اُس کی آنکھ کھُل گئی تو اندھیرے کا سحر ختم ہو چکا تھا۔ دن بہت چڑھ آیا تھا۔ اور رحمان کھڑکی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ سارے آنگن پر دھوپ بڑھیا کی مُسکراہٹ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ وہ جھنجھلا اُٹھا۔ بڑھیا نہ ہوئی۔ شیطان کی خالہ ہوئی جو ذہن پر بُری طرح سے سوار ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہ سوچ سکا کہ رحمان بغیر سہارے کے کھڑکی تک کیسے گیا۔ ویسے رحمان کی تیکھی نگاہیں بھی کچھ کم تیز نہ تھیں۔ شاید سوچ رہا ہو کہ جو باپ گھر اُسے دیر سے جاگنے پر ڈانٹ پھٹکار کیا کرتا تھا۔ وہ خود کیوں دیر سے جاگ گیا۔ جی چاہا دیر سے اُٹھنے کا جواز پیش کرے۔ لیکن اُس کے لب نہ ہلے۔ شہر میں تکرار ہوتی تو ہوتی یہاں تو وہ رحمان کا باپ تھا۔ اپنے بیٹے کو ساتھ لے جانے کے لئے آیا تھا۔ اپنے بیٹے پر حکم جھاڑنے آیا تھا۔ اُسے چاہیئے ایک باپ کی طرح گمبھیر رہے جیسے بلدکاک بیٹے کے سامنے گمبھیر رہتا ہے بلدکاک کی یاد آتے ہی اُس نے رحمان سے پوچھا "بلدکاک نے کوئی خبر بھجوائی ہے کیا۔"

"نہیں تو...." رحمان نے ایسے کہا جیسے بلدکاک کے متعلق

کوئی بات نہ کرنا چاہتا ہو لیکن ننھا کچھ نہ سمجھا۔ اس نے تشویش ظاہر کی۔

"بھئی آج واپس جانا ہے۔ خبر تو بھجوانی چاہیے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ اٹھو اور منہ ہاتھ دھولو۔ پانی ٹھنڈا ہو رہا ہے" رحمان جھنجھلا اٹھا۔

اور ننھے کو محسوس ہوا کہ بیماری نے رحمان کی شکل و صورت تو بدل دی ہے لیکن مزاج تبدیل نہیں کیا ہے۔ طبیعت میں وہی تیزی اور چلبلاپن تھا۔ جی چاہا بیٹے کو ڈانٹ دے لیکن پانی کے آبخورے پر نظر پڑتے ہی سارا غصہ کافور ہو گیا۔ آبخورے میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی یا شاید کوئی بھولی بسری یاد۔ جی چاہا کچھ دیر ایسے ہی بیٹھا رہے اور ذہن کو بے لگام گھومنے دے اور بہت پہلے ..... بہت پہلے کے زمانے میں آوارہ ہو جائے جب کوئی صبح سویرے ہاتھ دھونے کے لئے گرم پانی کا آبخورہ سامنے لا کر رکھ دیتا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں دروازے کی اور مڑ گئیں کہ شاید کوئی منہ دھلانے والا نمودار ہو جائے۔ دروازے کے عدم واضح ہوتے ہی وہ کھسیانا سا ہو گیا۔ اس نے اپنے شانے جھٹک دیئے اور بستر میں سے نکل آیا۔ بلد کا تک کو آنا ہو گا تو خود ہی آ جائے گا۔

کوئی اور دن ہوتا تو بلد کا تک رحمان کی حالت دیکھ کر تشویش ظاہر کرتا۔ شاید اس کے انگ انگ کو ٹٹولتا ہی۔ اس نے رحمان کو اپنے گھر میں بڑا ہوتے دیکھ لیا تھا۔ گھر کا بچہ تھا رحمان

پر آج اُس کی زبان گنگ رہ گئی۔ دینا ناتھ نے دوستی کے ناطے
رحمان کی شکایت نہ کی ہو پر سوماوتی نے گھونگھٹ کی آڑ سے بہت
کچھ کہا تھا۔ کاش دینا ناتھ کی بات سامنے ہوتی تو بہو کے صحیح
اندازوں کی قائل ہو جاتی۔ وہ تو ایک ہی نظر میں آدمی کو پرکھ
لیتا ہے۔ پر کوئی مانے تب۔ اِس لئے بھی کہ ہم خیال پاکر وہ نڈر
ہو گیا تھا۔ پر یہ ظالم سانس کچھ کہنے بھی دے چھاتی تو چھوٹی
جا رہی تھی۔ وہ تو بھلا ہو نبرے کا جس نے اُسے آتے دیکھتے ہی
سہارا دے کر سیڑھیاں طے کرائی تھیں ورنہ وہ تو سیڑھیوں پر
ہی گر جاتا۔ اُس کے وجود میں کڑواہٹ سما اُبھر آئی۔ گر بھی
جاتا تو رحمان تب بھی نہ اُٹھتا۔ شاید دینا ناتھ بھی پرواہ کرتے
بیٹی کا اتر، رشتہ دار دو دن رو دھو لیں گے اور بھول جائیں گے۔
دنیا اپنی بے ڈھنگی چال چلتی رہے گی۔ رحمان اور دینا ناتھ یکجا ہوتے
رہیں گے اور فتنے کھڑے کرتے رہیں گے۔ دروازے کی چوکھٹ کے
سہارے کھڑے کھڑے اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے سارے ارادے
اور فیصلے اِس ناپائیدار دُنیا میں پانی کے بلبلوں کی سی وقعت
رکھتے ہیں جو کچھ دیر اپنا وجود منوانے کے لئے تھرتھراتے ضرور ہیں
اور پھر تھک ہار کر سر ٹیک کر دم توڑ دیتے ہیں۔ لیکن دوسرے
لمحے رحمان کی آواز نے اُس کے سارے اِرادوں کو جھنجھوڑ کر
تن جانے پر مجبور کیا۔ رحمان بیٹھے ہی بیٹھے کہہ رہا تھا۔

"اندر آؤ ... چاچا جی ... اندر آ جاؤ۔"

بلڈ کا کہل ہی تو گیا۔ آج کل کے لونڈوں کا بس چلے تو

بزرگوں کی پگڑیاں اُچھالتے پھریں۔ رحمان نے اٹھ کر خیر مقدم کرنا بھی نہ گوارا کیا۔ سمر باوئی کا کہنا غلط نہ تھا۔ رحمان واقعی چہرے مہرے کا بدذات تھا۔

" بھئی جوتے تو اتار دو ..... " نبرے نے ہنس دی اور بلدکاک بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔ رحمان کے اصرار پر وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھ گیا اُجلی دھوپ اچھی لگی۔ نس نس گرم ہونے لگی۔

" ماں جی کیسی ہیں ..... " رحمان نے بھولپن سے پوچھا۔ بلدکاک کو رحمان کے بھولپن میں عیاری محسوس ہوئی۔ وہ چوکنا ہو کر بولا

" اچھی ہے ....."

کمرے میں پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ رحمان نے خاموش رہنا ہی ٹھیک سمجھا۔ دنیا ناتھ کے ساتھ تعلقات اس حد تک بگڑ گئے تھے کہ بلدکاک کے ساتھ بات کرنی مشکل ہو رہی تھی۔ لیکن بلدکاک پریشان سا ہو گیا۔ نیرا بھی چپ تھا۔ ایک دم رحمان کو شہر جانے کے لئے کہنا مشکل ہو گیا۔ اُس نے آہستہ سے پوچھ لیا۔

" یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے ....."

" بلدکاک کی آواز نے نبرے کے بندھ کھول دئے وہ ایک دم بول پڑا۔ " ہاں بلدکاک۔ بُری حالت ہے۔ بغیر سہارے کے اٹھ نہیں سکتا۔"

" بلدکاک اپنی زیادتی پر پشیمان ہو گیا۔ بغیر سہارے کے اُٹھا نہ جائے تو خیر مقدم کیسے کر تا۔ ناحق بے چارے پر الزام دیا۔"

"میں نے تو اُسی دن کہہ دیا تھا کہ رحمان کو یہاں نہ بھیجو پر تم مانتے بھی ۔ ۔ ۔ ۔" اور نبرا حسب معمول مرعوب ہو گیا۔ باپ کو مرعوب ہوتے دیکھ کر رحمان کو چڑ سی ہو گئی۔ باپ ابھی سے بلد کاک کے سامنے دبتا جائے تو بات ہو چکی۔

"تو پھر تیار ہو جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ دیر کا ہے کی ہے" بلد کاک نے کہا۔ اور نبرے کے ذہن پر پھر سے خاموشی کا پردہ گرا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے بیٹے کو تکنے لگا۔ اور رحمان جھنجھلا گیا۔ بڑا بے وقوف تھا اُس کا باپ جو اپنا بُرا بھلا نہیں سوچ سکتا۔"

"میرا فیصلہ تو سُن چکے ہو۔ جواب کیوں نہیں دیتے" رحمان نے باپ کے آڑے آتے ہوئے کہا۔

"کیسا فیصلہ ۔ ۔ ۔ ۔" بلد کاک نے نبرے کو شش و پنج میں ڈال دیا۔ ایک طرف بلد کاک تھا جس نے عمر بھر رواداری برتی تھی۔ اُس کی وقت بے وقت مدد کی تھی اور ہاتھ پکڑ پکڑ کر زندگی بھر راہ سُجھائی تھی اور دوسری طرف بیٹا تھا۔ جس کی وجہ سے اُس کی زندگی ڈانوا ڈول رہی اور جس نے اُسے کبھی شکوہ و شکایت کا سانس نہ لینے دیا۔ جی تو کرتا تھا بلد کاک کا ساتھ دے لیکن بازار کا قرضہ دینا تھا۔ مکان کا کرایہ ادا کرنا تھا اور بڑھیا کی تیمارداری کی قیمت ادا کرنی تھی۔ کاش بلد کاک اُس کی مجبوری سمجھ سکے۔ کاش بلد کاک اُسے یوں گھور گھور کر نہ دیکھے۔ لاچار ہو کر نبرے نے کہا "رحمان شہر جانے پہ تیار نہیں نہ"

بلد کاک نے سنا تو ٹھٹھک کے رہ گیا۔ بے اعتبار نگاہیں نبرے کے بدن پر پھیلا دیں جیسے نبرے نے اس کو کوئی بڑا دھوکہ دیا ہو۔ یوں تو بلد کاک نے وینا ناتھ اور سوماوتی کی بے اعتنائیاں سہہ لی تھیں۔ اور ان پر زیادہ غور بھی نہ کیا تھا۔ سوماوتی اس کی اپنی بہو تھی۔ اپنے بیٹے کی بیوی تھی۔ خراب تھی یا اچھی تھی پر اپنی تھی۔ لیکن نبرا پرایا تھا۔ رحمان پرایا تھا۔ قدرتی طور پر اس کا ذہن نبرے اور نبرے کے بیٹے کے ذہن پر مسلط تھا۔ اس لئے نبرے کے الفاظ نے اس کے بہت سارے اندازے چور چور کر دیئے۔ اسے بڑی تکلیف ہوئی۔ شاید بوڑھاپا اسی کا نام ہے جب ہر کوشش۔ ہر داؤ ناکامیاب ہو جائے اور آدمی اپنے اندازوں اور ارادوں کی لاش کے سرہانے بیٹھا ہاتھ مسلتا رہے۔

"میں شہر نہیں جا رہا ہوں۔ یہیں مزدوری کروں گا۔ شہر میں پیٹ بھرنے کا کوئی آسرا نہیں"۔ بلد کاک کو رحمان کا کہنا برا تو لگا۔ لیکن رحمان کی منطق کے سامنے کچھ کہا نہ گیا۔ واقعی رحمان ٹھیک کہتا تھا۔ شہر جائے تو کرے گا کیا۔ رحمان نے بلد کاک کو چپ ہوتے دیکھ لیا تو نبرے کو تقویت دینے کے لئے بولتا گیا۔

"گاؤں کا قرضہ دینا ہے۔ چالیس روپئے۔ روپئے دیئے بغیر کیسے جا سکتا ہوں؟" اور بلد کاک چالیس روپیوں تلے دب سا گیا۔ تجربے نے اسے سکھایا تھا کہ باپ بیٹے کا رشتہ ٹوٹ جائے

تو ٹوٹ جائے۔ بیوی خاوند کا رشتہ ٹوٹ جائے تو ٹوٹ جائے
حتیٰ کہ ماتا کا رشتہ بھی ٹوٹ جائے لیکن روپئے پیسے کا رشتہ
نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہی ایک رشتہ تو تھا جس پر ساری دھرتی کی
قدریں و قیمتیں قائم تھیں۔ رحمان کو ساتھ لے جانے اور روبینا مائیہ
سے الگ کرنے کی آس ٹوٹتے دیکھ کر اُسے سینے میں جلن سی
محسوس ہوئی۔ اُس نے ساری جلن نبرے کے منہہ پر تھوک
دی۔

”میں نے سومادتی کو شہر جانے پر آمادہ کر لیا ہے۔ تم بیٹے
کو آمادہ نہ کر سکے تو تم جانو۔ خیر رحمان کی مرضی تم تو چلیے۔ دیر
ہو رہی ہے۔“

نبرے پر بلدسکاک کا طنز کارگر نہ ہوا۔ زندگی گذر گئی تھی
دنیا کے طنز سہتے سہتے۔ اِس لئے اُس نے خاموش رہنا ہی بہتر
سمجھا۔ باپ کی حالت دیکھ کر رحمان کو ایک بار اور بلدسکاک کا
سامنا کرنا پڑا۔ ”کشتی تو نہیں جا سکتی۔ میں یہاں کشتی چلایا
کروں گا۔“

یہ دوسرا جھٹکا تھا جس نے بلدسکاک کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا
کہ باپ بیٹا اُس کو بے عزت کرنے کی سازش عمل میں لا رہے ہیں
وہ بوڑھا سہی۔ پر نبرے کی طرح بے وقوف نہیں۔ شہر میں کشتی
چلانے سے پیٹ بھرنے کی سبیل نہ تھی تو اِس ویران گاؤں میں
کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ سب چال تھی۔

”میں بھی سنوں گاؤں میں تم کشتی چلا کے کیا کماؤ گے اور

کیسے کماؤ گے۔"

"یہاں پاری پل میں دریا کے دونوں طرف کام ہو رہا ہے۔ مزدوروں وغیرہ کو آر پار جانا پڑتا ہے۔ سامان لے جانا پڑتا ہے۔ لیکن یہاں کوئی پل نہیں۔ پل حاجن میں ہے اور حاجن ایک میل سے بھی زیادہ فاصلے پر ہے۔ اس لئے پار جانے کے لئے تین ساڑھے تین میل کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ اگر میں ایک آنہ سواری بھی لوں تو دن میں کئی روپئے کما سکتا ہوں یہاں کے مانجی ڈھیروں روپئے کما رہے ہیں۔"

رحمان کی بات سُن کر بلد کاک کا جی چاہا کہ قائل ہو جائے۔ لیکن کیسے۔۔۔۔ بوجھ کر کے ایک میل سے زیادہ فاصلہ حاجن گاؤں تک طے کرنا تھا۔ حاجن سے بس میں شہر تک جانا تھا اور بس کے جھٹکوں سے جان پر بن آتی۔ اس لئے اُس نے اُلٹا رحمان کو قائل کرنا چاہا۔" ایسے کئی پروگرام تمہارا باپ نے زندگی میں بنائے تھے۔ لیکن کوئی پورا نہ ہوا۔ اب تم کیا کر سکتے ہو۔"

اپنا نام سُن کر نبرے سے چُپ نہ رہا گیا۔" بھئی بلد کاک حجت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ رحمان ٹھیک کہتا ہے۔ یہاں بہت کام ہے۔"

"تم بوڑھے بے وقوف ہو۔ تم کیا جانو یہ باتیں۔ رحمان نے اُلٹی سیدھی پڑھا دی اور تم بہک گئے۔۔۔۔" بلد کاک بپھر پڑا۔

بلد کاک ہر بار اسی انداز سے نبرے کو ڈانٹا کرتا تھا اور

ہر بار نبرا سر جھکائے ڈانٹ سہہ لیتا تھا۔ پر آج ..... اِس مکان
میں شاید بڑھیا سیڑھیوں پہ کھڑی اُس کی باتیں سُن رہی ہوگی۔
سیڑھیوں پہ کئی بار سایہ سا لہرا اُٹھا تھا۔ بڑھیا ضرور سُن رہی
ہوگی۔ شاید بلدکاک کی ڈانٹ بھی سُن لی ہو۔ اُس کا چہرہ لال ہوگیا
زندگی میں وہ بھی پہلی بار بپھر پڑا۔

"تم مجھے بے وقوف بوڑھا کہتے ہو۔ ذرا خود کو تو دیکھو۔ بغیر
سہارے کے ایک قدم نہیں چل سکتے اور جانتے ہو تمہاری بیوی
تم کو پاگل سمجھتی ہے اور تم مجھے بیوقوف کہتے ہو۔"

بلدکاک کو یقین نہ آیا کہ نبرا اُس سے یوں مخاطب ہونے کی جرأت
کرسکتا ہے۔ یہ سب کارستانی رحمان کی ہوگی۔ اُس نے نبرے کو
دھمکا ڈرا کر اُس کے منھ لگنے پر اُکسایا ہوگا۔ غصّے کے بجائے اُس
کو نبرے کی حالت پر رحم سا آگیا۔ بوڑھاپے پر جوانی کا غلبہ یقیناً
ہو رہا تھا۔ اب بحث کرنے میں کوئی لُطف نہ تھا۔ رنگ بدل رہے
تھے۔ انداز بدل رہے تھے۔ رِشتے بدل رہے تھے۔ دنیا بدل رہی
تھی۔ اُسے بے انتہا تھکن سی محسوس ہوئی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو نبرے۔ میں بھلا بوڑھا پاگل۔ میری بات
کا کیا بھروسہ..... میں چلتا ہوں۔"

نبرا دل ہی دل میں پشیمان ہوگیا جس بات کا دھڑکا رات
بھر اُس کو لگا ہوا تھا، وہ آخر ہو کر ہی رہی۔ بلدکاک ناراض
ہوگیا۔ عمر بھر کا ساتھی ناراض ہوگیا۔ بلدکاک شاید ٹھیک کہتا تھا
کہ وہ سٹھیا گیا ہے۔ ورنہ اِس عمر میں بڑھیا کا خیال اُس کے ذہن

پر کیسے چھا جاتا۔ بڑھیا نہ ہوئی۔ کوئی جنت کی حور ہوئی جس کے لئے اس نے دنیا داری اور دوستی کو لات مار دی۔ بلند کاک نے جوتے پہن لئے تو اس سے رہا نہ گیا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آؤ میں سیڑھیاں اترنے میں مدد دوں۔"

بلند کاک نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ اکیلے سیڑھیاں اترنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

اور رحمان ان دو بوڑھوں کو ایک دوسرے کے سہارے اٹھتے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بلند کاک کے رویئے نے جتنی کچھ تلخی اس کے وجود میں ابھاری تھی اس مسکراہٹ نے چشم زدن میں کافور کر دی۔

—۰۰۰—

دوپہر دن چڑھ آیا تھا رحمان پاری بل گھاٹ سے لگی کشتی
میں پاؤں پانی میں لٹکائے بیٹھا تھا۔ نگاہیں دریا پہ ایسے جمی تھیں
جیسے دریا کی روانی کو روکنا چاہتی ہوں۔ دوران دریا کی سطح پر
گھاس پھوس کے تنکے اپنی رفتار سے رحمان کو بہتے وقت کا احساس
دلا رہے تھے۔ اور وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کبھی بار
اُس کی دُزدیدہ نگاہیں گھاٹ کی ڈھلان پہ دوڑ گئیں لیکن نگاہیں
ہر بار خالی خولی لوٹ کر دریا کے پانی پر رک جاتیں۔

آج بہت دنوں بعد دریا کا پانی سبزی مائل ہو گیا تھا۔ سبزی مائل
پانی میں آسمان کی گہرائیوں کی نیلی پرچھائیاں نازک سی خوبصورتی
کا اضافہ کر رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا آسمان سورج کی
تمازت سے گھبرا کر دریا میں ڈبکی لگائے بیٹھا ہے۔ سورج کی تمازت
برداشت سے باہر تھی۔ رحمان نے ہاتھ اٹھا کر ماتھے پہ رکھا اُس
کی انگلیاں نم ہو گئیں۔ بے کل ہو کر اُس نے پسینے سے لتھڑی سی انگلیوں سا

کو پانی میں ڈبو دیا۔ پانی ٹھنڈا محسوس ہوا یا شاید آسمان سے برستی آگ کے مقابلے میں ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ رحمان نے غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ تو چاہ رہا تھا۔ کہ کپڑوں سمیت کشتی میں سے پھسل کر دریا میں جا گرے تو شاید پانی بدن کی گرمی کے ساتھ ساتھ ذہن میں اُبلتی جلتی بھٹیوں کو بھی بجھا دے اب واقعی اور انتظار مشکل تھا۔ ویسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ صبح گھاٹ پر آنے سے پہلے وہ ایک سنگھاڑے کی موٹی سی روٹی پیٹ میں جھونک چکا تھا۔ نمکین چائے کے دو ایک پیالے بھی چڑھا آیا تھا پھر بھی بھوک نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اُسے چاہیئے۔ انتظار کرنا چھوڑ دے۔ بلکہ چپو کاندھے پر تھام کر گھر کو چل دے۔ بڑھیا شاید کھانا لانا بھول گئی ہے۔ کاش صبح اُس نے بڑھیا کے اصرار پر ایک آدھ روٹی اور کھا لی ہوتی۔ انتظار کی شدت نہ سہی بھوک کی شدت تو کچھ کم پڑ جاتی۔ کاش ........

یکایک وہ آپ ہی آپ جھنجلا اٹھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ بڑھیا اُسے کسی سگے کی طرح چاہتی تھی۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ بڑھیا کی بدولت وہ موت کے منہ سے واپس نکل آیا تھا۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ بڑھیا صدیوں کے تعلقات ...... عمر بھر کے رشتے ناطے اور بڑھاپے کی تلخی داؤ پر لگا کر گاؤں والوں کے سامنے سینہ سپر نہ ہوتی۔ .... اُس کی حمایت نہ کرتی تو آج اِس گھاٹ سے لگی کشتی میں یوں پیر پسارے نہ بیٹھا ہوتا بلکہ شہر میں کہیں دربدر پھرا کرتا۔ گاؤں والوں کو پسند نہ تھا کہ کوئی غیر آدمی اُن کے

گھاٹ پر کشتی کھینا پھرے اور خواہ مخواہ اُن کی روزی میں شریک بن جائے۔ بڑھیا کے سوکھے وجود میں اتنی سرکشی....... اتنی بغاوت ...... دیکھ کر اُس پر خود گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی غلطی کا مرتکب ہو گیا تو شاید بڑھیا زندہ نہ چھوڑے...... وہ شاید غلطی کر رہا ہے جو اپنی زندگی کی ناؤ بڑھیا کے سرکش ہاتھوں میں سونپ رہا ہے۔ کیا معلوم پھولی اُس کی ہو سکے گی۔ اور کیا معلوم مل بھی جائے اور بڑھیا آڑے آ جائے۔ عقل کا تقاضہ تھا کہ بڑھیا کا قرضہ بیباک کر کے شہر کا رُخ اختیار کرے۔ اپنے بوڑھے باپ کا کہا مانے۔ بوڑھے باپ نے بڑے ارمانوں سے پیسہ پیسہ جوڑ کر بہو کے لئے زیور کپڑے اکٹھے کئے تھے۔ وہ چاہتا ہے بوڑھے باپ کو بھول جائے۔ لیکن گھبراہٹ .... سنسناہٹ اور شرمانے کی کیفیت وہ شاید ہی بھول جائے جو بوڑھے باپ کی زبانی اپنی شادی کے متعلق سننے سے اُس کے بدن پر طاری ہو جاتی تھی۔ شاید پھولی اتنی اہم نہیں جو وہ اتنے سارے بندھن توڑنے پر تُل گیا ہے۔ پھولی... جو روز بروز دور ہوتی جا رہی تھی۔ اُس سے چھپتی پھرتی تھی۔ منحوس کُتیا کی طرح کوٹھڑی کے اندھیرے گوشوں میں غراتی رہتی تھی۔

اُس کی سوچ رُک گئی۔ گھاٹ کی ڈھلان پر بڑھیا کا کالا پھرن اُبھر رہا تھا اور اُس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ سب سوچیں رُک کر بڑھیا کے سر پر مرکوز ہو گئیں۔ بڑھیا کے سر پہ کپڑے کی

گمٹھڑی سی دھری تھی اور گمٹھڑی پہ برتن تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ چاہے اُس کی عمر کا ایک ایک لحظہ ضائع ہو جائے۔ چاہے بھولی اُسے جنم جنم دھتکارتی پھرے اور چاہے اُس کی ناؤ اِس گھاٹ سے لگی لگی ڈوب جائے۔ وہ اِس بڑھیا کے ہاتھوں سے اپنی زندگی کی ناؤ پتوار نہ چھین سکے گا۔ بڑھیا کی ممتا کا وہ قرضہ نہیں چکا سکتا۔ !

بڑھیا ناؤ کی طرف بڑھی اور اُس نے کچھ نہ کہا بلکہ ہاتھ بڑھا کر دریا میں ڈبو دیا۔ رسمی گفتگو فضول تھی۔ بڑھیا کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ رحمان کو حسبِ معمول رحم آ گیا۔ بڑھیا نے سانس کو سہارا دیتے ہوئے کھانے کا برتن اُس کی طرف بڑھا دیا۔

جب کبھی بڑھیا اُس کے لئے کھانا لاتی تھی تو کپڑے کھول کر برتن پر سے ڈھکن اٹھاتی تھی۔ تب کہیں کھانے کا برتن اُس کے آگے سرکاتی تھی۔ لیکن آج معمول توڑنے پر رحمان کا دھیان نہ گیا۔ بھوک تو جان نکالنے پہ تُل گئی تھی۔ اُس نے خود ہی کپڑے کی گانٹھ کھول دی اور ڈھکن ہٹا دیا۔ برتن میں چاول تھے اور کوئی جنگلی ساگ تھا۔ گاؤں بھر کی ساری سبزی بے وقت بارش نے سڑا دی تھی۔

شروع شروع میں بھوک کی وجہ سے چاول میٹھے لگے اور سبزی میں بھی کوئی نقص نظر نہ آیا۔ لیکن جب وہ چار لقمے کھا کر اُس کی بھوک کچھ ڈھیلی پڑ گئی تو ہاتھ بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ چاول پوری طرح

سے اُبل نہ پائے تھے اور سبزی میں بھی جنگلی سبزیوں کی مخصوص کڑواہٹ باقی تھی۔ اُس نے پوچھا۔

"چاول کچّے رہ گئے ہیں اور سبزی بھی کڑوی ہے۔کیا اچھی طرح سے دھوئی نہ تھی ......؟" رحمان نے اپنی دانست میں نرم لہجہ استعمال کیا۔ لیکن بڑھیا کے جواب نے اُسے اچنبھے میں ڈال دیا۔بڑھیا کا لہجہ بڑا اداس تھا۔"

"اچھی طرح سے دھوئی نہیں ہوگی یا شاید جل گئی ہے گی..."

رحمان ٹھٹھک گیا۔بڑھیا نے اُس سے ایسا برتاؤ تب بھی نہ کیا تھا جب وہ بستر پر بیمار پڑا کسی بچّے کی طرح چلّا کرتا تھا۔کہیں آج بڑھیا اُس کا معمول ٹوٹتا دیکھ کر باقی سارے معمول توڑنے پر نہ تُل گئی ہے۔ اُس کا اپنا معمول تھا کہ جتنا کچھ وہ صبح سے دوپہر تک کشتی کھے کر کماتا۔ کھانے سے پہلے بڑھیا کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا اور رات جب گھر لوٹ جاتا تھا تو باقی دن کی ساری کمائی بڑھیا کے سامنے رکھ دیتا تھا پہلے پہل بڑھیا نے کمائی لینے سے انکار کیا تھا۔ لیکن رحمان کے اصرار کے سامنے وہ ٹھہر نہ سکی۔ اب وہی گھر کو سنبھالتی۔ چاول سبزی خریدتی اور چائے پانی کا انتظام کرتی تھی۔ اور جب کبھی رحمان سگریٹ خریدنے یا بال کٹائی کے لئے ایک آدھ آنہ مانگ لیتا تھا تو بڑھیا کا چہرہ مارے ممتا کے دمک اُٹھتا۔ یقین نہ آتا تھا کہ کوئی اُس سے یوں پیسے مانگ رہا ہے۔ جیسے بچے اپنی ماؤں سے مانگتے ہیں۔ اپنے ڈھلاتے یقین کو سہارا دینے کے لئے وہ رحمان کے سر کا جھوٹ موٹ معائنہ کرتی۔ سگریٹ جیسی

فضول خرچی کرنے پر ڈانٹتی بھی۔ اور تب کہیں وہ چار آنے دے دیتی تھی۔ رحمان کی اس چھوٹی سی حرکت نے بڑھیا کی زندگی کو نئے سرے سے جینے کا مطلب سمجھا دیا تھا اس لئے اس کی صحت بھی اچھی ہونے لگی تھی۔ گالوں پر ہلکا سا تناؤ آ گیا تھا اور ہاتھوں پر جھریوں کے ابھار میں بھی نمایاں فرق پڑ گیا تھا۔ اپنے بدن میں فرق محسوس کر کے بڑھیا کے دل میں سوئی عورت بھی جاگ پڑی تھی اب وہ بالوں میں ہر دوسرے دن تیل ڈالتی۔ کنگھی کرتی اور کبھی کبھار آنکھوں کو کاجل سے بھی سنوارا کرتی تھی۔

رحمان خاموشی سے کھانا نگلتا رہا اور سوچتا رہا کہ آج اگر وہ بڑھیا کے ہاتھوں میں کچھ نہ کمائی انڈیل سکا تو یہ اس کا قصور نہ تھا۔ آج صبح سے اس نے کچھ نہ کمایا تھا۔ کسی نے کچھ نہ کمایا تھا۔ لیکن کچھ نہ کمائے تو بڑھیا گھر میں رہنے ہی کیوں دے۔ وہ بڑھیا کے بطن سے تو نہ پیدا ہوا تھا۔ نہ ہی وہ بڑھیا کا رشتہ دار تھا پھر کیوں بڑھیا اس کی خاطر چولھے کے سامنے جلتی رہے۔ کیوں فرلانگ آدھ فرلانگ تپتی دھوپ اور ٹھٹھرتی بارش میں کھانے کا برتن لادے لادے پھرے۔ آخر کیوں......جب وہ خود بے مطلب بڑھیا کے پاس نہ رہ رہا تھا۔ بلکہ کھچولی کی خاطر بڑھیا کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن رہا تھا۔ ٹھیک تو تھی بڑھیا کی رکھائی۔ اسے چاہئے کسی طور کشتی کھیتا رہے۔ پیسے کماتا رہے اور بڑھیا کے سرکش ہاتھوں اور پیروں کو سونے چاندی کی زنجیروں میں جکڑ دے۔ پھر شاید کھچولی اس کی ہو سکے گی۔

برتن میں چاول ختم ہو گئے۔ سبزی بھی ختم ہو گئی۔ اُس نے دریا کے پانی میں ہاتھ دھویا اور کلی کرلی۔ سبزی کی کڑواہٹ نہ گئی۔ اُس نے ایک بار پھر کلی کرلی۔ کڑواہٹ بدستور انگ انگ پہ چھائی رہی۔ اُس نے بڑھیا کی طرف دیکھ لیا۔ بڑھیا اُس سے بے نیاز دریا کی روانی میں غلطاں و پیچاں تھی۔ رحمان نے مایوسی سے سر جھکا لیا اور کپڑے میں برتن باندھنے شروع کئے۔ برتن کھڑکھڑائے۔ اور بڑھیا چونک پڑی۔ رحمان نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

"ماں آج کوئی پیسہ نہیں کمایا۔ اس لئے آج تمہیں کچھ نہ دے سکا۔"

بڑھیا سن سے رہ گئی۔ کئی لمحے وہ رحمان کو خالی خولی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ رحمان کے جھکے سر کو دیکھتی رہی۔ جھکے سر پہ پھیلے کڑوے تیل سے لپے گھنگھریالے بالوں کو دیکھتی رہی۔ بالوں کی جڑ کے ذرا ادھر دھوپ سے رنگے جلد پہ پسینے کے ننھے ننھے قطروں کو دیکھتی رہی۔ پسینے کے قطرے سورج کی روشنی میں موتیوں کی طرح چم چم چمک رہے تھے۔ اور بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ جیسے رحمان خود بھی بڑا خوبصورت تھا...... اچھا...... پیارا...... جو اُسے ماں کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ جو بیٹے کی طرح مچلا کرتا تھا۔ اور بیٹے کی طرح روپیے کما کے لاتا تھا۔ تاکہ گھر میں چاول آجائیں۔ سبزی آجائے نمک مصالحہ آجائے اور وہ جسم کی کھونک اپنا پیٹ بھر سکے۔ کیا وہ پھر تک سکے گی......؟ کیا وہ رحمان کو ان گھنگھریالے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ سکے گی یا ان برتنوں کے ایک ہی

وار سے اُس کی مجبکی گردن کو توڑ سکے گی۔ وہ جنم جنم کی بھوکی بڑھی.......... وہ جو کچھولی کی بھی ماں تھی جس کا درد اُس نے کچھولی کے وجود میں آنے سے پہلے محسوس کیا تھا۔ سہہ لیا تھا اور جس کی پیدائش پر وہ مرتے مرتے بچ گئی تھی۔ اور جس کو اُس نے برسوں سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ شاید اپنی بھری جوانیوں کو کچھولی کے منہ میں ڈالنے سے عجیب سی آسودگی بھی حاصل کی تھی۔ اب اُسے اتنا یاد کہاں۔ اور نہ ہی کچھولی کو یاد تھا۔ اور کچھولی بات بات پہ لڑ پڑتی تھی۔ گھر کے کام کاج میں ہاتھ نہ بٹاتی تھی بلکہ چھپی چھپی اندھیرے کونوں میں روتی پھرتی تھی۔ کراہتی رہتی تھی اِس لئے تو اُس لئے اُس سے اکیلے گھر کا کام کاج بنانا پڑتا تھا سبزی بھی اچھی طرح سے دھوئی نہ گئی تھی اور سبزی میں زہر بھری کڑواہٹ بھی رہ گئی تھی۔ اور زہر بھری کڑواہٹ بیٹے کے وجود میں سرایت کر گئی اور بیٹے نے ساری کڑواہٹ ماں کے منہ پہ تھوک دی اور وہ جنم جنم کی بڑھی بھوکی......

بڑھیا کو اپنا گلا سوکھتا سا محسوس ہوا۔ اُس نے گلے کو کھنکھارا۔ تھوک منہ میں الٹنے پلٹنے سے منہ گیلا ہو گیا۔ تھوک دے تو شاید رحمان کو برا لگے۔ اُس نے تھوک نگل لی۔ اُسے تسلی سی آئی۔

کھنکھار سن کر رحمان چوکنا ہو گیا۔ بڑھیا کے تیور اچھے نہ تھے۔ بظاہر چہرے پہ دکھ اور تکلیف کے آثار تھے لیکن آنکھوں میں

بجلیاں سی کوندتی محسوس ہوئیں۔ بڑھیا کے وجود میں چھپی سرکشی کو محسوس کرکے اُسے ایک دفعہ اور ڈر سا لگا۔ لیکن بڑھیا کی آواز نے اُس کے سارے ڈر دور کردئیے۔

"کیوں.... آج کوئی خریدار آرپار نہ گیا کیا؟"

بڑھیا کا لہجہ احتجاج کر رہا تھا اور رحمان شرمندہ ہونے کے ساتھ ساتھ سراسیمہ ہونے لگا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ صبح سے انتظار کر رہا ہے اور شاید انتظار نہ سہہ کر وہ لو کھلا گیا ہے کیونکہ آج وہ ایسا داؤ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس کی ہر کروٹ میں بربادی کے آثار چھپے تھے۔ یاد آتے ہی اِس خطرناک کھیل کے کئی ڈراؤنے پہلو اُس کی آنکھوں کے سامنے کوند گئے۔ نگاہیں اندھی سی ہو گئیں اور وہ بڑھیا کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔

"ہاں آج کسی کو فرصت نہ ملی خریداروں کو آرپار لے جانے کی۔ ہم الیکشن لڑنے والے ہیں۔ ٹھیکہ دار سالا ہے نا۔ جو میری مزدوری ہڑپ کر گیا۔ گنجا کہیں کا۔ اُس کے برخلاف ہم محاذ کھڑا کر رہے ہیں۔ آج ہمیں فیصلہ کرنا ہے.... ... آج.... "

رحمان ٹھٹک سا گیا۔ بڑھیا اُسے ایک ٹک گھور رہی تھی

یوں کیوں دیکھ رہی ہو...." اُس نے پوچھا۔

"نہیں تو.... نہیں تو.... کہتے جاؤ.... کیا محاذ" بڑھیا سٹپٹا کر بولی۔ بظاہر وہ لفظ محاذ میں اُلجھ گئی۔ قبائلی جھگڑے کے دنوں

میں یہ لفظ بڑا عام تھا۔ لیکن اتنے دن بعد رحمان کے منہ سے یہ لفظ سُن کر اُس کا ذہن رحمان کی معصومیت میں اُلجھ سا گیا۔ کچھ دیر پہلے رحمان کے ہر لفظ میں ایک واضح چوٹ کا گمان ملتا تھا اور کچھ دیر بعد ہی رحمان ایک ننھے بچے کی طرح اُس کے سامنے اپنا دِل کھول رہا تھا۔ اب بھلا وہ بڑھیا.... کیا جانے یہ بانیں۔ وہ پریشان سی ہو گئی۔

رحمان بڑھیا کی پریشانی کو نظر انداز کر گیا۔ اُسے تو بہانہ چاہیئے تھا۔ دل کا بوجھ کم کرنے کے لئے۔ دل پر کئی من بوجھ تھا۔ ذہن میں ہزاروں وسوسے تھے۔ ٹھیکیدار کا مکروہ چہرہ.... نوکروں کی فوج.... پولیس کا ساتھ اور وہ اکیلا ٹھیکیدار کے سامنے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ جن لوگوں کے بیچ رہتا تھا۔ وہ بھی اُس پر بھروسہ نہ کر رہے تھے۔ رحمان خوب جانتا تھا کہ گاؤں والے اُسے اپنا کر بھی غیر سمجھتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں کے لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ قصور اُس کا اپنا تھا۔ اُس کے چلنے پھرنے کے انداز۔ بات چیت کے ڈھنگ اور رہن سہن پر ابھی شہر کی چھاپ تھی۔ وہ روزانہ کئی اہم باتوں کو شہری نکتہ نگاہ سے پرکھا کرتا تھا۔ حتّےٰ کہ گاؤں والوں کے مخصوص تلفظ پر مسکراہٹ کو روکنا بھی نہ سیکھ پایا تھا۔ قدرتی طور پر اُس کے سرکش خیالات نے گاؤں والوں کے دلوں میں کئی شبہات نے جنم دیا تھا۔ رحمان بیزار تھا، بیزاری کی شدت نے اُسے بڑھیا کا سہارا لینے پر مجبور

کر دیا۔

"ہاں..... آج ہم سب فیصلہ کرنے چلیں کہ اپنا ووٹ ٹھیکیدار کو دیں کہ نہ دیں...... ٹھیکیدار نے ہر گھر کو [illegible] پہنچائی ہے ماں......"

"ہم سب کون..... یہاں تو صرف تم ہی ہو [illegible]" بڑھیا نے ادھر ادھر خالی کشتیوں کی طرف نظر دوڑائی اور رحمان نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ شکر تھا اللہ کا کہ بڑھیا کی بے اعتبار نگاہیں اس کے بدن سے ہٹ گئیں۔ بڑھیا تھوڑی دیر اور گھورتی تو شاید وہ ننھے بچے کی طرح رو پڑتا۔

"باقی سب لوگ فیصلہ کرنے گئے ہیں کہ میری بات مانیں یا نہ مانیں۔ مجھ پہ بالکل بھروسہ نہیں کرتے" رحمان کا تلخ لہجہ بڑھیا سے چھپا نہ رہا۔ لہجے کی تلخی بڑھیا کو مانوس سی لگی۔ اس کی اپنی زندگی جو تلخ تھی۔

"نہیں.... نہیں... وہ لوگ تمہاری بات ضرور مان لیں گے۔ میں منواؤں گی۔ تم گھبراؤ نہیں۔ کہاں گئے ہیں فیصلہ کرنے۔" بڑھیا نے اندھا دھند رحمان کی ڈھارس بندھائی۔ وہ بیٹے کی ماں تھی نا آخر.....؟

"کھلیان میں گئے ہیں....." غیر ارادی طور پر رحمان نے راز فاش کر دیا۔ لوگوں نے تاکید کر رکھی تھی کہ کوئی ان کا پتہ پوچھے تم بالکل نہ بتانا۔

"تو میں بھی کھلیان چلتی ہوں....." رحمان کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ

بڑھیا کی طاقت کا مظاہرہ گھاٹ پہ اپنی کشتی کا اضافہ کرتے وقت دیکھ چکا تھا۔ اُس کو یقین تھا کہ طرفداری پہ آمادہ ہو گئی تو سارے گاؤں کو اُس کی حمایت پہ آمادہ کر سکتی ہے پھر بھی اُس نے کہا۔

"نہیں ماں ..... جو فیصلہ کرنا ہو گا کر لیں گے تمہارے جانے کی ضرورت نہیں۔"

"تم میری فکر نہ کرو .... بس بیٹھے رہو ...." بڑھیا جاتے جاتے کہہ گئی۔ رحمان بڑھیا کو گھاٹ پہ چڑھتے دیکھنے لگا۔ اور دل میں سوچنے لگا کہ اُس کی ماں ہوتی تو کیا وہ بھی ایسی ہی ہوتی ... "

———۰۰۰———

دینا ناتھ نے پچھلے آدھ گھنٹے میں کئی دفعہ گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔ اس لئے ہر منٹ کا حساب تھا۔ جب وہ چھپتے چھپاتے کھلیان میں پہنچ گیا۔ تو سورج ڈوبنے کو تھا۔ اور کھلیان کے گرد کھڑے چناروں کے پتوں میں سے گذرتی ترچھی زرد کرنیں سونے کی سلاخیں جیسی لگتی تھیں۔ سورج ڈوبنے کے ساتھ ساتھ یہ زرد سلاخیں سرخی مائل ہو گئیں۔ جیسے کسی کی سرخ گوری باہیں ہنوں میں لپٹی پڑی اس کی طرف بڑھ رہی ہوں اور اسے بے تحاشہ سوماوتی کی گوری باہیں یاد آ گئیں۔ کتنے دن گذر گئے تھے سوماوتی کو شہر گئے ہوئے اور اس کا ایک خط بھی نہ آیا تھا۔ کئی بار جی چاہا تو خود خط لکھنے کی پہل کرے۔ لیکن خط گھر کے پتے پر لکھنا ناممکن تھا۔ عجیب قانون تھے اس فرسودہ سماج کے۔ شادی ماں باپ کرتے تھے۔ دولہا دلہن کو ایک ہی کمرے میں بے پردہ ٹھونس دیتے تھے۔ پھر کمرے سے باہر ان پہ پہرہ بٹھا دیا جاتا تھا۔ شادی مقصد اولاد پیدا کرنے تک محدود کر دی جاتی تھی۔ نہ آپس کا ہنسنا کھیلنا... ... نہ گھومنا پھرنا... ... خاوند بیوی ایک دوسرے کا بدن جانتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی شخصیت سے ناواقف رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی پھر نہیں بن پاتی نہ ان کے طبقے میں کسی کی بن پاتی ہے جیسے اس کی اپنی

بیوی سوماوتی سے نہیں بنتی ہے جتنی دیر وہ سوناواری میں اکٹھے رہے۔ روز جھگڑتے رہے۔

تلخ یادیں یاد آتے ہی اُس نے سُرخ گوری باہوں کو ذہن میں سے ہٹانا چاہا۔ اِس لیے اُس نے ایک بار اور گھڑی دیکھ لی۔ اُسے عجیب سا لگا۔ سارے سماج، ماں باپ، بیوی اور اپنی آتما۔ ساری زندگی کے متعلق سوچنے میں صِرف ایک منٹ گذر گیا تھا۔ صِرف ایک منٹ......

سُورج ڈوب گیا تو اندھیرا چنار کے پیڑوں کی آڑ سے نکل کر کھلیاں پر دھاوا بولنے لگا۔ حتیٰ کہ اُس کے جسم پر نیلا سوٹ بھی کالے رنگ میں مدغم ہو گیا گھڑی پر کھدے ہوئے ریڈیم کے حروف زندہ ہو گئے۔ ریڈیم کی نیلی روشنی بڑی بھلی محسوس ہوئی۔ جیسے کسی کی نیلی آنکھیں ہوں۔ اور ایک بار پھر اُسے سُوماوتی کی یاد آئی۔ جو بہت پہلے دعا مانگا کرتی تھی کہ اُس کے سب بچوں کی آنکھیں نیلی ہوں۔ نیلم کی طرح اور وہ خود بیوی کو چڑانے کی خاطر کہتا تھا.. "یہ نہیں بلی کی طرح"، سوماوتی رُوٹھ جاتی اور وہ منانے پر مجبُور ہو جاتا۔ سوماوتی کے نرم گداز بدن میں گدگدی کرنے لگتا۔ سوماوتی کے نرم گداز بدن کو یاد کرتے ہی اُسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا اور وہ چنار کی جڑ سے گاؤں کی طرف نگاہیں پھیرنے پر مجبُور ہو گیا۔

گاؤں کے خدوخال دبیز اندھیری دُھند میں ڈوب گئے تھے۔ صِرف کہیں کسی پکے مکان کی اینٹوں کا سُرخ رنگ راکھ میں دبے انگاروں کی طرح عیاں تھا۔ لیکن گاؤں پر پھیلے چنار و سفیدے کے درختوں کے ننگے ٹہنیاں نیلے آسمان کی چادر پر پوری آب و تاب سے چھوٹے پڑ رہے تھے۔ ایک ایک ٹہنی دِکھائی دے رہی تھی۔ جیسے کسی نے کالے قلم سے آسمان کے چادر پر کھدی ہوں۔ سفیدوں

کے تنوں سے ذرا اوپر کچھ ستارے بھی تانک جھانک کرنے لگے تھے۔ ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھ کر دینا ناتھ کی نگاہیں پھر گھڑی پر مرکوز ہو گئیں۔

گھڑی کے ہندسے رومن زبان میں کھُدے تھے۔ جن سے وہ ابھی پوری طرح مانوس نہ تھا۔ اِس لیے حسبِ معمول اُسے وقت دیکھنے میں کچھ دیر لگی۔ ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے۔ ہوا بند ہو چکی تھی۔ چنار کے پتے ساکن ہو گئے تھے۔ اب کوئی پرندہ بھی پر نہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ اِس عمیق خاموشی میں یا تو اُس کے دِل کی دھڑک رواں تھی یا صِرف گھڑی کی ٹِک ٹِک۔ فرق کرنا مشکل تھا۔ یکایک دینا ناتھ کے ذہن میں عجیب سا خیال کوند گیا۔ یہ گھڑی شاید ٹھیکہ دار نے اُس کو اِس لیے بخش دی تھی کہ وہ ٹھیکہ دار کے حکم اور اپنی زندگی میں کوئی فرق نہ محسوس کرے۔

جوں جوں وہ اِس نکتے پر غور کرتا گیا توں توں اُسے یقین ہو چلا کہ ٹھیکہ دار نے ضرور کسی خاص مطلب کی خاطر یہ گھڑی اُسے اِنعام میں دی۔ ورنہ ٹھیکے تو ہر ٹھیکہ دار کو ملتے ہیں ۔ اور ہر ٹھیکہ دار ہر ٹھیکے سے ڈھیر سارے روپیے کماتا ہے۔ یہ ٹھیک تھا کہ اُس کے ٹھیکہ دار کا بندھ نیار ہو گیا تھا۔ وارے نیارے ہو چکے تھے۔ ٹھیکہ دار کو ٹھیکے کی ایک ایک پائی مِل گئی تھی۔ نئے ٹھیکے بھی مِل گئے تھے۔ اِس خوشی میں دعوت دی جاتی ضیافتیں اُڑائی جاتیں۔ نہ کہ اُسے سو روپیے کی گھڑی دی جاتی۔ آخر اِتنی ذرہ نوازی کس لیے ۔۔۔۔۔۔ وہ رُک گیا۔ کھلیان کے اندھیرے میں سے کوئی سایہ اُس کی سوچوں پہ چھا گیا۔ اُس کے مُنہ سے بے تحاشہ نکل گیا۔

"کون ہے ۔۔۔۔۔۔"

"میں ہوں رحمان ۔۔۔۔۔۔" مختصر سے جواب نے اُس کے ڈر دور کر دیے

اور وہ اپنی جلد بازی پر جھنجھلا گیا۔ کیا ضرورت تھی یوں چلا چلا کر اپنی موجودگی کی تشہیر کرنے کی۔ ٹھیکہ دار کا کوئی آدمی ہوتا تو سارا راز فاش ہو جاتا۔ پھر شاید اِس گھڑی کے ساتھ ساتھ نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔

رحمان نزدیک آنے لگا۔ تو دینا ناتھ کی ہمت نہ ہوئی آنکھ ملانے کی۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ کلائی پر بندھی گھڑی نگاہوں کے سامنے آتے ہی وہ گھبرا سا گیا۔ ٹھیکہ دار کا مکروہ چہرہ حدِ نظر میں اُبھر آیا۔ جیسے گھڑی نہ تھی بذات خود ٹھیکہ دار تھا۔ ناچار اُس نے سر اٹھا لیا۔ اور اپنی ساری جُرأت یکجا کر کے اپنے دوست کا سامنا کیا۔

اندھیرے کے باوجود رحمان کا ڈھیل ڈول کافی سکڑا سکڑا نظر آیا۔ رحمان کے شانے نیچے جھک آئے تھے۔ چہرہ بھی گوشت پوست سے عاری تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ جیسے کسی نے کھڑا کیا ہو۔ جیسے کوئی کفن بردلاش ........ رحمان کا سر جھکا تھا۔ اور دینا ناتھ اچنبھے میں پڑ گیا۔ اُسے رحمان سے ایسے مردہ رویئے کی توقع نہ تھی۔ اُسے تو یقین تھا کہ رحمان آتے ہی اُس سے لڑ پڑے گا۔ گلے شکوے کرے گا۔ دوستی کی دہائی دے گا کیا معلوم غصے میں آکر سارا کھلیان سر پہ اٹھالے۔

"کیا بات ہے ......" رحمان کی آواز میں مایوسی تھی۔

رحمان کی مایوس آواز سُن کر دینا ناتھ ہڑبڑا سا گیا "نہیں ..... بس ..... ایسے ہی بُلوا لیا۔"

دینا ناتھ کا جواب سُن کر رحمان کے دِل میں خلش سی ہوئی دینا ناتھ کو ملنا ہی تھا تو گھر پر آسکتا تھا یا گھاٹ پر مل سکتا تھا۔ یہاں کھلیان میں رات گئے ملنے کا کیا مطلب تھا۔ اِس کھلیان میں تو رحمان محسوس ہوتا تھا۔ خاموشی

اتنی گہری تھی کہ اپنے دل کی دھڑکن سے بھی خوف لگے۔ سارے کھلیان پر اندھیرے کا راج تھا، اور چناروں کے سائے بھوتوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ویسے آج سارا گاؤں جیسے بھوتوں کا مسکن تھا۔ کھلیان کے بیچوں بیچ کائے کپڑوں میں ملبوس دینا ناتھ بھی شاید ایک بھوت تھا۔ ماضی کا بھوت ---- وہ بھوتوں کے آگے پیچھے کب تک گھومتا پھرے گا۔ .... کہاں تک گھومتا پھرے گا۔ انگ انگ میں تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اپنے آپ پر رحم سا آگیا اور وہ چنار کی جڑ پر بیٹھ گیا۔ "پھر کیوں بلایا مجھے...!" آواز بھی تھکن سے لبریز تھی۔

"کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں... !!" دینا ناتھ نے الفاظ ڈھونڈنے شروع کر دیئے۔ نو بج گئے تھے۔ دیر ہو رہی تھی اور وہ ابھی الفاظ ڈھونڈھ رہا تھا۔ -- ہوں!

"کیسی ضروری باتیں ....." رحمان کی آواز سپاٹ تھی اور دینا ناتھ کو کھٹکی سی لگی۔ ایک وہ تھا جو رحمان کی خاطر اپنا آرام چھوڑ کے اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کھلیان کے ڈراونے اندھیرے میں سرگرداں تھا اور ایک رحمان تھا جیسے کسی بات کی اہمیت کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔

"ٹھیکہ دار کو پتہ چلا ہے کہ تم اس کے برخلاف پروپگنڈہ کر رہے ہو۔ لوگوں کو بھڑکا رہے ہو۔ ٹھیکہ دار بہت ناراض ہے۔"

"ناراض ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ میں اس سے نہیں ڈرتا" رحمان بھڑک گیا۔ کہاں تو سوچا تھا کہ بچھڑے دوست پھر سے گلے ملیں گے۔ اور کہاں دینا ناتھ وہی پرانا راگ دہرانے آیا ہے۔ جیسے ٹھیکہ دار ٹھیکہ دار نہ ہو بلکہ دینا ناتھ کا خدا ہو۔

دینا ناتھ کو رحمان کا جواب بُرا لگا۔ وہ بہرا تو نہیں، جو رحمان کو چیلنج کی ضرورت پڑی۔ کوئی شش لے تو آفت آ جائے۔ اکیلے رحمان کے سامنے کھڑا رہنا اُسے بُرا لگا۔ وہ بھی رحمان کے بدرش چنار کی جڑ پر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی میں جانتا ہوں تُم ڈرتے نہیں۔ لیکن پوری بات تو سُنو آج ٹھیکہ دار نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا۔ کہتا تھا تُم مخالفت کرنا نہیں چھوڑو گے تو وہ سخت تدابیر کرنے پر مجبور ہو گا۔"

"تُم تو ٹھیکہ دار کو خُدا سمجھتے ہو۔ میں تو اُسے نالی کا کیڑا سمجھتا ہوں۔"

رحمان کا تیخ لہجہ سُن کر دینا ناتھ بھی بھڑک اُٹھا۔

"کیڑا ہی سمجھو لیکن ہے بہت بڑا۔ وہ چاہے تو تُمہیں پل بھر میں ختم کرا سکتا ہے۔"

"دھمکی دیتے ہو......" رحمان بپھر پڑا۔ دِل چاہا دینا ناتھ کی بوٹی بوٹی اُڑا دے۔ اِس کھلیان کے ایک ایک چنار کو اُکھاڑ پھینکے۔ سارے گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔ آج تو ساری سوجھ داری اُس کے برخلاف سازش پر تُل گئی تھی۔

"یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔ اُس کے پاس بہت طاقت ہے۔ سارا گاؤں اُس کی مُٹھی میں ہے۔" دینا ناتھ جوش میں آ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ غیر ارادی طور پر رحمان بھی کھڑا ہو گیا۔ سارے کھلیان پر سکتہ طاری ہوا۔ خاموشی اور گہری ہو گئی۔ دونوں دوست ایک دوسرے کو تولتے رہے۔ نگاہیں خاموشی سے نبرد آزما تھیں۔ آمنا سامنا برابر کا تھا۔

یہ حادثہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بچپن سے اب تک کئی بار اُن کا آپس میں آمنا سامنا ہُوا تھا۔ وہ سیب کی پھانک پر ایک دوسرے کو نوچنا...

... وہ دریا کنارے کیچڑ میں ایک دوسرے کو کاٹ کھانا...... وہ سگریٹ کے ٹکڑے کے لئے ایک دوسرے کو صلواتیں سُنانا..... وہ سینما کے شو پر ایک دوسرے سے رُوٹھ جانا اور آخر میں ٹھیکیدار کے معاملے پر بے تعلقی۔ اِرتقاء تھا۔ اِن حرکتوں میں...... نوچنا...... کاٹ کھانا... صلواتیں سُنانا...... رُوٹھنا اور آخر میں بے تعلقی...... لیکن آج وہ دونوں ایکبار پھر اِن ساری منزلوں کو پھاند کر پہلی منزل پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو نوچنے پر آمادہ تھے۔ بچپن کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ دینا ناتھ کو اپنا آپ چھوٹا ہوتا ہوا سا محسوس ہوا۔ اُس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ اور وہ دھیرے سے چنار کی جڑ پر پھر بیٹھ گیا۔

دینا ناتھ بیٹھ گیا تو رحمان پر ندامت کی بوچھار ہوئی۔ اپنا آپ قابو میں رکھتا تو اُس کی وقعت کم نہ ہوتی۔ سوچا جائے تو دینا ناتھ کا کہنا درست ہے۔ ٹھیکیدار کے پاس رُوپیہ ہے۔ آدمی ہیں اور سوبہ داری کے آفیسروں کی طاقت ہے۔ ٹھیکیدار چاہے تو اُسے کیڑے کی طرح مسل سکتا ہے۔ گاؤں کے لوگ تو مارے ڈر کے ٹھیکیدار کا نام زیر لب لیتے ہیں۔ عین وقت پر ساتھ چھوڑ گئے تو اکیلا مارا جائیگا۔ اِن گاؤں کے لوگوں پر بھروسہ نہیں...... ناحق اپنے آپ کو خراب کرنے سے فائدہ۔ اُسے اپنا آپ لُٹا ہوا سا محسوس ہوا یا شاید بیماری کا اثر بدن پر ابھی باقی تھا۔ وہ بھی چنار پر بیٹھ گیا۔ دونوں دوست اپنی سانسوں کو سنبھالنے لگے۔ جیسے کسی معرکے سے ہٹ کے نکل آئے ہوں۔

دینا ناتھ نے کہنا شروع کیا۔

"میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا اِس لیے صاف صاف کہہ رہا ہوں آج ٹھیکیدار نے فیصلہ کیا کہ تم اُس کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا نہ چھوڑو گے تو وہ

تم کو پٹوا دے گا۔ کیا معلوم مار بھی دے۔ گاؤں کے سب غنڈے چور اچکے اس کے تنخواہ دار ملازم ہیں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام ...... لیکن دوست ہونے کے ناطے تمہیں آگاہ کرنا میرا فرض تھا۔ ٹھیکہ دار کو پتہ چل گیا کہ میں چوری چھپے تم سے ملنے آیا تھا۔ تو میری بھی خیریت نہیں۔"

دینا ناتھ کے ایثار نے رحمان کے ذہن کی بہت ساری حدیں ڈھا دیں۔ سونہ واری کی زمین پر اسے کسی نے اپنا نہ سمجھا۔ نہ پھولی نے ...... نہ گڑھیا نے اور نہ ہی گاؤں والوں نے۔ سب اس کے جذبات سے کھیلتے رہے۔ لیکن آج بہت دنوں بعد اس کو کھویا ہوا سہارا ملا تھا۔ بہت دنوں بعد کوئی اس سے ہمدردی جتلا رہا تھا۔ اس کے دکھ سکھ کی پرواہ کر رہا تھا۔ اس کی پرواہ کر رہا تھا۔ ڈوبتے کو سہارا چاہیئے۔ گھاس کا تنکا ہی سہی وہ تنکے پر چھپٹا۔

"دینا ناتھ۔ میں بہت مشکل میں ہوں۔ میری مدد کرو۔ نہیں تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میرا دماغ کام نہیں کرتا۔"

"کیوں ...... کیا ہوا۔ کیا بات ہے" دینا ناتھ گھبرا گیا۔ رحمان ایک ہی جست میں پہاڑ کی چوٹی سے گر کر تہہ تک آگیا تھا۔

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے کہیں سے سو ایک روپے مل جانے چاہییں۔ نہ ملیں گے تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

روپے کا نام سن کر دینا ناتھ کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر رحمان کو جانچنے لگا۔ شاید یہ وہ رحمان نہ تھا جس کے ساتھ اس نے بچپن گذارا تھا۔ بلکہ سونہ واری کا رحمان تھا۔ جس کے ذہن پر سونا مسلط ہو گیا تھا۔ جس کی رگوں میں سونہ واری کا زہر سرایت کر گیا تھا۔ رحمان

شاید دوستی کی قیمت چاہتا ہے۔ یا کیا مشکل آن پڑی ہے۔ جو اتنی بڑی رقم درکار ہے۔"

دینا ناتھ کے اٹھنے کا انداز، دیکھنے کا ڈھنگ اور سوال پوچھنے کا لہجہ ........ رحمان کو اپنا آپ بھک منگا سا لگا۔ اب کے اس کے جواب میں وہ پہلا سا اشتیاق باقی نہ تھا۔

"ضرورت ہیں ...... ہوں تو دے دو"

"بھئی رحمان ...... تم جانتے ہو میری حالت، گھر کی حالت بھی تم سے چھپی نہیں۔ ویسے ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے۔؟"

"جب تمہارے پاس نہیں ہیں تو وجہ سن کر کیا کرو گے" رحمان کی آواز میں اب بالکل کوئی اشتیاق نہ تھا۔ دوستی صرف الفاظ کے گورکھ دھندے تک محدود ہو گئی تھی شاید۔ مدد کرنے کا موقعہ ہو تو گھر کی حالت کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ہوں ...... گھر کی حالت ..... دینا ناتھ شاید اسے بے وقوف سمجھ رہا ہے۔ گھر کی حالت خراب ہے تو کلائی پر بندھی چم چم کرتی گھڑی آئی کہاں سے .........؟

"بھئی وجہ تو بتاؤ میں شاید کہیں سے بندوبست کر سکوں" دینا ناتھ نے رحمان کے رویئے میں تبدیلی دیکھ کر رسماً کہا لیکن رحمان نے اپنی غلطی کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی تسلی ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم فکر نہ کرو۔ جب تمہارے پاس نہیں ہیں تو میں کہیں اور کوشش کروں گا۔ ویسے اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں چلتا ہوں"

رحمان کے جانے کے بعد دینا ناتھ بہت دیر رحمان کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ اندھیرے میں گہرا سایہ رحمان نہیں جا رہا ہے۔ بلکہ اس کا اپنا بچپن جا رہا ہے۔ اب شاید وہ کبھی رحمان سے نہ مل سکیگا۔ شاید بلدیو کا ٹھیک

کہتا تھا کہ اُس کا م
ہ کا اور رحمان کا کوئی میل نہیں۔ دونوں کے راستے الگ ہیں لیکن شاید رحمان
سیدھے راستے پر نہیں جا رہا ہے عجیب حالت تھی رحمان کی۔ گھڑی میں تولہ گھڑی
میں ماشہ۔ کبھی بھڑکتا اور دوسرے لمحے ٹھنڈا پڑ جاتا۔ شاید بیماری نے اُس
کا ذہن بھی ناکارہ کر دیا ہے۔ بے چارے کو سونہ داری کی ہوا نہ اس نہ
آئی۔ جب کبھی وہ شہر جائیگا۔ تو منیر اچاچا سے رحمان کا تذکرہ ضرور کریگا
گاؤں بھر میں کئی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ دوستی کے ناطے کچھ افواہیں
اُس سے بھی منسوب ہونے کا احتمال تھا۔ جیسے دوستی نہ ہوئی کوئی گناہ ہوا
کاش ..... اُس نے بلدکاک کا کہا مان لیا ہوتا۔ اور رحمان کو اپنے ساتھ
یہاں نہ لے آتا۔ رحمان کے شہر واپس جانے میں اُس کی اور اُس کی عافیت
ہوگی۔ وہ ضرور منیر اچاچا کو رحمان کو واپس شہر لے جانے پر آمادہ کرے گا۔
چاہئے اسے بڑا اسی کام کے لئے شہر جانا پڑے۔

دینا ناتھ نے آخری بار گھڑی دیکھ لی۔ رحمان کو گئے ہوئے کافی
دیر ہو گئی تھی۔ رحمان اب تک گاؤں پہنچ گیا ہوگا۔ اب کسی کے دیکھنے کا ڈر نہ
تھا۔ اس لئے مزید رکنا بے فایدہ تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ جیب میں
ٹھونس دے اور دھیرے دھیرے اپنی راہ پر ہولیا

بڑھیا دروازے کی چوکھٹ پر بظاہر اونگھ رہی تھی لیکن اُس کے کان ذراسی آہٹ پر چوکنے ہو جاتے۔ ہر آہٹ بدن میں خوف کی تھرتھری رواں کرتی۔ لمحے بھر کے لئے اُس کی اونگھتی نگاہیں اِرد گرد پھیلے اندھیرے سے لڑنے لگتیں۔ سارا وجود سراپا انتظار بن جاتا۔ ہر آہٹ کے گم ہوتے ہی اُس کی زندگی بھی موت سے ہمکنار ہونے لگتی۔ پھر پھڑاتی آنکھوں پہ رات ایک بار اور چھا جاتی اور ذہن دم توڑتا محسوس ہوتا۔

یہ رات بھی کچھ ایسی تھی جب زندگی موت کے قریب محسوس ہوتی ہے۔ شاید تاریک آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے ہوں گے لیکن اُس کی آنکھوں میں اب اتنی جوت نہ تھی کہ ستارے دیکھ پاتیں۔ چاند بھی کہیں ڈوب گیا تھا۔ اِن دنوں شاید اُس کی اپنی قسمت کے اماوس میں ڈوب کے رہ گیا ہے۔ جی چاہ رہا تھا اُٹھ کے آگ لگا دے دُنیا کو۔ کچھ تو روشنی پیدا ہو جاتی۔ اب باقی رہا کیا تھا اِس بے درد دُنیا میں۔ ایسی زندگی سے موت بہتر۔ کوئی بندھن باقی نہ رہ گیا تھا۔ اب سب بندھن ٹوٹ گئے تھے شاید۔ یقین کرنے کے لئے اُس نے ذہن پر زور دیا، اور اپنی ساری زندگی کو ٹٹولنا شروع کیا۔ اُسے کوئی بندھن نہ ملا جس کے

سہارے وہ زندہ رہنے کی سعی کرتی۔ اِس لئے اسے اب مرجانا چاہیئے۔ ضرور مرجانا چاہیئے۔ فیصلہ کرکے اُسے تسکین سی ملی۔ دروازے کا چوکھٹ داہنی ران میں بُری طرح سے کھُب آیا تھا۔ اُس نے پہلو بدل لیا۔ اُسے کچھ محسوس نہ ہوا۔ ٹانگ شاید سُن ہو گئی تھی۔

دفعتاً آنگن کے عمیق اندھیرے میں۔ اور زیادہ عمیق سایہ لہرا اُٹھا۔ وہ بے طرح ڈر گئی۔ دروازے سے ہٹ جانا چاہا۔ پر سوئی ٹانگ نہ اُٹھ سکی۔ وہ اُلجھ گئی اور دروازے کے ایک طرف لڑکھڑا گئی۔ موت شاید عمیق سایوں کی طرح ہی زندگی کے اندھیرے میں وارد ہوتی ہے۔

رحمان نے بڑھیا کے لڑکھڑانے کی کوئی پرواہ نہ کی۔ بڑھیا کو نظر انداز کرکے اُس نے دہلیز پھلانگ لی۔

کوئی اور دِن ہوتا تو بڑھیا کو رحمان کے رویّے سے بڑی ٹھیس لگتی۔ وہ شاید لڑتی بھی پڑتی۔ گِنتی تھی شاید وہ ........ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس نے ذہن جان بوجھ کر اپنی بے حِس ٹانگ میں اُلجھا رکھا تاکہ رحمان سے اُلجھنے کا موقع نہ ملے۔ رحمان اندھیرا سایہ ہی سہی ...... اِس گھُور اندھیرے کی دیوار کو چاک تو کر گیا۔

گِرتے پڑتے وہ کھڑی ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ دروازے کی چوکھٹ کا سہارا نہ ہوتا تو شاید راہداری میں داخل ہونا ناممکن ہوتا۔ راہداری میں زیادہ اندھیرا نہ تھا۔ کمرے میں جلتے دیئے کی روشنی راہداری کے اندھیرے کو چاک کر رہی تھی۔ وہ کمرے میں جاتے جاتے رُک گئی۔ ایک لمبی مدت کے بعد اُسے خیال آیا۔ کہ مکان بننے کے بعد اب تک کمرے کے دروازے میں پٹ نہ لگائے گئے تھے۔ گو لکڑی کا چوکھٹا مکان بنتے وقت

ہی دیوار میں چُن دیا گیا تھا۔ یہ مکان اُس کے خاوند نے بنایا تھا۔ لیکن
مکان پُورا بننے سے پہلے ہی اُس کے خاوند کی زندگی پوری ہو گئی تھی۔ اُسکی
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آج بہت دِنوں بعد دُکھوں سے نِڈھال بدن کو خاوند
کی یاد کا سہارا ملا۔ کسی کی کرخت آواز نے یادداشت کو منتشر کر دیا۔ اور
وہ گِرتے گِرتے بچی "کھانا دو..........."

اِس بیجا مداخلت پر بڑھیا جُھلا سی گئی۔ لیکن دیئے کی روشنی میں
رحمان کا جسم گھٹتا بڑھتا۔ اُس کی جھلاہٹ پر چھا گیا۔ وحشت کی عجیب
سی لہر اُس کے بُوڑھے بدن کو چھُو گئی جس کی تیزی نے سُن ہوئی ٹانگ
کو بھی جگا دیا۔ وہ چوکھٹ پار کر کے رحمان کے سر پر پہونچ گئی۔ ابھی اُس
کے بدن میں سکت باقی تھی۔

بڑھیا کو یوں تیزی سے آتے دیکھ کر رحمان گھبرا اُٹھا۔ بڑھیا بڑی
سرکش تھی۔ اور اُسے بڑھیا پر بالکل بھروسہ نہ تھا۔ اِس سارے گھر پہ
بھروسہ نہ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے آپ پر بھی بھروسہ نہ رہا تھا۔

"میں نے کھانا مانگا ہے......" رحمان نے الفاظ کی ڈھال
آگے کر دی۔ اور بھلا کر ہی کیا سکتا تھا وہ!

بڑھیا رُکی۔ رحمان کی آواز اب کے زیادہ کرخت نہ تھی ہوں...
مُرِیَل کُتیا سمجھ رکھا تھا لوگوں نے اُسے کہ جس کے جی میں آیا ٹھوکر لگا دی
وہ واپس مُڑی۔ رسوئی اور کمرے کے درمیان کچی منڈ پر بیٹھ گئی اور بڑے
اطمینان سے پوچھ بیٹھی۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا......"

"ڈاکٹر نہیں ملا......" رحمان کی آواز سپاٹ تھی۔

"کہاں تھا ڈاکٹر......" بڑھیا نے مجبوراً لہجے میں نرمی پیدا کی۔
یہی تو ایک وار تھا جس کی بدولت وہ رحمان کے لمبے چوڑے جسم پر قابو پا لیتی
تھی، ورنہ بس چلتا تو سب کو کاٹتی پھرتی...... گُتھا ہو مٹھہری۔
"ڈاکٹر کہیں گیا ہوا تھا۔ کمپونڈر ملا۔ وہ نہیں مانتا" کہتے کہتے رحمان
کے لہجے میں مسرت چمک اُٹھی۔
"کیوں نہیں مانا کمپونڈر......" بڑھیا بے تاب ہو گئی۔
رحمان نے گلا کھنکھار کر صاف کیا تاکہ ہر لفظ کی چوٹ واضح

ہو جائے۔
"کمپونڈر کہتا تھا۔ ایسا کرنا قانون کے خلاف ہے۔ خون کرنے
کے برابر ہے" وہ رُک گیا۔ بڑھیا ہر لفظ پر شکست کھاتی جا رہی تھی جیسے
رحمان کے مُنہ سے الفاظ نہ نکل رہے تھے بلکہ نشتر نکل رہے تھے۔
نا امیدی کے نشتر...... بڑھیا کو دُکھی ہوتے دیکھ کر رحمان کے
انگ انگ میں وحشت مچل اُٹھی۔ شاید سوکھی سیڑھیوں کے اندھیرے
میں نا امیدی کے نشتر سہہ رہی ہو گی۔ اُسے چاہیئے۔ آہستہ آہستہ
الفاظ کے نشتر اِن لوگوں کے وجود میں اُتارتا چلا جائے۔ تاکہ درد
اور تکلیف اِن کو ادھ موا کر دے...... نہیں...... اُسے بڑی
تیزی سے چلا چلا کے چیخنا چاہیئے۔ تاکہ سارا مکان سُن لے۔ سارا گاؤں
سُن لے۔ ساری دُنیا سُن لے اور یہ گھر تہہ و بالا ہو جائے۔ اِس گھر کے
مکینوں کے پرخچے اُڑ جائیں۔ اُس کی اپنی سوچ کے پرخچے اُڑا دیئے
تھے اس گھر کے مکینوں نے......!
"اب کیا ہو گا...... اب کیا ہو گا۔" بڑھیا کی سسکیاں سُن

کر رحمان کو ہنسی آ گئی۔ ڈائن سمجھی ہو گی کہ کچھ آنسو دیکھ کر وہ پسیج جائے گا۔ بالکل غلط خیال تھا بڑھیا کا۔ اب وہ مٹی کا مادھو نہیں بلکہ ٹھوکریں کھا کر پتھر بن گیا ہے...... پتھر....

" اب کچھ نہیں ہو سکتا.... " رحمان نے اپنی آواز میں پتھر جیسی سختی پیدا کی۔ " کمپونڈر کہتا تھا ڈیڑھ سو روپئے لگیں گے ڈاکٹر کو آمادہ کرنے پر...... ہا ہا ہا...... ڈیڑھ سو روپے میں ڈاکٹر بھی ایسا کام کریں گا جو بغیر روپئے کے خون کرنے کے برابر ہے۔ سمجھی تم...... خون کرنا ہو گا........ خون....." رحمان مزا لینے کے لیے رک گیا۔ بڑھیا کا ہر ایک ایک لفظ کے بوجھ تلے ٹوٹتا جا رہا تھا۔ جیسے الفاظ نہ گر رہے تھے۔ پتھر گر رہے تھے۔

" ڈیڑھ سو روپئے ہیں تو دے دو۔ سب کام ہو سکتے ہیں روپئے سے دنیا کے سب کام ہو سکتے ہیں۔ اور کیوں نہیں..... جب کچھ ٹکوں کے عوض پھولی نے عبدالسلام کے ساتھ ٹانگیں بڑھا دیں۔ اس کے پاس سو گئی۔ تو ڈیڑھ سو روپئے میں ایک جان کو ختم کرنا مہنگا نہیں..... ملے نا عبدالسلام کہیں، تو اس کی ٹانگیں چیر کے رکھ دوں۔ سالا.... حرامزادہ کمینہ..... کتا......"

غصے کے مارے اس سے بولا نہ گیا۔ جی چاہ رہا تھا اپنے بال نوچ دے اپنا گلا کاٹ لے...... لعنت تھی اس پر۔ اس کی مردانگی پر.... ...پھولی مالزادی عبدالسلام کے پاس سو جاتی تھی۔ لیکن اس کے سامنے بڑی پارسا بنی پھرتی تھی۔ پاک دامن.... کتیا.... نامرد سمجھ رکھا تھا اسے۔ اب دونوں ماں بیٹیاں جائیں عبدالسلام کے پاس۔ حرامزادیاں

مالزادیاں ..... چڑیلیں .....
نہیں روپے توفے دو نہیں تو جاؤ عبدالسلام کے پاس۔ اُس کا
بستر گرم کرو۔ میرے پاس اب رکھا کیا ہے۔ تم لوگوں کی خاطر میں اپنے ماں
باپ سے لاپرواہ ہُوا۔ اپنے دوستوں کو چھوڑ بیٹھا۔ سجائی بندوں سے
کنارہ کر لیا۔ اب کیا باقی ہے میرے پاس ...... بولو .... جواب
دو ..... میرے پاس کچھ نہیں۔ اب جاؤ عبدالسلام کے پاس ...
میرے پاس اب کچھ نہیں ..... کچھ نہیں ... "
آخری الفاظ چیخ اُٹھے۔ کمرے میں بھونچال سا آ گیا۔ بڑھیا منڈیر
پیچھے سے اُٹھی اور اُس کے سامنے آ پڑی۔ اُس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ بڑھیا
کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ رہے تھے۔ اُبل اُبل کر جھریوں سے بھرپور چہرے
پر ننھی ننھی ندیوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ بہہ بہہ کر ٹھوڑی کو تر کر رہے تھے۔
پوپلا مُنہ ندامت سے تھرتھرا رہا تھا۔
" رحم کرو ..... رحم کرو ہم پر۔ عبدالسلام کا نام نہ لو اس گھر میں
اس گھر کی بچی کا خون کر دیا اُس نے۔ اُس کی آنتیں نکل آئیں۔ اُس کے
بال بچے سڑ جائیں۔ ہائے خدا جیسا حال میری بچی کا کر دیا ویسا ہی اُس کی
بیٹیوں اور پوتیوں کا ہو۔ بہنوں کا ہو ........ "
بوڑھیا کے لمس سے رحمان سُکڑ سا گیا۔ اُس نے اپنے پاؤں
کھینچ لئے۔ بے قابو ہونے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ اپنا دُکھ درد کم تھا۔ جو بے
قابو ہو کر اور دُکھ درد کو دعوت دے رہا ہے۔ بھولی کی حالت، بڑھیا کی
چیخ و پکار، دنیا ناحق کی سرد مہری اور ٹھیکہ دار کا ڈر کافی تھے۔ ہر انسان
کسنے کے لئے۔ اُسے چاہیے روز کی طرح چپ سا دھ لے۔ اور صبح مُنہ اندھیرے

اپنا بستر بوریا باندھ کر اِس گھر سے نکل جائے، کسی طور اِس جہنم سے چھٹکارا پالے۔

رحمان کو چپ ہوتے دیکھ کر بڑھیا کی آس کچھ بندھ گئی۔ اُس نے ہیر چھوڑ دیے اور سامنے بیٹھ کر سسکیاں لینے لگی۔

"بیٹا اب تمہارے بغیر میرا کون ہے اِس دُنیا میں جو مجھے اِس آفت سے نجات دلا سکتا ہے۔"

"میں نے کہا نا میرے پاس کوئی روپیہ نہیں۔ تم تو خود جانتی ہو......"

رحمان نے دھیرے سے کہا۔ پھر کتنا بھڑکانا فضول تھا۔

"کہیں سے کچھ کر دو بیٹا۔ ورنہ میری بیٹی مر جائے گی۔ اب مجھ سے اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ کچھ تو کرو۔" بڑھیا گھگھیائی۔

"بیٹی اتنی پیاری ہے تو مکان بیچ دو نا۔ ڈھیروں روپے مل جائیں گے۔"

بڑھیا کو غصّہ کا سا لگا۔ مکان بیچ دے گی کیا؟ وہ مکان ... جس کو اُس کے خاوند نے اٹھائیس سال کی جان توڑ محنت سے کھڑا کیا تھا۔ جس کی ایک ایک اینٹ اُس کے خاوند نے اپنے ہاتھوں سے چُن دی تھی۔ اس مکان کی دیواروں میں گارے مٹی کے بدلے اُس کے خاوند کا خون پسینہ تھا۔ اپنے مرحوم خاوند کو بیچ دے گی کیا؟ اُس نے اب تک کئی بار ادھار لیا۔ اُدھار نہ ملا تو فاقے کئے۔ تب بھی اُس نے مکان کے متعلق ایسا نہ سوچا۔ آج یہ چھوکرا اُس کی غیرت کو للکار رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے نفرت کی بجلی سی اُس کے وجود میں کوندگئی پر دوسرے لمحے ممتا کے اتھاہ ساگر میں بجھ بھی گئی۔ پھولی کی جان بچ جائے۔ تو مکان جائے جہنم میں۔ ماضی کے

تمہارے زندگی گذرنے سے تو رہی۔ اُس نے مایوس ہو کر کہا۔
"بیچ دو چاہے جلا ڈالو...... لیکن کہیں سے میری بیٹی کی جان بچانے
کے لئے روپئے لا دو"

"میں کہاں بیچتا پھروں گا۔" رحمان جھنجھلا اُٹھا۔ داد الٹا پڑ رہا
تھا۔ سچی بات ہے تو بھی بیچا نہیں جھپٹتا اور جو بڑی بات ہے تو بھی بڑھیا
پنڈ پکڑے بیٹھی تھی، اس کی جان مصیبت میں پھنس گئی تھی۔

"تم مرد ہو، ادھر اُدھر کوشش کر کے بیچ سکتے ہو۔ میں عورت
ذات کہاں بیچتی پھروں گی۔" اور رحمان کا دل چاہا کہ کہہ دے تو عورت
کہاں ہے۔ تو تو کوئی ناگہانی آفت ہے کہ جس پر گرے ملیامیٹ اور نابود کر گئی
"دیکھو......" رحمان نے سمجھانا شروع کیا "میں صاف
صاف کہے دیتا ہوں۔ مکان بیچتے بیچتے کئی دن لگ جائیں گے۔ اور میں
اس گھر میں اب ایک پل نہیں ٹھہر سکتا۔ میں کل منہ اندھیرے یہ گھر چھوڑ
رہا ہوں" اور وہ کھانا کھائے بغیر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"یہی بدلے دے رہے ہو میری خدمتگاری کا۔ تمہاری بیماری میں تیمارداری
کرتے کرتے میری کمر دوھری ہو گئی۔"

بڑھیا نے اب کے اس کے گھٹنے پکڑ لئے تاکہ وہ کھڑا نہ ہو سکے۔
رحمان کا جی چاہا کہ لات مار کر بڑھیا کا بھُرکس نکال دے۔ برداشت
کی بھی حد ہوتی ہے۔ لیکن اُس کی لات نہ اُٹھی۔ واقعی بڑھیا کے بہت
سارے احسان تھے اُس پر۔ اور وہ احسان فراموش نہ تھا۔ اس لئے وہ
پچھلے کچھ دن ڈاکٹروں۔ اور حکیموں کے پاس پھیرے لگاتا رہا۔ اُس
کے پاس روپئے ہوتے تو ضرور دے دیتا۔ مکان جلدی بک نہیں سکتا

تھا۔ اور پھولی کی حالت خراب تھی حمل گرانے کے لئے نہ معلوم کیا انٹ شنٹ
کھا گئی تھی کہ سارا جسم پھول گیا تھا۔ دیر ہو گئی تو بچنے نہ پائے گی۔ وہ
کیا کرے، کدھر جائے۔ بڑھیا کی خدمت گاری کا تقاضا تھا کہ قرضہ
بے باک ہو جائے۔ بڑھیا نے اُس کی جان بچائی تھی، اُس کی بیٹی کی جان
بچانی چاہیئے۔ ناؤ بیچ دے تو چالیس پچاس روپئے کا بندوبست ہو سکتا
ہے اور کمپونڈر نے ڈیڑھ سو روپے کی شرط رکھی تھی۔ اور جو ناؤ
بیچ دے تو پھر کرے کیا...... ! ناؤ بیچنی اپنی زندگی بیچنا ہوئی۔ ناؤ
کے کھردرے پیٹوں سے مانجی وجود میں آتا ہے۔ ناؤ کے سہارے زندگی
کا حق حاصل کرتا ہے۔ اور آخر میں ناؤ کی گود ہی میں ابدی نیند سوجاتا
ہے۔ اُس کی ہر غلطی معاف ہو سکتی ہے لیکن ناؤ بیچنے کی غلطی تا ابد
معاف نہ ہو سکے گی۔ نہیں ،.......... وہ ناؤ نہیں بیچ سکتا ہے چاہے
اپنا آپ بیچ دے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔

"دیکھو ٹانگیں پکڑنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں یہاں سے کل ضرور
نکل جاؤں گا۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے"

"آخری فیصلہ ہے......" بڑھیا اتنی تیزی سے کھڑی ہو گئی جیسے
اُس کے بدن میں کرم خوردہ ہڈیاں نہ تھیں بلکہ کمانیاں تھیں۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کیا......؟" بڑھیا نے دُہرایا۔ لہجے
میں عجیب سی درشتی تھی، رحمان کے بال کھڑے ہونے لگے۔

"تُم میں اگر ہمت ہے تو نکل کے دیکھو۔ میں بھی دیکھتی ہوں۔
گاؤں والے تمہیں زندہ کیسے جانے دیتے ہیں"

"کیا بگاڑیں گے گاؤں والے میرا" رحمان نے بظاہر بہادری

دکھائی لیکن دل بیٹھا جا رہا تھا۔ "میں نے کیا بگاڑا ہے گاؤں والوں کا"

"گاؤں کا نہ بگاڑا ہو لیکن چھولی کا تو بگاڑا ہے اور چھولی سارے گاؤں کی بیٹی ہے۔" بڑھیا ہاتھ نچا کر بولی۔

"کیا مطلب......" رحمان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ دل میں موہوم خوف ابھر رہا تھا۔

"چھولی کے پیٹ میں تمہارا بچہ ہے سمجھے...... تمہارا بچہ" اور رحمان کو ایسا لگا جیسے موہوم خوف نے مجسم صورت بن کر اس کے سارے وجود کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا ہو۔ وہ بوکھلا گیا۔ "یہ بچہ عبدالسلام کا ہے۔ چھولی نے تم سے خود اقرار کیا ہے"

"لیکن میں گاؤں والوں سے کہہ دوں گی یہ بچہ تمہارا ہے۔" بڑھیا نے وار کیا۔

"تو سٹھیا گئی ہے۔ گاؤں والے تمہاری بات کا اعتبار نہیں کریں گے وہ مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں" رحمان ہراسان ہونے لگا۔

"کیوں اعتبار نہیں کریں گے؟۔ تم اتنے دنوں اس مکان میں رہے۔ چھولی کا سا تھ دن بھر کا تھا۔ تم جوان ہو، شہر سے آئے ہو۔ چھولی گاؤں کی بھولی بھالی لڑکی ہے ریجھ گئی ہوگی تمہاری باتوں پر۔ کون ہے جو اعتبار نہیں کرے گا"

رحمان کے ذہن میں کھلبلی مچ گئی۔ بڑھیا کی بات معقول تھی۔ کہہ دیا بڑھیا نے گاؤں والوں سے تو اس کی کوئی نہیں سن لے گا جان کے لالے پڑ جائیں گے اور جو بچ نکلے تو شہر بات پہنچ جائے گی۔ باپ بھی یقین نہ کرے گا۔ پھر ہتھکڑی ہوگی۔ تھانہ ہوگا۔ جیل ہوگا۔ بڑھیا حرامی تھی۔ حرامزادی تھی ڈائن تھی۔ اس کا بس چلے تو گلا گھونٹ دے اس ڈائن کا۔ دیکھو تو...... ہنس ہنس

کے کیسے منہ چلائے جا رہی تھی۔

"اتنا ہی نہیں، یہ بھی کہہ دوں گی کہ گناہ چھپانے کے لیے تم نے چھوٹی کو کچھ کھلا دیا ہے۔ تاکہ وہ مر جائے اور تم اس بہانے بچ نکلو۔"

بڑھیا کی آواز نے اسے پاگل بنا دیا۔ وہ بے تحاشہ چلا اٹھا "تم ایسا نہیں کر سکتی" لیکن سوکھے حلق سے آواز مری مری سی نکلی۔

"میں کہوں گی ضرور کہوں گی۔ مجھ بڑھیا کو گڑیا سمجھ رکھا ہے کیا۔ اب میں دیکھ لوں گی کہ چھوٹی ٹھیک ہوئے بغیر تم یہاں سے کیسے جا سکتے ہو۔"

بڑھیا کا ہر لفظ اس کے ماؤف ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ کوئی چھٹکارا نہ تھا اس جال سے۔ بڑھیا نے ماہر مکڑی کی طرح جالا بن رکھا تھا۔ وہ کوشش کرے نکلنے کی تو شاید اور الجھ جائے۔ اب تو اس میں کوشش کرنے کے لیے سکت بھی باقی نہ رہ گئی تھی، اپنے آپ سے لڑ لڑ کے دو دن پریشان رہا۔ اب تو وہ عاجز آگیا تھا اس کشمکش سے۔ کاش بڑھیا چپ رہے ...... چپ رہے ..........

"چیخو نہیں ماں .......... چیخو نہیں۔ جب تک چھوٹی ٹھیک نہ ہو جائے گی میں اسی جہنم میں سڑتا رہوں گا۔ میں روپیوں کا بندوبست کر دوں گا۔" رحمان کا دل الفاظ کے جامے میں خون بن بن کے نکل رہا تھا "میں کل شہر جاؤں گا۔ میرے باپ نے بہو کے لیے گہنے کپڑے جمع کر رکھے ہیں۔ میں وہ کپڑے گہنے بیچ دوں گا .......... نہ .......... نہ، میں بھاگوں گا نہیں۔ نادیہ سر پر ہے، نہیں چھوڑ کے جاؤں گا۔ بھاگ بھی جاؤں تو کہاں، تم لوگ میرا پیچھا کب چھوڑنے والے ہو۔ نہیں میں بھاگ نہیں سکوں گا۔ اب تو خوش ہو ناں؟ پر ماں ... اب تم چیخو نہیں .......... میرے کانوں میں درد ہو رہا ہے۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔

میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔“

اُس کا سر گھٹنوں کے بیچ لڑھک گیا۔ ہونٹوں کی بھڑ بھڑاہٹ جاری رہی۔ بدن بھی جھٹکوں سے ہل رہا تھا۔ شاید رو رہا تھا۔ بڑھیا کے دِل پر برچھیاں سی چلیں۔ جی چاہا، جا کے رحمان کو گود میں اُٹھا لے۔ اُسے اپنے سُوکھے سینے سے چپٹا رکھے۔ اُس کے انگ انگ کو چُومے۔ مدتوں بعد اُسے بیٹا مل گیا تھا۔ لیکن وہ آگے نہ بڑھ سکی۔ کبھی کبھی لاڈلوں کو بھی بے سہارا چھوڑنا بہتر ہوتا ہے!

بڑھیا نے آنسو پونچھ لیے اور رسوئی کی طرف چل دی۔ کھانا شاید بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

دروازہ بند تھا، کھڑکیاں بند تھیں، کھڑکیوں کی درزوں پر کپڑا
پھیلا دیا گیا تھا، کمرے پر گہری تاریکی مسلط تھی، پھولی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
تاریکی میں گھور رہی تھی، کروٹیں بدل بدل کے اُس کا جی ہلکان ہو گیا تھا، بارش
کی سرسراہٹ نہ ہوتی تو اُس کی "ہائے.... ہائے" "تاریک چادر کو چیر
کر، سیڑھیاں پھاند کر نیچے پہنچ جاتی اور بڑھیا چولہے کو جلتا چھوڑ کر اُس
کو جلانے کے لئے اُوپر آجاتی۔ اُس کے بدن کو ٹٹولتی، اُس کے درد کو
کریدتی اور آخر میں ایک دو گالیاں بک کر اُسے پھر تاریکی میں اکیلا چھوڑ
کر واپس چلی جاتی۔

روز تو یہی ہوتا تھا، روز اندھیرا اُس کے پیٹ میں، ہلکی سی کسک کو
جنم دیتا۔ کسک بڑھتے بڑھتے درد کی لہر میں تبدیل ہو جاتی۔ لہر بڑھتے بڑھتے
درد کا دریا بن جاتی، جسم کے انگ انگ سے درد رِسنے لگتا۔ وہ تڑپ اٹھتی
تو حرکت سے درد کے کئی سیلاب جنم لیتے جیسے اُس کے جسم کے ہر مسام میں
درد کا سوتا اُبھر رہا ہو۔ حتیٰ کہ اُس کا اپنا سارا وجود ایک گہرا درد بن جاتا تھا
درد اُس کے حلق سے چیخ بن بن کر نکلتا۔ چیخ تو کمرے کے اندھیرے میں گم ہو

جاتی۔ لیکن چیخ کی گونج سارے مکان میں ایک تیز درد کا اضافہ کرتی تھی۔ شاید ماں بھی کسی نئے درد سے بے کل ہو کر اوپر چلی آتی تھی۔ ماں کی انگلیاں درد کے نشتر بن کر پیٹ پر بندھی پٹیوں میں الجھ جاتیں۔ اور ماں کی نگاہیں نفرت سے پُر درد کے تھپیڑوں کی طرح اس کے انگ انگ کو بہا لے جانے کی کوشش کرتیں۔ پٹیاں صحیح سلامت ہونے پر ماں کے منہ سے برستے انگارے اس کے ذہن پر درد کے طمانچے مارتے محسوس ہوتے۔

“ال زادی ... چیختی کیوں ہے۔ کیا سارے لگادوں کو اپنی کرتوتوں کا پتہ دینا ہے۔”

یہی روز ہوتا تھا۔ اور یہی روز ہوا کرتا تھا لیکن آج جیسے سارا درد سمٹ کر چھاتیوں میں آ ڈبکا تھا۔ چھاتیاں پھٹ پڑنے کو آ رہی تھیں۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ کاش یہ درد موت بن جائے اور وہ مر جائے۔ اب کچھ سہا نہ جاتا تھا۔

وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھنے لگی۔ سینے پر بے انتہا تناؤ چھا گیا۔ ماتھے پر ننھے ننھے کیڑے سے رینگنے لگے۔ اس نے انگلیوں سے ماتھے کو ٹٹولا۔ انگلیاں پسینے سے لتھڑ گئیں۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ تکیے کا سہارا لے کر وہ بیٹھنے میں کامیاب ہو گئی۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور ہاتھوں سے بستر کے ارد گرد ٹٹولنا شروع کیا۔ اندھیرے میں کچھ بھی تو نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کسی چیز سے ٹکرا گئے۔ انگلیاں خدوخال ٹٹولنے لگیں۔ ہاتھ میں واقعی پیالہ تھا۔ اس نے پیالے کو اٹھا کر دوسرے ہاتھ پر الٹا کر دیا۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ کچھ چائے کی ابلی پتیاں ہاتھ پر گر گئیں۔ لحاف کے

کونے سے وہ پیالے کو صاف کرنے لگی۔ یکایک وہ رک گئی۔ بھلا پیالہ صاف کرنے سے فائدہ۔ دودھ پھینکنا ہی تو تھا۔

پھرن کے گریبان سے چھاتیاں نکالتے ہوئے اُسے بے انتہا درد محسوس ہوا۔ چھاتیاں پتھر کی طرح سخت ہو گئی تھیں۔ دونوں چھاتیاں اکٹھی گریبان سے باہر آنا ممکن نہیں ایک چھاتی نکال کر اُس نے ٹٹول کر پیالے کا رخ سیدھا کر دیا۔ اور ہولے ہولے چھاتی دبانے لگی۔ درد کی شدت سے وہ بے حال ہو گئی۔ شاید درد کا دوسرا نام عورت تھا۔

پیالہ بھر گیا تو اُسے کچھ آرام آ گیا۔ درد دودھ بن کر بہہ گیا۔ اُس نے چھاتی کو پھرن کے اندر کر لیا۔ اور کان لگا کر آوازیں پرکھنے لگی۔ بارش کی سرسراہٹ اونچی ہو گئی تھی۔ مکان کے کسی کونے سے ٹپ ٹپ کی واضح آواز آ رہی تھی۔ اُسے اطمینان ہوا۔ احتیاط سے پھرن کے گریبان سے دوسری چھاتی نکال کر وہ ہولے ہولے دبانے لگی۔

یکایک اُس کے ہاتھ رک گئے۔ سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ کوئی آ رہا تھا یا شاید مکان کی کڑیاں سردی کی وجہ سے سکڑ رہی تھیں۔ اُس نے دروازے کی سمت بغور دیکھا۔ دروازے کی روشن درزیں چھپنے لگیں۔ اس کے ہاتھ بے تحاشا پیالے کو چھپانے کے لئے بڑھے۔ جلدی میں پیالہ الٹ گیا۔ اور سارا دودھ لحاف میں جذب ہو گیا۔ پیالے کو ایک طرف ٹیک کر اُس نے لحاف کھینچ کر چھاتی کو چھپا لیا اور تکیے پر گر گئی۔ اس گھر میں اُس کی جان پر مصیبت بن آئی تھی۔ ایک پل چین نہیں لینے دیتے تھے یہ لوگ۔ اب ساری رات دودھ سے بھیگی لحاف کے نیچے ٹھٹھرنا تھا۔

دروازہ کھل گیا۔ بڑھیا ایک ہاتھ میں جلتا دیا اور دوسرے ہاتھ میں چاول کا کٹورا لے کر نمودار ہوئی۔ چاول کا کٹورا چھوٹی کے سامنے رکھ کر بڑھیا نے دیا طاق پر جما دیا۔ کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ اور کچھ کہے سنے بغیر واپس چل دی۔ حتیٰ کہ دروازہ بھی کھلا چھوڑ گئی۔ سارے کمرے میں سردی کا سیلاب داخل ہو گیا۔ ٹھنڈے ہوا کے جھونکوں سے دیئے کی لو بری طرح ٹمٹمانے لگی۔ تب کہیں چھوٹی کو محسوس ہوا کہ ایک دن ختم ہو گیا ہے۔ اس کی درد بھری زندگی کا ایک کٹھن دن مر گیا۔ کاش ...... اس کی زندگی کے سارے دن مر جاتے اور وہ مر جاتی۔ ایسی زندگی سے موت بہتر تھی۔ ماں چھوٹے منہ بات نہ کرتی تھی۔ جب کبھی کچھ کہتی تھی تو ساتھ ساتھ کوسنے رہتی تھی۔ رحمان کا برتاؤ، بڑھیا کے برتاؤ سے بھی بدتر تھا۔ رحمان نے اس کو گندے نالے میں رینگتے کیڑے کی طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ مسل ہی دیتے یہ لوگ تو ایسے دکھ سے نجات مل جاتی۔ اب یہ بے رخی سہی نہ جاتی تھی۔ اسے اپنی حالت پہ رونا سا آ گیا۔ آنسو آنکھوں میں مچل رہے تھے۔ لیکن آنسو بہانا مشکل تھا۔ بڑھیا آنسو دیکھ لے تو قیامت ڈھا دے اور آنسو نکلتے مشکل تھے۔ بے حال ہو کر اس نے لحاف کو کھینچ کر منہ چھپا لیا۔ لحاف آنسوؤں سے اور ذرا بھیگ جائے تو کیا فرق پڑے گا۔

ایک بار پھر آہٹ ہوئی اور ماں کی کرخت آواز آئی "حرامزادی چاول نہیں کھائے گیا ........"

خوف سے ادھ مری آواز لحاف میں سسک اٹھی "پانی ...... پانی نہیں ہے ہاتھ دھونے کے لئے ......"

آواز سُن کر بڑھیا کے دل پر برچھی سی چلی۔ اُس کی بیٹی زندہ درگور ہو رہی تھی، پر نرمی دکھانا اُسے منظور نہ تھا۔ نرمی دکھانے کی وجہ سے ہی تو یہ بُرا دن دیکھنا نصیب ہوا۔ سختی برتی ہوتی تو شاید چڑیوں ہاتھ سے نہ نکل جاتی۔ اب جائز ناجائز طریقے سے بھولی کو قابو میں رکھنا ہو گا۔ چاہے ایسا کرتے کرتے اُسکی بوڑھی ہڈیاں چُور چُور کیوں نہ ہو جائیں۔ خون پسینہ بہا کے بڑھاپے نے جو دُنیا آباد کرنا چاہی وہ جوانی کی ایک غلطی نے ڈھا کے رکھ دی تھی اور اُس بڑھیا کو اُمیدوں اور ارمانوں کے کھنڈروں پر بین کرنے کے لیے زندہ رہنے دیا۔

"بڑی پاکباز بنی پھرتی ہے......... ہوں...... ہائی چاہیے...." بڑھیا بڑبڑاتے ہوئے واپس لوٹ گئی۔

آہٹ مرتے ہی بھولی نے منہ سے لحاف ہٹا لیا۔ چھاتی کو گریبان کے اندر سنبھال لیا۔ اور آنسو پونچھ ڈالے۔ اُٹھ کر بیٹھنے سے جسم میں درد کی ان گنت لہروں نے پھر سے جنم لیا۔ اور اُس کا سارا جسم درد کی لہروں پر ڈھولنے لگا۔

ایک بار اور آہٹ ہوئی اور وہ جھنجھلا گئی۔ جب کبھی دروازے پر آہٹ ہوتی تھی تو اُسے چوکنا ہو کر بیٹھ جانا پڑتا تھا۔ جیسے اُس کو کوئی دُکھ نہ تھا، کوئی درد نہ تھا۔ جیسے کسی ڈاکٹر کی چھریاں اور نشتر اُس کے بدن پر نہ آزمائے گئے تھے۔ نہ ہی کسی کمپونڈر کے کٹھور ہاتھوں نے اُس کے جسم کو اُلٹ پلٹ کے رکھ دیا تھا۔ کمپونڈر کے کٹھور بے رحم ہاتھ عبدالسلام کے کٹھور بے رحم ہاتھوں سے زیادہ کٹھور اور بے رحم ثابت ہوئے تھے۔ یاد آتے ہی اُس کا ذہن ڈانوا ڈول ہونے لگا۔

یکایک اُس کا ذہن چھلک سا پڑا۔ دروازے میں سے عبدالسلام ہاتھ میں گلاس لیئے آرہا تھا۔ وہ اور نہ سہہ سکی۔ کیا ہوا اگر عبدالسلام نے مونچھیں منڈوالی تھیں۔ اب مونچھیں منڈوانے سے فائدہ۔ پہلے کہاں دھیان لیا ہوتا۔ اور مونچھیں منڈوالی ہوتیں تو شاید چبھ نہ جاتیں۔ اور وہ لہولہان نہ ہو جاتی۔ اب شاید عبدالسلام کوئی اور مصیبت لے کر آرہا ہے۔ شاید زہر بھرا گلاس...... زہر پی لے تو اِس دُکھ درد سے نجات تو مل جائے گی۔ لیکن عبدالسلام کے ہاتھوں وہ زہر پینے کی بھی روادار نہیں۔ وہ اتنی گئی گذری نہیں۔ ایسے سامنے گلاس رکھ رہا ہے۔ عبدالسلام جیسے ...... کو کھلا رہا ہے.......... ہوں!

"اوہ......" وہ زور سے چیخ پڑی۔ گلاس تھامے ہاتھ گھبرا سے تھرا گیا۔ اور گلاس فرش پر گر گیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "میں تمہارے ہاتھ سے زہر بھی نہ پیونگی۔ سمجھے۔ تمہارے ہاتھ سے زہر بھی نہ پیونگی۔"

"یہ...... یہ پانی کا گلاس تھا" رحمان کی گھبرائی ہوئی آواز نے اُس کے مفلوج ذہن کے پرخچے اُڑا دیئے۔ عبدالسلام...... اور...... رحمان...... رحمان اور عبدالسلام زندگی کی اُلجھی ڈور کے دو سرے۔ کس کس کو پکڑتی پھرے وہ

ویٹ کی مدھم روشنی میں کچھ بھی تو نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ کاش اُس کی سمجھ میں کچھ آئے۔ کاش سر کا درد کچھ کم ہو۔ کاش وہ کچھ کر سکے...... کاش...... اب رونے بغیر چارہ نہ تھا۔

رحمان کشمکش میں پڑ گیا۔ آج تک اُس نے عورتوں کو کبھی نہ

روتے دیکھ لیا تھا۔ تب بھی نہیں جب وہ بڑھیا اور پھولی کو ساتھ لے کر ڈولر کی راز دار خاموشی کی جانب چل دیا تھا۔ جہاں ڈاکٹر اور کمپونڈر سرکنڈوں کے گھنے جھنڈ میں چھریاں اور نشتر لے کر انتظار کر رہے تھے۔ پھولی اس دن ایک ایسی بھیڑ کی طرح چپ تھی جو جانتا ہو کہ ذبح خانے کے علاوہ اس کی اور کوئی منزل ناممکن ہے۔ اور تب بھی اس نے پھولی کو نہ روتے دیکھا تھا۔ جب ڈاکٹر نے پھولی کے چھوٹے جسم میں بے دردی سے نشتر اُتارے تھے۔ دیکھ بھی کیسے لیتا۔ وہ پھولی سے دُور...... بہت دُور ڈولر کے کنارے سرکنڈوں کے سائے میں ایسے ڈبکا رہا جیسے زندگی کو پیدا ہونے سے پہلے مرتا نہ سہہ سکے۔ تصور میں اس نے کئی بار پھولی کے چہرے کو اُبھارنے کی کوشش کی لیکن ہراسان ذہن خدو خال واضح نہ کر پایا تھا۔

ایسے سوچا جائے تو اس نے پھولی کو کئی بار روتے دیکھ لیا تھا۔ جب کبھی بڑھیا پھولی سے لڑ پڑتی تو ماں بیٹی کے لڑنے کی تان رونے پر آکر ٹوٹ جاتی تھی۔ اور پھولی ہر بار سر گھٹنوں میں چھپا کے روتی تھی دھیرے دھیرے...... ہلکے ہلکے...... سسکیوں میں لپیٹ لپیٹ کر...... شرم کا آنچل تانے پھولی اس کے سامنے کئی بار روئی تھی۔ اور اس نے کبھی پھولی کا سر اُٹھا کر رونے کا سبب نہ پوچھا تھا۔ عورت کو روتا دیکھ کر وہ بے بس سا ہو جاتا تھا۔

لیکن آج پھولی منہ چھپائے بغیر رو رہی تھی۔ بے شرم ہو کر رو رہی تھی۔ اُسے دکھا دکھا کر رو رہی تھی۔ آج نہ سر اُٹھانے کی ضرورت تھی اور نہ سبب پوچھنے کی ضرورت۔ وہ خود دئیے جا رہی تھی۔

جیسے روئے ہی جائے گی۔ اور صدیوں روتی ہی رہ جائے گی۔ آنسوں آنکھوں
سے یوں ٹپک رہے تھے جیسے طاق پر رکھے جلتے دیئے سے تیل کے قطرے
ٹپک رہے ہوں ........ نہیں ........ طاق پر رکھے جلتے دیئے سے
انگارے ٹپک رہے ہوں۔ جیسے ملائم گالوں پہ آگ کی لکیریں بناتے جا رہے
ہوں۔ رحمان کو اپنا وجود دہکتا سا محسوس ہوا۔ جی چاہا پھولی کو اپنے
بازوؤں میں لپیٹ لے۔ اس کے گالوں پر بہتی آگ کی لکیریں کو چاٹ چاٹ
کر بجھا دے۔ اس کی آنکھوں میں ابلتے آگ کے سوتوں کو اپنے وجود سے
ڈھک دے۔ روتے ہوئے پھولی بڑی حسین لگ رہی تھی۔۔۔۔ بہت حسین!
یہ ٹھیک تھا پھولی کے گال سوکھ کر پچک گئے تھے۔ یہ بھی ٹھیک
تھا کہ چہرے کی ہڈیاں ڈراونی حد تک ابھر آئیں تھیں۔ اور یہ بھی ٹھیک
تھا کہ کالے لمبے بال بکھر کر سوکھے گھاس پھوس کا ڈھیر سا بن گئے تھے، جیسے
پھولی کی زندگی سے خزاں چھو گئی ہو، لیکن خزاں کا مخصوص سنہری بانکپن پھولی
کے سارے وجود میں موجود تھا۔ اف یہ ترآگنت ........ چبھن .... گود میں اٹھا
لے یا سینے سے لگائے تو کیا ہو ....... یا صرف پھولی کا آوارہ بدن اپنی
باہوں میں تھام لے۔ ہچکیوں سے پھولی کا انگ انگ آوارہ ہو رہا تھا۔
یکایک اس کا اپنا آوارہ ذہن رک گیا۔ بے وقوف کہیں کا.....
...... کچھ آنسو کی بوندیں ٹپکتے دیکھیں اور ماضی بھلا بیٹھا جس کی پرچھائیں
اب بھی اس کی زندگی پر تاریکی انڈیل رہی تھی، دوست کی دوستی، باپ
کا پیار، اور رشتے ناطے، سب پر بھیانک تاریکی امڈ آئی تھی۔ واقعی وہ
بے وقوف ہے۔ ورنہ آنسوؤں کے کچھ قطرے اس کے ارادوں کو نہ بہالے
جاتے۔ بڑھیا نے آنسو بہائے اور اپنے پرائے بچھڑ گئے۔ اب بیٹی آنسو

بہار رہی ہے تو نہ معلوم کیا ہو......!

"میں پانی کا ایک اور گلاس لادوں گا" اس نے آنسوؤں کو پانی کے قطروں میں تبدیل کرنا چاہا۔ لیکن پھولی مانتی بھی۔ وہ تو آج اسے آنسوؤں میں ڈبونے پر تل گئی تھی شاید۔

"مجھے پانی نہیں چاہیے۔ زہر چاہیے زہر..... مجھے زہر لادو تاکہ اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے" شدتِ جذبات سے مغلوب ہوکر پھولی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ پھولی کی گرفت بازو میں کھبی جا رہی تھی۔

"بازو چھوڑ دو...... بازو پکڑنے سے فائدہ" اس نے سمجھانا چاہا۔

"نہیں..... نہیں..... میں بازو نہیں چھوڑوں گی..... نہیں چھوڑوں گی!" پھولی پر شاید ہذیان طاری ہو گیا۔

"تم میرا کہا مان لو۔ بازو چھوڑ دو اور کھانا کھا لو۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اس نے پھولی کی بنیز گرفت ڈھیلی کرنی چاہی۔ اس گھر کی ریت ہی عجیب تھی۔ کوئی پاؤں پکڑتا ہے تو کوئی بازو...... چھٹکارا پائے کوئی تو کیسے پائے!

"نہیں..... نہیں۔ میں بازو نہیں چھوڑوں گی۔ ایسے تڑپا تڑپا کے مارنا تھا تو پہلے کیوں نہیں مرنے دیا تم لوگوں نے"

پھولی اس کے بازو پر لٹک گئی۔ اور وہ گھبرا گیا۔ کہیں پٹیاں ڈھیلی پڑ گئیں یا زخم کھل گئے تو بارش اور اندھیرے میں اسے نئے ہی ڈاکٹر کو ڈھونڈھے ڈھونڈھے پھرنا پڑےگا۔ کاش بڑھیا آجائے اور اس کی مصیبت ٹل جائے

ناممکن تھا کہ پھولی کی چیخیں نیچے رسوئی تک نہ پہنچ گئی ہوں۔ شاید بڑھیا کہیں باہر گئی ہے۔ اور اُسے زرخرید غلام سمجھ کر اپنی لاڈلی کو سمجھا نے کے لئے چھوڑ دیا...... ہوں...... نوکر...... جیسی لونڈی...... دغاباز...... ہاں نادہاں...... پھولی کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ اُس نے اپنی جدوجہد تیز کردی۔ ذرا اور کوشش کرے تو اس ڈائن کے چنگل سے نکل سکتا ہے۔

یکایک پھولی نے اپنا سارا جسم اُچھال کر اُس کی باہوں پر گرا دیا۔ پھولی کے ادھ موئے سوکھے جسم میں اتنی سکت...... ! پھولی کی چیخ نے اُسے سوچنے کی مُہلت نہ دی۔ چیخ درد سے لبریز گونجتی کراہتی اُٹھی اور اُس کے کٹھڑتے بدن میں پیوست ہوگئی۔ اُس کا بدن سسک اٹھا شاید پھولی کے زخم کھُل گئے۔ مزید جدوجہد خطرناک تھی۔ وہ سانس روکے بے حس و حرکت پڑا رہا۔

پھولی اُس کی گود میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ شاید بے ہوش ہوگئی تھی۔ یا شاید جان بوجھ کر بے ہوش بن گئی تھی۔ ان لوگوں کا کوئی بھروسہ نہ تھا۔ اُس نے دھیرے سے پھولی کو ہلایا۔ پھولی کے بدن میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ تو کھلا کر اس نے بڑھیا کو آوازیں دیں لیکن سارے گھر میں سناٹا طاری رہا۔ بارش کی سرسراہٹ بھی بند ہوگئی تھی۔ شاید بارش بھی مرگئی تھی۔

پھولی کا سارا بوجھ اُس کی باہوں پر تھا۔ اور باہوں میں کھٹکن اُبھر رہی تھی۔ شاید پھولی مرگئی تھی۔

اُس نے دھیرے سے ایک ہاتھ چھڑا کر پھولی کے گال پر رکھ دیا۔ گال

آنسوؤں سے بھیگنے کے باوجود دہک رہا تھا۔ شاید پھولی زندہ تھی۔ اُسے یقین نہ آیا
ہاتھ دھیرے دھیرے بڑھ گیا، اور پیرہن کی سلوٹوں کو مسلتا پھاندتا پھولی کے
سینے تک جا پہنچا۔ دل کی دھڑکن بدستور اُچھل کود کر رہی تھی۔ اُ سے تسکین سی ہوئی
پھولی مر نہیں گئی تھی۔ بلکہ تھکن سے نڈھال ہو گئی تھی۔ خود اُس کی اپنی باہنہ تھکن سے
نڈھال ہو رہی تھی۔ یوں بے حس و حرکت اکڑوں رہنے سے بدن بھی زیادہ ٹھنڈ
محسوس کر رہا تھا۔ پھولی کے جسم کی حدت پاس نہ ہوتی تو وہ تھر تھر کانپنے لگتا۔ پھولی
کے سینے کی بھی تمازت نے ہاتھ کو گرم کر دیا تھا۔ ویسے پھولی کے سینے کا ملائم
لمس بھی بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ جی نہیں کرتا تھا ہاتھ ہٹانے کو۔ غیر ارادی طور پر ہاتھ کے ساتھ
ساتھ اُس کا ذہن بھی پھولی کے ملائم جسم پر رینگنے لگا۔ نگاہیں پھولی کے خدوخال کو جیسے
پی رہی تھیں۔

پھولی کا گلا برف کی طرح شفاف تھا۔ گلے کے ایک طرف کوئی کالی سی رگ پھڑک
رہی تھی۔ شاید رگ نیلی تھی پر دیئے کی مدھم روشنی میں کالی لگ رہی تھی۔ اور پھولی کے اجلے
رنگ کو واضح کر رہی تھی۔ جی چاہا اُٹھا کہ اس رگ کو پھڑکنے سے روک دے۔ اس رگ کو تھپتھپائے
اُس نے اس رگ کو پھڑکتے دیکھ کر اُس کے اپنے جسم کی ہر رگ پھڑکنے لگی تھی۔ جی نہیں کرتا تھا پھولی
کو اپنے سے الگ کر دے۔ پھولی اُس کی باہوں میں ایسے گری پڑی تھی۔ جیسے کوئی ننھا بچہ
سویا پڑا ہو۔ دیئے کی روشنی نے پھولی کے سوکھے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت بکھیر
دی تھی۔ جبڑوں کی گہرائیوں میں اُبھری ہڈیوں کے نقوش، ہونٹوں پر جمی پپڑیاں اور آنکھوں کے گرد
نمودار سیاہ ڈراونے حلقے.... ماضی کے سب نشان مدغم ہو گئے تھے۔ رحمان کا ذہن معصومیت
کے جال میں اُلجھ سا گیا۔ ماضی ڈراونے سپنے میں تبدیل ہو گیا۔ جسے بھلا دینا بہتر محسوس ہوا
سامنے پڑا معصوم چہرہ کسی جرم کا ارتکاب نہ کر سکتا تھا۔ تاہم اس نازک جسم میں کسی گناہ
کی ترغیب چھپی ہے۔

کسی نامعلوم جذبے کے تحت رحمان کا سر جھکتا گیا اور ہونٹ کالی رگ کی طرف بڑھنے لگے۔ اِس میٹھے نازک سے لمس سے شاید اُس کے بدن کی تمازت سرد پڑ جائے۔ اب تو یہ آگ بھی نہ جاتی تھی۔ گناہ ... ترغیب ... معصومیت ... عبدالسلام کا چہرہ، بھولی کا چہرہ اور اُس کا چہرہ ..... فرق کیا تھا؟ دیئے کی مدھم روشنی میں سب خدوخال گڈمڈ ہونے لگے۔ اور وہ دونوں ..... صرف وہ دونوں ... دو خدا ..... دو خالق یا صرف دو انسان ... دنیاوی پردوں سے بے پرواہ، سماج کی بندشوں سے آزاد، ذہن کی حدوں سے بے نیاز تخلیق کی قوتوں میں سرشار ہونے لگے، دیئے کی مدھم پھیکتی روشنی میں ابدیت نے جنم لینا شروع کیا۔

کھٹکا ہوا اور سحر لوٹ گیا۔ اُس نے جھٹکے سے اپنا چہرہ دور ہٹا دیا۔ بڑھیا دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ بے طرح گھبرا گیا۔

"یہ ..... یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔" اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ کاش بڑھیا اُسے یوں گھور گھور کے نہ دیکھے۔

"مر جاتی تو اچھا تھا" بڑھیا نے اندر آتے ہوئے کہا "تم جا کے کھانا کھا لو۔ پروس رکھا ہے۔ میں اِس کو سنبھال لوں گی" بڑھیا نے حکم دیا اور اُس نے زرخرید غلام کی طرح حکم کی تعمیل کرنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔

رحمان کی پیٹھ سبز ہیولوں کے اندھیرے میں جذب ہوتے دیکھ کر بڑھیا نے اپنے تنے چہرے کو ڈھیلا ہونے دیا۔ سارے چہرے پر بے یقینی کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ یقین نہ آتا تھا کہ اُس کی بوڑھی اُمیدیں جوان ہو جائیں گی۔ شاید کٹھور زندگی کو آخر کار بڑھاپے پر رحم آ گیا ہو۔ بڑھاپا جانتا تھا کہ زندگی ماضی کو یاد کر کے دھندلکوں میں گم کر دیتی ہے۔ حقیقت کو مہمل احساسوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اور بڑھاپا یہ بھی جانتا تھا کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نئی اُمیدیں جنم لیتی ہیں۔ نئے ارمان سر اُبھارتے ہیں۔ اور حقیقت میں بھی ڈھل جاتے ہیں۔ زندگی جو ٹھہری۔ اور بڑھاپے

سے زندگی کوئی بات چھپی نہیں رہتی ......!

اس لئے شاید بڑھاپے تے پھولی اور رحمان کو یکجا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی پھولی کو دوائی پلانے کے بہانے رحمان کو آمادہ کرتا۔ کبھی پانی کا گلاس یا چائے کا کٹورا لے جانے کے لئے متعین کرتا یا صرف پھولی کی خبر گیری کے لئے رحمان کو گھنٹوں اکیلا چھوڑ دینا...... بڑھاپے کے جانے بوجھے داؤ تھے، داؤ نہ لگ گئے تو بڑھاپا جوانی کے برتنے پر جیسے کیسے اِن بدن میں سکت..... نہ ہاتھ پیروں میں طاقت۔

لیکن زندگی اتنی جلدی اُس پر رحم کھائے گی اُس کے بوڑھے ذہن کو یقین نہ آیا۔ یقین کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ پیدا ہونے سے بڑھاپے تک زندگی نے اُس پر کوئی رحم نہ کھایا تھا۔ حقیر جان کر نظر انداز کر دیا تھا۔ بلکہ ایک گنہگار کی طرح ہر لمحے سزاؤں کی بارش برسا رہی تھی۔ شاید بہت گنہگار تھی وہ۔ اُس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ رو پڑی اور بے سُدھ پھولی سے بے نیاز روتی رہی...... روتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ بھول گئی کہ یہ آنسو بے بسی کے ہیں یا مسرت کے ......

بس پھسلتی پھسلاتی چلی جا رہی تھی۔ گو بارش صبح سویرے سورج طلوع ہوتے ہی بند ہو گئی تھی لیکن بادلوں کی دبیز تہہ نے آسمان کی وسعتوں کو ڈھک رکھا تھا۔ دینا ناتھ بس کی کھڑکی میں سے آسمان کے مشرقی کنارے کو گھور رہا تھا۔ آسمان کے مشرقی کنارے پر بادل کی دبیز تہہ پھٹ رہی تھی اور ایک نیلا داغ کسی کی نیلی آنکھوں کی طرح واضح ہو رہا تھا۔ نیلے داغ کو دیکھ کر دینا ناتھ کا جی ڈانواڈول ہو رہا تھا کہ یہ داغ اور پھیل جائے۔ پھیلتے پھیلتے آسمان پر لپٹے سفید کفن کے پرخچے اڑا دے تا کہ سورج کو ایک بار پھر پیری لینے کا موقعہ ملے اور زمین پر دھوپ کی بوچھاڑ ہو۔ پانچ دن کی لگاتار بارش زمین کی ساری حرارت بہا لے گئی تھی اور حرارت کی جگہ یخ بستہ پانی کے جھیل چھوڑ گئی تھی۔ حدِ نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔

بے موقعہ بارش نہ ہوتی تو شاید دینا ناتھ مہینہ بھر لی ہوئی چھٹی پوری کاٹتا۔ لیکن بارش آ گئی اور دریا کی سطح کو خطرناک حد تک ابھار گئی۔ ٹھیکہ دار کے بلاوے آ گئے اور اُسے نیلی آنکھوں کو چھوڑ کر واپس سونواری لوٹ آنا پڑا تا کہ اگر کہیں دریا کی سطح کناروں سے بے قابو ہو جائے تو نمک خوار نوکر ٹھیکہ دار کے جان و مال کی حفاظت کر کے حقِ نمک ادا کر دے۔

بس کو جھٹکا لگا اور دینا ناتھ کے ذہن نے بھی جھٹکا کھا لیا۔ اس کا منہ کڑوا ہو گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ کسی طور ٹھیکہ دار کے چنگل سے رہائی پا لے۔ ماں باپ سے چھٹکارا پا لے۔ بیوی بچے سے چھٹکارا پا لے اور چھٹکارا پا کر کسی ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں ٹھیکہ دار جھڑک نہ سکے۔ ماں باپ پالنے پوسنے کی قیمت نہ مانگیں اور جہاں بیوی چڑیل کی طرح ارمانوں ......... ولولوں پر نہ چھائی رہے۔ جہاں کسی کی کوئی گرفت نہ ہو۔ جہاں کوئی خود غرض نہ ہو۔ اُس کی سوچ بے قابو ہونے لگی۔ آسمان پر نیلا داغ بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید بڑھتا ہی جائے گا۔ بڑھتے بڑھتے آسمان کی وسعتوں کو

بے نقاب کر دے گا یہ محسوس ہوتے ہی دینا ناتھ کے ذہن کی وسعتیں بھی بے نقاب ہونے لگیں۔ شاید ہر کوئی خود غرض ہے۔ رشتے ناطے خود غرض ہیں۔ بال بچے خود غرض ہیں۔ حتیٰ کہ اُس کا اپنا وجود خود غرض ہے۔ زندگی بذاتِ خود خود غرض ہے۔ ورنہ اُسے کیا پڑی تھی ایک نیلی آنکھوں والے اجنبی وجود سے اُنس بڑھانے کی۔ ایک اجنبی وجود...... گوشت پوست کا بے ہنگم لوتھڑا..... جس کو اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا..... نہ محسوس کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ کوئی اُس کے اپنے وجود کو واضح کر دے۔ اُس کی زندگی کو معنی پہنائے۔ اُس کی دنیا کے خدوخال کو ابھارے۔ عجیب دنیا کی عجیب ریت...... عجیب بات تو یہ تھی کہ سوماوتی کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں اور نوزائیدہ بچے کی آنکھیں آسمان پر بڑھتے نیلے داغ کی طرح گہری نیلی تھیں۔

بس ہاجن گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے آخری بار پھسل گئی۔ اور پھسلتے پھسلتے سڑک کے کنارے تک آگئی۔ کچھ اور پھسل جاتی تو قریب کے گڑھے میں یقیناً لڑھک جاتی جو بارش کے پانی سے لبالب بھر گیا تھا۔ بس گر گرا کر کوئی بیچ یا نادرہ اس جھیل نما گڑھے میں ڈوب کر رہ جاتا۔ لمحہ بھر کے لئے بس پر موت کی پرچھائیں اُمڈ آئیں۔ ساری سواریوں پر سکتہ سا طاری ہو گیا جس کو توڑنے کی ہمت با توفی کلینر کو بھی نہ ہوئی۔

کسی بچے کی ریں ریں نے خاموش سناٹے کو توڑ ڈالا۔ زندگی نے ایک بار پھر پھریری لی۔ سب سواریوں کے سر غیر ارادی طور پر روتے بچے کی اور مڑ گئے۔ شاید ماں نے گھبراہٹ کے مارے بچے کو زور سے بھینچ لیا تھا۔ بچہ تکلیف دہ گرفت سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ سواریوں کے ہاتھوں پیروں میں جان سی آگئی۔ سب اپنے دِلوں کی بھڑاس نکالنے لگے۔ ڈرائیور کی پھرتی کو سراہا گیا۔ حکومت کی نااہلیت کا تذکرہ ہوا۔ انجینئروں کی نکتہ چینی کی گئی اور آخر میں ٹھیکہ

داروں کو صلواتیں سنائی گئیں۔

"چاہ کن را چاہ درپیش۔ کردہ۔۔۔۔" دینا ناتھ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ کچھ دنوں سے اس کو بات بات پر مقولے استعمال کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ ٹھیکہ دار کچھ پڑھ لکھ گیا تھا۔ اس لئے اپنے مستری کو کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ٹھیکہ دار کی دھونس کا توڑ پیدا کرنے کے لئے دینا ناتھ نے مقولے استعمال کرنے کا گُر اختیار کیا تھا۔ ٹھیکہ دار کی سمجھ میں مقولے نہ آتے تھے اس لئے دھونس جمانے سے احتراز کیا کرتا تھا اور دینا ناتھ کی مصیبت ٹل جاتی تھی۔

لیکن ہزار کوشش کے باوجود دینا ناتھ پورا مقولہ نہ دُہرا سکا۔ بس کے جھٹکے نے ذہن مفلوج کر دیا تھا۔ مقولہ یاد آتا یا نہ آتا لیکن مقولے کی تفسیر تو یاد تھی۔ اس کچی سڑک کو پکا بنانے کا ٹھیکہ اس کے اپنے ٹھیکہ دار نے لیا تھا۔ اور ایک مالک پر اپنی قابلیت کا رعب جمانے کے لئے دینا ناتھ نے خود تجویز دی تھی کہ سڑک کی بھرائی کے لئے مٹی سڑک کے اطراف سے ہی کاٹی جائے تاکہ مٹی دور سے لانے کی مزدوری بچ جائے۔ ویسے سڑک پر روڑی بھی نام ہی کو بچھائی گئی تھی۔ جو بارش کے ساتھ ساتھ نرم نرم زمین میں دھنس گئی تھی اور روڑی کی جگہ کیچڑ ہی کیچڑ اُبھر آئی تھی۔ ٹھیک بھرائی نہ ہونے کی وجہ سے سڑک میں دراڑیں بھی نمودار ہو گئی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دینا ناتھ تلملا سا اٹھا۔ لوگ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے ٹھیکہ داروں کو گالیاں دے رہے تھے۔ ٹھیکہ دار کے آدمیوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ لیکن وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے کس کو گالیاں دے۔ ٹھیکہ دار کو یا اپنے آپ کو۔۔۔۔!

"اور بارش آ گئی تو ساری سڑک بہہ جائے گی۔۔۔۔۔۔" ڈرائیور نے موٹی سی گالی دے کر اپنے تبصرے کا اختتام مناسب سمجھا۔ "آج بس واپس آنی مشکل

ہے۔" کلینر نے ڈرائیور کے تبصرے پر یقین کی مہر ثبت کر دی اور دینا ناتھ کے بازو میں بیٹھا منہرا کسمسا کے رہ گیا۔ بس واپس نہ گئی شہر پہنچنا محال تھا۔ وہ اپنی ناؤ رزاق کے حوالے اس شرط پر کر آیا تھا کہ رات ہونے سے پہلے واپس لوٹ آئیگا رزاق کی لڑکی سے رحمان کی شادی کی بات چل رہی تھی اس لئے رزاق مان گیا تھا ورنہ کون کسی کی ناؤ کی خبر گیری کرتا ہے۔ اور ایسے دنوں میں جب تھوڑے تھوڑے وقفوں بعد ناؤ کو پانی کی چڑھتی سطح کے ساتھ متوازن رکھنا پڑتا ہے۔ رات کو واپس نہ پہنچ سکے گا تو رزاق اکیلا اپنی ناؤ کے ساتھ ساتھ اس کی ناؤ نہ سنبھال سکے گا۔ ناؤ کی خبر گیری آج کی رات نہ ہوئی تو ناؤ ڈوب جائے گی۔ دفعتاً وہ آپ ہی آپ جھنجلا اٹھا۔ بھلا کیا ضرورت تھی اس خطرناک موسم میں شہر چھوڑنے کی۔ رحمان اس کا کون تھا۔ رشتے ناطے پیار وحبت پر پلتے ہیں ورنہ کون کس کا باپ اور کون کس کا بیٹا۔ لوہے کی زنجیر سے تو نہ بندھے تھے وہ آپس میں جیسے ناؤ کنارے سے بندھی رہتی ہے۔ بوڑھا..... کھوسٹ۔ ناؤ بے سہارا چھوڑ کے آیا۔ رحمان امیدیں، ارمان چھین گیا تھا اب اس کی ناؤ..... آخری سہارا بھی چھینے جا رہا تھا۔ بڑھاپا جب آتا ہے تو شاید ہر داؤ الٹا پڑتا ہے اور ہر امید ٹھوکر بن جاتی ہے کہیں وہ واقعی بوڑھا تو نہیں ہو گیا ہے..... "ارے بوڑھے دیکھ کے چلو......" کسی نے اس کے بڑھاپے کو للکارا اور وہ بس کے دروازے کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ سڑک پر بہت سارے لوگ ایک طرف دوڑے جا رہے تھے۔ وہ ہراساں ہو گیا۔ سہارا لینے کے لئے دینا ناتھ کی طرف دیکھا۔ لیکن دینا ناتھ اس سے ذرا دور کسی آدمی کو آوازیں دے رہا تھا۔

"ارے محمود..... ارے او محمود کے بچے....."

محمود دوڑتے دوڑتے رک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اور دینا ناتھ کو پہچان کر

واپس آگیا۔ بنرا بھی دینا ناتھ کے پاس سرک گیا۔

"سلام ماسٹری صاحب......" محمود نے آہستہ سے سلام گذارا اور دینا ناتھ غرور سے بنرا کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا بات ہے۔ ہر کوئی بھاگے جا رہا ہے کہیں بارش نے تو آگ تو نہیں لگائی کہیں" دینا ناتھ نے حسب معمول اپنا مخصوص لہجہ استعمال کیا۔ ذرا سی ہنسی مذاق سے ان لوگوں کے سیدھے سادے ذہن اس کی گرفت میں آجاتے تھے۔ ورنہ یہ لوگ آگ تھے۔ ذرا سی چھیڑ پر بھڑک جاتے تھے۔ وہ تو بھلا ہو ٹھیکہ دار کا جس نے الیکشن لڑنے پر اس کو مامور کر دیا تھا۔ ٹھیکہ دار الیکشن جیت لے یا نہ جیت لے لیکن وہ ان گنواروں کے ذہن جیتنے میں طاق ہو گیا تھا۔

"ہی ہی ہی......" محمود کھلکھلا کر ہنس پڑا حتیٰ کہ بنرا بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا "صاحب کہیں بارش سے بھی آگ لگتی ہے......"

"ہی ہی ہی...... آگ نہیں لگی ہے صاحب بلکہ عید گاہ میں لیکچر ہو رہا ہے۔ سب لوگ وہیں جا رہے ہیں۔"

"کیسا لیکچر......" دینا ناتھ نے یونہی پوچھ لیا "کیا کوئی منسٹر آگیا ہے یا کوئی ماہر اپنی بکواس سنانے آیا ہے۔"

سونہ واری جب سے ڈیولپمنٹ بلاک بن گئی تھی روز کوئی نہ کوئی افسر یا منسٹر تقریر جھاڑنے کے لئے آجاتا تھا۔ اور جس دن افسر یا منسٹر نہ آجائے اس دن کوئی ماہر مرغبانی کا لیکچر جھاڑنے کے موجود رہتا تھا۔ اور کوئی بطخ پالنے کے گر بتانے آتا تھا۔ مرغیوں اور بطخوں کے فارم کھولے گئے تھے۔ لیکن مرغیوں اور بطخوں سے زیادہ ان پر نوکر تعینات تھے۔ ماہر لوگوں سے ایسے برتاؤ کرتے تھے۔ جیسے سونہ واری کی زمین پر نہ کبھی کوئی مرغی یا بطخ دیکھی گئی ہے اور نہ پالی گئی ہے۔ گاؤں کے لوگ

لیکچر سن سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ سیاسی کارکن کو زبردستی لیکچر سننے کے لئے اکٹھا کرتے تھے۔ لیکن دفتر کی ترقی کی رفتار انہی لیکچروں کی مرہونِ منت تھی۔ ہر لیکچر پر کئی کئی فائیلوں نے جنم لیا تھا۔ فائیلوں کو دیکھ کر سوراج کی ترقی کی رفتار بڑھتی محسوس ہوتی تھی۔

"سیلاب کے متعلق لیکچر ہو رہا ہے صاحب۔ لوگ ڈر رہے ہیں کہ اس سال بھی سیلاب نہ آجائے۔ اسی لئے گاؤں چھوڑ کے جانا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ تو چلے بھی گئے صاحب۔ ٹھیکیدار نے بھی لیکچر کرنا ہے۔ کمر ٹوٹ گئی صبح سے فرش فرش کرتے ہوئے اور کرسیاں ڈھوتے ہوئے۔۔۔۔" مھدّو نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور دینا ناتھ کو اپنی کمر جھکتی محسوس ہوئی۔ ٹھیکہ دار کا نام سن کر اس کی کمر کیا بلکہ اس کا سارا وجود جھک سا جاتا تھا۔

"ٹھیکہ دار کہاں ہے۔۔۔"

"ابھی گھر پہ ہے صاحب۔ افسروں کے ساتھ چائے پی رہا ہے۔ آتا ہو گا۔ آپ چلیئے۔"

ٹھیکہ دار کا نام سن کر دینا ناتھ کا جی چاہا انکار کر دے۔ سب کے سامنے ٹھیکے دار کے روبرو جانا مشکل تھا۔ ٹھیکہ دار اپنی ا:رت کا رعب جمانے کے لیئے نوکروں کو خواہ مخواہ دوسروں کے سامنے ڈانٹ دینے اور بے عزت کرنے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ لیکن انکار کے الفاظ منہ سے نہ نکل سکے۔ ٹھیکہ دار کے سامنے جانا اُسے آج منظور تھا لیکن رحمان کے سامنے جانا اُسے بالکل منظور نہ تھا۔ کھلیان میں دوستی کی آخری ڈور بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اب ایک دوسرے کا سامنا کرنا مشکل تھا۔ نمبرا کو ٹالنے کا بہانہ مل گیا۔ وہ نمبر چاچا میں تمہارے ساتھ رحمان کے پاس نہیں آسکتا۔ ٹھیکہ دار مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ تمہیں اکیلے

جانا پڑے گا۔"

دینا ناتھ کی بات سن کر نبرا کا دل بیٹھ گیا۔ اکیلے رحمان کے پاس جانا اُس کے بس کی بات نہ تھی ورنہ جس دن زیورات کی گمشدگی ظاہر ہوگئی تھی وہ اُسی دن رحمان کے پاس چلا آتا۔ لڑکا جوان تھا۔ ہاتھ پیر کا مضبوط تھا۔ بد لحاظ تھا۔ لڑ پڑے تو وہ اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ آج دینا ناتھ رحمان کی کرتوتوں کا پتہ نہ دیتا تو وہ کبھی آنے کی حامی نہ بھرتا۔ رحمان کے ساتھ ساتھ وہ بھی کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ اِس لیے وہ دینا ناتھ کے بھروسے چلا آیا تھا۔ سوچا تھا دینا ناتھ کا ساتھ ہوگا تو شاید رحمان کو سنبھالنا مشکل نہ ہوگا۔ شاید دینا ناتھ کے کہنے سننے پر رحمان واپس شہر جانا منظور کرے۔ ایک دوسرے کے دوست جو ٹھہرے۔

"تم کچھ دیر کے لیے نہیں آسکتے ....." نبرا نے بے بس ہو کر کہا۔

"ٹھیکے دار مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا چاچا۔ شہر بلاوا بھیجا تھا ورنہ کون ادھوری چھٹی کاٹ کر آتا۔ اور کیا معلوم کوئی کنسٹرکٹ بھی آگیا ہو۔ میرا جانا بہت ضروری ہے ....." دینا ناتھ نے لفظ کنسٹرکٹ پر زور دے کر نبرا کو مرعوب کرنا چاہا۔

"میں اکیلا رحمان سے نپٹ نہ سکوں گا۔ تم تو جانتے ہو کہ وہ خود سر ہے۔ کیا معلوم لڑ پڑے" نبرا چاچا نے کہا اور دینا ناتھ تذبذب میں پڑ گیا۔ رحمان سے چھٹکارا کھلیان میں پالیا تھا۔ اب اس بوڑھے سے چھٹکارا کیوں کر مل جائے۔ غلطی کی جو ساتھ لے آیا۔ بس میں بٹھا کر روانہ کر دیتا اور خود دوسری بس سے آجاتا تو یہ دردِ سر مول نہ لینا پڑتا۔ نامعلوم وہ ناحق کیوں دوسروں کی مصیبت اپنے سر لے لیتا ہے۔ رحمان کو لے آیا تو مصیبت بن گیا اب رحمان کے باپ کو لے آیا تو یہ بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔

"اچھا چاچا۔ تم چلو میں بھی ٹھیکہ دار کو منہ دکھا کر آتا ہوں ... بس تمہارے پیچھے پیچھے" دینا ناتھ نے جھوٹ بولا۔ "ضرور آنا ...." نبرا نے اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر کہا، "تمہارے آنے تک۔ میں کوئی بات نہ چھیڑوں گا" "ہاں چاچا ... میں ابھی آؤں گا" دینا ناتھ نے سر زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔ اب شاید وہ عمر بھر نبرا کا سامنا نہ کر سکے گا۔ بچپن کی زنجیریں ایک ایک کر کے ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ بھلا کیوں نہ ٹوٹتیں۔ اب وہ بچہ نہ تھا۔ بلکہ ایک بچے کا باپ تھا۔

نبرا کی ٹانگیں چلنے کو تو چل رہی تھیں لیکن ہر قدم پر لڑکھڑا رہی تھیں۔ سڑک کیچڑ سے دب سی گئی تھی۔ قدم دھرتے ہی سارا توازن بگڑ جاتا تھا۔ اُس کے ٹخنوں میں بلا کی تھکن ہو رہی تھی۔ ٹخنوں کے بجائے جیسے دو پھوڑے ہوں۔ کئی بار اُس نے چاہا کہ دو گھڑی کے لیے سڑک سے ملحق منڈیر پر بیٹھ جائے۔ منڈیر پر ہریالی کی رگیں ابھر آئی تھیں اور کسی قالین کے نقوش کی طرح خوب صورت لگ رہی تھیں۔ اس ہرے قالین پر بیٹھ کر حدِ نظر تک پھیلے شیشے کے تختوں کو دیکھنے میں بڑا مزہ آتا۔ بارش کا پانی کھیتوں میں جمع ہو کر شیشے کے تختوں کی طرح ساکن تھا اور بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ سورج کی کرنیں بادل کے دریچوں میں سے پھسل کر ان تختوں پر رقصاں تھیں اور جب کبھی کوئی ہوا کا جھونکا پانی کی سطح کو لرزاں کرتا تو کرنیں مچل مچل جاتیں اور ساری کائنات کی پرچھائیاں رقصاں نظر آتیں۔ لیکن اُس کے قدم نہ رک پائے۔ بیتے لمحات کا احساس اُسے قدم بڑھانے پر مجبور کرتا۔ بادل کے دریچے رات کی آمد کے ڈر سے بند ہونے کی سعی کر رہے تھے۔ شاید رات آنے سے پہلے بارش شروع ہو جائے۔ بارش آ گئی تو یہیں پھنس جانے کا

خطرہ تھا۔

اُس کا پیر کیچڑ میں دھنس گیا۔ اُس نے زور لگایا۔ پیر کیچڑ میں لت پت نکل آیا لیکن جوتا پھنسا رہا۔ اُس نے جھک کر ہاتھ سے جوتے کا پیر کھینچ لیا۔ جوتے کے اندر کیچڑ ہی کیچڑ بھرا تھا۔ اُس کے منہ سے موٹی موٹی گالیاں اُبل پڑیں، جن کی تیزی نے مچلتی کرنوں کو بھی بادلوں کا پردہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ کون کہتا تھا یہ زمین سوندواری تھی۔ سونے کا گھڑا ہے۔ یہ زمین تو کیچڑ کا گھڑا ہے کہ جو کوئی آتا ہے پھنستا ہی جاتا ہے۔

بنرا گرتا پڑتا جوتے کا پیر سنبھالتا ہوا بنڈھ پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف دریا کا پانی بنڈ کی اونچائی تک آگیا تھا۔ تیز رفتار پانی میں ہلکی سی سرسراہٹ بھی نہ ہو رہی تھی۔ نہ کوئی لہر اُبھر رہی تھی اور نہ ہی کوئی بھنور۔ صرف پانی کی سطح ہلکے سے تھرتھرا رہی تھی جیسے ہچکیاں لے رہی ہو۔ یقین نہ آرہا تھا کہ اِس بے جان دریا میں مصیبتوں کا سیلاب چھپا بیٹھا ہوگا۔ اِس مٹیالے پانی میں بربادی کا رنگ گھلا ہوگا۔ اور اِس دریا کی خاموشی میں زندگی کی ہر چیخ پکار پنہاں ہوگی۔ پانی کے بجائے خون اور آنسو بہہ رہے ہوں گے۔ دریا تو ایسے بہہ رہا تھا جیسے کوئی بے ضرر لاش بہی جا رہی ہو...... مُردہ مُردہ، پر جب کبھی کوئی جھاگ سا تو وہ بہتا ہوا گذرتا تو بنرا کی نگاہیں غیرارادی طور پر اس تودے میں اپنی کشتی کے ٹوٹے خدوخال ٹٹولنے کی کوشش کرتیں۔

آنگن میں پہنچ کر اُس کی آنکھیں چاروں اور طواف کرنے لگیں۔ کچھ دن پہلے آنگن میں اُجڑی کیاریوں کا نشان دیکھا تھا وہ اب منہدم ہوگیا تھا۔ نہ کیاریوں کا نشان باقی تھا اور نہ کیاریوں کی منڈیریں

باقی تھیں۔ کیاریوں کی جگہ سارے آنگن میں جابجا کیچڑ کے ڈھیر ابھر آئے تھے۔ مکان پر کھڑیا مٹی کا لیپ موجود نہ ہوتا تو مکان اور کیچڑ کے ڈھیر میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ بے ڈھنگا مختصر سا مکان جس کی چھت بوسیدہ ہو چکی تھی۔ مکان کی تیسری منزل کچھ کڑیوں کے سہارے یوں کھڑی تھی جیسے گرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ ٹیڑھی دیواروں میں بے ہنگم دریچے اور کھڑکیاں ناسور سے لگتے تھے۔

بڑا بارش کی اکی دکی بوندوں سے بے نیاز خستہ مکان کو اپنی بوڑھی نگاہوں سے ٹٹولتا رہا۔ اس معمولی سے مکان میں اس کی دنیا برباد ہو رہی تھی۔ ڈر لگ رہا تھا کہیں یہ مکان رحمان کی طرح اسکو بھی نہ نگل جائے۔ ہمت نہ پڑ رہی تھی قدم آگے بڑھانے کی۔ مکان کا کھلا دروازہ کسی اژدہے کے خوفناک دہانے کی طرح اس کا منتظر تھا شاید....!

دفعتاً اژدہے کے دہانے میں خونی زبان پھنکارنے لگی۔ وہ گھبرا گیا۔ تاریک دروازے میں سے کوئی عورت لال پھرن پہنے ابھر آئی۔ بڑھیا کو پہچاننے میں اسے دیر لگی۔ آج بڑھیا کا پھرن زیادہ میلا نہ تھا۔ نہ ہی آج بڑھیا کے بال بے ترتیب تھے۔ چہرے پر بھی کچھ لالی ابھر آئی تھی یا شاید لال پھرن کی پرچھائیں تھی۔

"کون ہو تم......؟" بڑھیا کی آواز کیچڑ بھرے آنگن کو پھلانگ نہ آئی بلکہ نقرئی گھنگروں کی آواز کانوں سے ٹکرا گئی۔ اس کا بدن جھنجھنا اٹھا۔

"میں رحمان کا باپ ہوں......" گھمبیر لہجہ اختیار کر کے اس نے بدن کی جھنجھناہٹ کو جھٹلانا چاہا۔

"اندر آؤ جی ...... اندر آؤ ......" بڑھیا شرماسی گئی یا شاید اُسے وہم
ہوگیا۔ بہر حال بڑھیا نے سر پر پریشان دوپٹے کو سنبھالا اور پیٹھ پھیر کر
مکان کے اندر چلی گئی اب کی بار منبر کا ذہن بھی جھنجھنا گیا اور قدم بڑھیا کے
پیچھے پیچھے بے قابو ہو گئے۔

کمرے کی فضا بہت گرم تھی۔ اُسکے ٹھٹھرتے بدن نے انگڑائی سی
لی۔ آج فرش نئی چٹائیوں سے ڈھکا ہوا تھا اور کمرے کے کونے میں ایک
رنگین دری بچھی ہوئی تھی۔ دری کے کنارے ایک نیا بستر لپٹا پڑا تھا۔
شاید رحمان کا تھا ورنہ ان بھیک منگوں کے پاس تھا کیا؟ یاد آتے ہی اُس کا
غصہ تیز ہوا۔ اُس نے کھڑے کھڑے ہی ترش لہجے میں پوچھا "رحمان کہاں ہے؟"
"آج کوئی لیکچر ہو رہا ہے گاؤں میں۔ سننے چلا گیا آتا ہی ہوگا۔ تم بیٹھو نا"
بڑھیا کی ادا غضب کی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ چوکنا ہو گیا شاید
بڑھیا چونچلے دکھا کر اُسے رام کرنا چاہتی تھی۔ مال زادی جی میں آیا
رحمان کی آمد تک کھڑا رہے۔ بڑھیا کے انداز خطرناک تھے۔ لیکن سردی
نے ہاتھ پیر سن کر دئے تھے اور ٹانگوں میں کپکپاہٹ تھی۔ اُس نے چپ
چاپ جوتے نکال لئے اور لپٹے بستر کے ساتھ پیٹھ لگا کے بیٹھ گیا۔
نئے سماوار اور چینی کے پیالے دیکھ کر اُسے یاد آیا کہ پہلی بار جب
وہ اس مکان میں ٹھہرا تھا تو چائے مٹی کی ہانڈی میں بنائی گئی تھی اور
مٹی کی پیالیوں میں پی گئی تھی۔ طاق میں چاندی کی طرح چم چم کرتا لالٹین
بھی نہ تھا بلکہ کالک میں لتھڑا ہوا دیا تھا۔ اندازہ لگانے کی ضرورت باقی
نہ رہی۔ کہ اتنی جلدی اس گھر میں خوشحالی کیونکر وارد ہو گئی ہے۔
اپنے خون اور پسینے کی کمائی کو کسی دوسرے گھر کی زینت

بنتا دیکھ کر اُسکے وجود میں تلخی سی اُمڈ آئی ۔ یا شاید قہوہ کچھ زیادہ تلخ تھا ویسے قہوے میں رچی مٹھاس اُسکے انگ انگ میں رچ رہی تھی ۔ اُس کے ہر انگ سے تھکن نچوڑ رہی تھی ۔ جیسے کہ اُسکے ذہن کو بھی اِس مکان کے ماحول سے کچھ کچھ ہم آہنگ کر رہی تھی ۔

بُڑھیا چولہے کے سامنے بیٹھی تھی ۔ چولہے میں بھڑکتی آگ کی لپٹوں نے بُڑھیا کے چہرے کو آگ سی لگا دی تھی اور بُڑھیا کا چہرہ لال پرن کو بھی ماند کر رہا تھا ۔ چولہا زور و شور سے جل رہا تھا اور چولہے پر رکھی ہانڈی زور و شور سے اُبل رہی تھی ۔ منور انے سوچا کہ کچھ دیر میں اُس کے سامنے کھانا پروس کر آجائیگا ۔ بُڑھیا اُس کے سامنے بیٹھ کر ایسے کھانا کھلائیگی جیسے پہلے ...... بہت پہلے رحمان کی ماں سامنے بیٹھ کر کھانا کھلایا کرتی تھی ۔ اور وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر اِس گھریلو ماحول میں مدغم ہو جائیگا ۔ جیسے اِس چار دیواری کے باہر بارش اور طوفان نے تباہی نہ مچائی ہو ۔ نہ تو مکان کی چھت اُڑا اُڑا جا رہی تھی اور نہ ہی مکان کو ڈوبنے کا خطرہ تھا ۔ بلکہ مکان کے اندر زندگی اپنی مدہم چال پر بدستور گامزن تھی ۔ جیسے کہ یہ مکان طوفان کی لہروں پر ڈول بھی نہ رہا تھا ۔ نہ مکان اُس کی کشتی کی طرح ٹوٹ جائیگا ۔ اور نہ کوئی بے گھر ہو گا ۔ نہ ہی کسی کا آخری سہارا بہہ جائے گا ۔

شاید اُسکی کشتی شہر میں بہہ گئی ہو گی ۔ اور وہ تھا کہ گھٹنوں میں کانگڑی دبائے بستر سے پیٹھ لگائے ایسے پاؤں پسارے بیٹھا تھا جیسے اِس مکان کی ہر اینٹ کا سہارا میسّر ہو اور اِس مکان کی ہر کڑی نے اُس کے بوڑھے بدن کو سنبھال رکھا ہو ۔

کاش اُسکے پاس بھی چھوٹا سا مکان ہوتا ۔ مکان کے سامنے ننھا سا

آنگن ہوتا تو اُس کو کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں رہتی ۔ اپنے بیٹے کے
سہارے کی کبھی ضرورت نہ رہتی ۔۔۔ زمین پر بنے گھروندوں
کو طوفان کا ڈر نہیں ..... کاش .......

راہداری میں جوتے جھاڑنے کی آواز منیرا نے نظر انداز کردی پھر جونہی کسی کا سایہ کمرے میں داخل ہو گیا تو وہ ہڑبڑا کر بیٹھ گیا۔ تب اُسے یاد آیا کہ اُسکے پاس کوئی چھوٹا سا مکان نہیں ۔ کوئی ننھا سا آنگن نہیں۔ بلکہ صرف ایک پُرانی سی کشتی ہے جو وہ شہر میں اللہ کے بھروسے اِس طوفان میں اکیلا چھوڑ آیا ہے ۔ اِس لئے اُسکو جلدی سے فیصلہ کر کے واپس جانا چاہئے ۔ اللہ کو اور بھی بہت سارے کام تھے اُسکی کشتی کی رکھوالی کرنے کے سِوا ۔ لمحہ بھر کے لئے اُسے محسُوس ہوا کہ دینا ناتھ اُس کی مدد کے لئے آپہنچا ہوگا ۔ لیکن دوسرے لمحے اُسکی نگاہیں رحمان کے سراپا میں اُلجھ گئیں ۔

رحمان کا تنومند جسم اُسکی نگاہوں کے سامنے ایسے کوند گیا جیسے وہ خود بڑھاپے کا چولا اُتار کر پھر سے جوان ہو گیا ہو ۔ وہی قد ...... وہی چال ڈھال ..... ویسے ہی چوڑے چکلے شانے اور اُس جیسے ہی گھنگھریالے بال ۔ حتےٰ کہ بال کی لٹ رحمان کے ماتھے پر اُس انداز سے بکھری پڑی تھی جیسے کبھی .... بہت پہلے اُس کے اپنے ماتھے پر بکھری

پڑی رہتی تھی۔ اگر رحمان کے سراپا اور اپنی یادداشت کے پیکر میں کچھ فرق تھا تو وہ ململ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ منیرا کے بدن میں رحمان کی قربت نے سنسناہٹ رواں کردی۔ رحمان کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا تھا۔ جو اُسکے اپنے بدن میں دوڑا کرتا تھا۔

وہ کیا کہدے بیٹے سے...... رسمی گفتگو چھیڑ دے یا ڈانٹ پلا دے۔ یا صرف خاموش رہ کر بیٹے کا ردِعمل دیکھ لے۔ آج شاید پکی زمین پر بنا یہ گھروندا ابھی طوفان میں پھنسی بے بس کشتی کی طرح بہہ جائے گا.......!

یکایک باپ کو سامنے پاکر رحمان بھی گھبرا گیا لیکن اُس نے گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دی۔ اُس نے خاموشی سے جوتے اتار دیئے اور باپ سے ذرا دور بیٹھ گیا۔ ہمت نہ پڑ رہی تھی باپ سے آنکھیں ملانے کی۔ منیرا کی آنکھیں بیباکی سے رحمان کے جسم پر اٹک گئی تھیں۔ سفید لٹھے کی قمیض میں رحمان بڑا اوچھا لگ رہا تھا۔ قمیض کے اوپر کالے رنگ کی واسکٹ تھی۔ واسکٹ کا رنگ لٹھے کی قمیض کے سفید رنگ پر پھب رہا تھا۔ شاید رحمان کے جوتے بھی نئے تھے۔ بیٹا باپ کے ارمان بڑی بے دردی سے لٹا رہا تھا۔

... ہوں...... اُس نے آنکھوں پہ زور دیا۔ کمرے کی مدھم روشنی میں جوتوں کا نیاپن دِکھائی نہ دیا لیکن رحمان کی سفید لٹھے کی شلوار جتا رہی تھی کہ نئی بنائی گئی ہے اور کافی قیمت کی بھی ہے۔ وہ اپنا دِل مسُوس کے رہ گیا۔

رحمان خاموشی سے چائے پینے لگا تو منیرا سے نہ رہا گیا۔ رحمان شاید سمجھ رہا تھا۔ کہ باپ گِھگھیانے آیا ہوگا...... اُس نے گلے کو کھنکھارا اور تحکمانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "چائے جلدی سے پی لو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

باپ کی آواز نے بھی رحمان کو سر اٹھانے پر مجبور نہ کیا۔

کیسی دیر ہو رہی ہے "

"واپس شہر چلنا ہے .... منیرا نے وضاحت کی اور رسوئی میں بیٹھی چھوٹی کی ماں کا جسم تن سا گیا ۔

"کیوں .... بوا" بکے رحمان نے سر اٹھا کر باپ سے بے خوف آنکھیں ملائیں اور نبرا کو یقین ہو گیا کہ رحمان کی رگوں میں بھی گرم خون دوڑ رہا ہے ۔

"مجھ سے پوچھتے ہو بیٹے ....." نبرا کے لہجے میں اتنا تیز طنز تھا کہ رسوئی میں بیٹھی بڑھیا بھی سر موڑنے پر مجبور ہو گئی ۔

رحمان نے جواب دینے سے پہلے بڑھیا کی طرف دیکھا ۔ باپ کی طرف دیکھا ۔ اور ارادہ بدل دیا ۔ دن کے اجالے میں گاؤں بھر کو اکھٹا کرنے میں کوئی فائدہ نہ تھا ۔ باپ بیٹے میں فیصلہ رات کے اندھیرے میں بھی ہو سکتا تھا ۔ اس نے بات ٹال دی ۔

"تم کھانا کھا کر آرام کر لو ...... صبح سوچا جائے گا ....."

بیٹے کو دبتا دیکھ کر نبرا کا دل بڑھ گیا ۔ رحمان شاید اتنا برا نہ تھا جتنا لوگ کہتے تھے ۔

"نہیں بھئی ..... رات کو پانی چڑھ آیا تو راستے کٹ جائینگے ۔ پھر تو جانا مشکل ہو گا "

"تم فکر نہ کرو ۔ سڑک کٹ نہیں جائیگی چاہے پانی کتنا ہی اور چڑھ آئے " رحمان نے بوڑھے کو دلاسا دینا چاہا لیکن نبرا بے خبر ہو اُٹھا ۔ سو نہ داری میں سیلاب آتے یا نہ آتے لیکن شہر میں اُسکی کیشتی خطرے میں گھری ہوئی تھی ۔ عقل کا تقاضہ تھا کہ رات ہونے سے پہلے شہر پہنچ جاتے ۔ اس لئے اُس نے بیٹے کو ٹوکا ۔ "بھلا سیلاب کیونکر نہیں آئے گا ۔"

جب پانی برابر چڑھتا جا رہا ہے۔

"میں ابھی ابھی پیکچر سُن کے آ رہا ہوں۔ وہاں سبھی کہہ رہے تھے کہ پانی چڑھ بھی آئے تب بھی سیلاب نہیں آ سکتا۔"

رحمان کے سمجھانے پہ منیرا چڑ گیا۔ اُسکی اپنی ساری ہی عمر سیلابوں کے بیچ گذر گئی تھی اور یہ کل کا چھوکرا اُسکو سیلاب کے راز سمجھا رہا تھا یا شاید ٹل دے رہا تھا۔

"ہوں..... "منیرا کا لہجہ تیز ہو گیا" میں بھی تو سنوں لیکچر میں کیا سُن آئے"

موقعہ نازک تھا ورنہ رحمان باپ کے تیز لہجے کا توڑ دو چار گالیوں سے پورا کرتا۔ اُسے مجبوراً انکساری دِکھانی پڑی،

"آج حاجنی میں لیکچر تھا۔ سب بڑے افسر آئے تھے۔ انجینئر بھی آئے تھے۔ اُنھوں نے کہا۔ اِس سال ڈلر اور دریا کے اِرد گرد بندھ بنائے گئے ہیں۔ اس لئے پانی رکا رہے گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں اور نہ ہی گاؤں چھوڑنے میں کوئی فائدہ ہے۔ اب تم ہی بتاؤ انجینروں کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی.... بولو...."

"اور جو میں نے شہر سے آتے ہوئے سڑک میں دراڑیں پڑتی دیکھیں؟ اور جو اِس گاؤں کی سڑک پہ بندھے بندھ میں سے پانی رِس رِس کے آ رہا ہے؟ بیسوں جگہ سے پانی نکل رہا ہے..... بھلا سیلاب کے سامنے یہ کچے بندھ کہیں رُک سکتے ہیں کیا۔ اپنے انجینئروں سے کہنا تھا کہ اپنے بندھوں کی حالت تو دیکھ لیں صرف لیکچر کرنے سے........"

منیرا کی باتیں سُن کر بُڑھیا سے مزید نہ رُکا گیا۔ بوڑھا کیا آگیا تھا جیسے سیلاب کا تھپیڑا آگیا تھا جو اِس گھر کی چولیں اُکھاڑ نے پر تُلا محسوس ہو رہا تھا گیہ گیا یہ گھر تو وہ خود اسکے تلے دب جائیگی۔ رحمان کے چلے جانے میں اِس سارے گھر کی تباہی تھی۔ بربادی تھی۔ بوڑھے گھر کو برسوں بعد جوان سہارا ملا تھا۔ وہ چُپ رہی تو شاید رحمان باپ کی باتوں سے مرعوب ہو کر شہر جانے پر آمادہ ہو جائے اِس لئے اُس نے رحمان کی مدد کرنی مناسب سمجھی۔

"ٹھیک تو کہہ رہا ہے رحمان بیٹا سیلاب آنے کا خدشہ ہوتا تو گاؤں کا گاؤں اب تک خالی ہو گیا ہوتا۔ ہم خود بھی مکان چھوڑ کے چلے جاتے" بُڑھیا نے آخری جملہ کہہ کر بوڑھے کے ذہن پر یقین کی مُہر ثبت کرنی چاہی لیکن منیرا کا ذہن پہلے جملے پر ہی اٹکا رہا۔ ٹھیک کہہ رہا تھا دبنا نا تھر "بیٹا" "بیٹا" کہہ کر ہی بُڑھیا رحمان کو بس میں کئے بیٹھی تھی اور رحمان دودھ پیتے بچے کی طرح بُڑھیا کی مکاری میں اُلجھ کے رہ گیا تھا۔ وہ برہم ہو گیا۔

"میں تم کو خوب سمجھتا ہوں۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ تم بیچ میں نہ بولو" منیرا کا لہجہ اتنا گھناؤنا تھا کہ رحمان بھی کانپ کے رہ گیا۔

"کیا سمجھتے ہو تم ....." بُڑھیا کے مُنہ سے بمشکل نکل گیا۔

"تم چھنال ہو..... دلالہ ہو.... کسبن ہو...." رحمان نے باپ کو روکنا چاہا۔ یہ الفاظ نہ تھے کوڑے تھے جو اسکے سارے وجود کو مجروح کر گئے۔

"کیا بکتے ہو...." اُس نے باپ کو شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"میرا شانہ چھوڑ دو۔ اپنے گندے ہاتھ دور رکھو" منیرا بیٹے پر برس پڑا "اور یہ بیٹی سے پیشہ کراتی ہے۔ اور گھر چلاتی ہے؟"

"بابا..... " رحمان دھاڑا۔ سوچا تھا رات کے اندھیرے میں پیپ اور گند بہتی رہیگی تو محسوس نہ ہوگی پر بوڑھا دن کے اُجالے میں ہی ناسور کھرچنے پر تُل گیا تھا۔

"میں سب جانتا ہوں۔ اِسکی بیٹی نے حرامی بچہ جنا ہے اور تم اُس کے باپ ہو۔ تبھی تم یہ گھر چھوڑنے کی جرأت نہیں کر سکتے"

منیرا کے انکشاف نے رحمان کے رونگٹے کھڑے کر دئے۔ دنیا ناتھ اُس کو گناہگار سمجھ لے یا گاؤں والے تو ان کا کوئی قصور نہ تھا حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ پر اپنا باپ اُسکو گناہگار سمجھ لے۔ اپنا خون اُسکو گناہگار سمجھ لے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ کیسے بوڑھے کو سمجھا سکتا ہے۔ کیونکر کہے باپ سے کہہ..... کہہ۔ ۔ اُف.. بڑھیا مہلت تو دے۔

منیرا کی باتوں نے بڑھیا کے وجود کو ہلا کے رکھ دیا۔ وہ جھٹکے سے اٹھی۔ چولہے کی لپٹیں ٹھنڈی پڑ گئی تھیں صرف انگاروں کی دہک باقی تھی جنکی روشنی میں بڑھیا کے لال بھبوکے نے آگ سی پکڑلی تھی "نکل جاؤ میرے گھر سے.. ..... دونوں کے دونوں نکل جاؤ..... اسی وقت نکل جاؤ"

بڑھیا کی آواز بھیانک تھی۔ چہرے پر بھیانک سُرخی لوٹ کر آتی تھی۔ آنکھوں میں پتلیوں کے بجائے انگارے دہک رہے تھے۔ اور سارا بدن آگ کی سُرخ دہکتی اینٹ کی طرح ہرا رہا تھا۔ تھرتھراتے

لال پیرہن کا جھول خونی آبشار کی طرح زندہ تھا۔ منیرا ٹھٹھک گیا۔ بڑھیا ایسے کھڑی تھی جیسے ماضی کے دبیز پردوں کو پھاڑ کر رحمان کی ماں ایک بار پھر وجود میں آکر اُسکے سامنے کھڑی ہو۔ اور کِشتی کے کُھردرے کِواڑوں پر بنے چولہے کے سامنے اُسکو ڈانٹ پلا رہی ہو۔ لمحہ بھر کے لئے اُس کا ذہن وقت کی حدود کو پھلانگ کر ماضی کی بھول بھلیوں میں گُم ہونے لگا۔ اور اُس کے ہاتھ غیر ارادی طور پر ننھے بلکتے رحمان کو سنبھالنے کے لئے بڑھے۔ لیکن اُس کے ہاتھ رحمان تک نہ پہنچ پائے۔ رحمان بُڑھیا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بڑھیا کی طاقت جواب دے گئی تھی۔ اور اُس کا سر رسوئی اور کمرے کے درمیان منڈیر پر ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ ہر سِسکی کے ساتھ آنسو کے قطرے گرتے جا رہے تھے۔ منیرا کا دِل بڑھیا کی بے بسی دیکھ کر پسیج سا گیا۔ گڑے مُردے اُکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ جو ہونا تھا۔ سو ہو گیا تھا۔ بیٹا باپ کے ساتھ جانے پر رضامند ہو تو باپ کو اور کیا چاہیئے۔ وہ زیوروں کپڑوں کی واپسی کا مطالبہ کبھی نہیں کریگا۔ اُس نے بیٹے کو ٹوکا۔ "رحمان"... دیر ہو رہی ہے اور گاڑی کا وقت نکلا جا رہا ہے"

رحمان کمرے کے وسط میں اتنی تیزی سے پلٹ پڑا کہ منیرا کا سر چکرا سا گیا۔ "میں نہیں جاؤں گا.........."

"کیوں......" اُسکے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"میری مرضی۔ تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔ میں نہیں جاؤنگا۔" رحمان کا لہجہ درشت تھا۔

ابکے منیرا کو جھٹکا سا لگا۔ رحمان کا اِنکار شاید اُسکی ہتک تھی۔

ایک بیٹا باپ کو دھتکار دے اور وہ بھی اس چھنال بڑھیا کے سامنے!
... لعنت ہے ایسی اولاد پر۔ سوچا تھا رحمان ساتھ چلے گا تو وہ ہر
قصور معاف کر دیگا۔ نئے گہنے کپڑے بنوانے کی کوشش کریگا۔ گھر میں
پھولے آنے لگا۔

مرنے سے پہلے اپنے بیج کو پھلتا پھولتا دیکھ پاتا تو شاید موت کی
گھڑوں وادیوں میں تسکین سی رہتی۔ کہ اسکی زندگی رائیگاں نہ گئی۔ بھلا
ایک باپ اپنے بیٹے کے لئے اس سے زیادہ اور کیا چاہ سکتا ہے۔ لیکن بیٹا
ہو بھی اس قابل۔ اس ناہنجار نے تو زندگی ویران کرنی ہے سو کر رہا
ہے۔ جائے جہنم میں۔ ... اسکی بلا سے۔ اسے چاہیے مزید وقت ضائع نہ
کرے۔ گاڑی کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس لئے اپنے زیوروں اور
کپڑوں کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ جب بیٹا اس کا نہ رہا تو زیوروں کپڑوں
پر بیٹے کا کوئی حق نہیں۔ کوئی حق نہیں۔ اس نے مانگ کی۔
اگر تمہاری مرضی یہی ہے تو سڑتے رہو یہیں۔ لیکن زیور اور
کپڑے تو واپس کر دو۔''

''میرے پاس نہیں ہیں زیور کپڑے ...... '' رحمان کے جواب
نے منبرا کو پاگل سا کر دیا۔

''واہ ایک تو چوری کرتے شرم نہیں آتی۔ اوپر سے دھونس جما رہے
ہو'' منبرا نے تنکے کو سہارا بنانے کی کوشش کی۔ زیور کپڑوں کے
مطالبے کے سامنے شاید بڑھیا کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑیں۔ اور بیٹا اس
کے ساتھ جانے پر رضامند ہو۔ حقیقت تو یہ تھی کہ منبرا کو بیٹے کے جوان
سہارے کے بغیر اپنا بوڑھا وجود ویران سا محسوس ہو رہا تھا۔

دہ چوری ..... روبرٹ بڑھیا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور رحمان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جھوٹ بولنے کی اچھی سزا مل رہی تھی۔ ڈھینگ مار رہی تھی بڑھیا کے سامنے کہ وہ باپ کی مرضی سے زیور کپڑے اٹھا لایا۔ اکلوتا بیٹا تھا نا.... بڑا لاڈلا ... اور آج بوڑھا بڑھیا کے سامنے اسکو ننگا کر بیٹھا۔ بڑھیا سے آنکھ ملانی مشکل ہو رہی تھی۔

"جیسے تو نہیں جانتی ...!" نبرا بڑھیا پر بپھر اٹھا "تو نے ہی تو میرے بیٹے کو آوارہ بنا دیا"۔

"میں کہتا ہوں چپ رہو ....." رحمان چیخ پڑا۔ جی چاہ رہا تھا باپ کا گلا گھونٹ دے۔

"میں کیوں چپ رہوں۔ ایک تو چوری اور سینہ زوری ....." نبرا جوش میں آ کر بیٹے کے سامنے تن گیا۔ تنکا شاید مضبوط حربہ ثابت ہو!

"کاش تم میرے باپ نہ ہوتے ... تو میں ... تو میں تم کو مزا چکھا دیتا" رحمان کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے اور نبرا کے تن و بدن نے آگ پکڑ لی "کون بدقسمت کہتا ہے کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ میں تم جیسے بیٹے کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرونگا۔"

رحمان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے باپ کو شانے سے پکڑ کر للکارا اور تھوک کے تو دیکھو ..... بوڑھے کھوسٹ"

اور نبرا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ..... اپنی پوری طاقت سے رحمان کے منہ پر تھوک دیا۔

— کچھولی کی جاگ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ شاید بھونچال آ رہا تھا یا شاید سیلاب آ گیا تھا —

کانپتے ہاتھوں سے اُس نے آنکھوں کو مسلا - سارا مکان ہل رہا تھا -
وہ بستر میں سے بے تحاشہ اٹھی اور گرتی پڑتی سیڑھیاں اُترنے لگی -
مکان گر رہا تھا شاید اور ماں کہیں ملبے کے نیچے دب گئی تھی - ماں کی
چیخیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی -

گرتی پڑتی وہ راہداری میں پہنچ گئی مگر رسوئی گھر کے اندر نہ جا سکی
رسوئی گھر کے اندھیرے میں گویا دو سانڈھ آپس میں ٹکرا رہے تھے
اور بڑھیا چیخ چیخ کر اُن کو الگ کر رہی تھی - اُسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا -
آنکھوں کے سامنے اندھیرا اُمڈ آیا - دروازے کی چوکھٹ دور بھاگتی
محسوس ہوئی - بے سہارا وہ راہداری میں ڈھیر ہو گئی -

جب اُس کو ہوش آیا تو ماں اُسکے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار
رہی تھی - ماں سے ذرا پرے رحمان اور رحمان کا باپ کھڑا تھا -
وہ اُنکی حالت دیکھ کر ڈر گئی - دونوں کے چہرے لہولہان تھے -
کپڑے تار تار ہو گئے تھے - رحمان کے باپ کی ایک آنکھ بالکل بند
ہو گئی تھی - آنکھ کے بجائے چہرے پر ہلکے کالے رنگ کا داغ پھیلا تھا -
وہ قمیص کے دامن سے ہونٹ پونچھ رہا تھا - شاید رحمان کا سر بھی
پھٹ گیا تھا - بالوں میں سے خون کے قطرے رِس رِس کر گال پر بہے
جا رہے تھے - اور گال پر سے ہوتے ہوئے شانے میں جذب ہو رہے
تھے - سفید لٹھے کی قمیص پر لال لال داغ واضح تھے - کمرے میں قبرستان
کی سی خاموشی طاری تھی جس میں رحمان اور اُس کے باپ کی تیز تیز سانسیں
پھنکار مارتی محسوس ہو رہی تھی -

"کیا دیکھتی ہو تم دونوں - میری بیٹی کو مار ڈالا - ہاتھ ٹوٹا میرا

اسے اوپر کمرے میں لے چلیں" شاید ماں رو رہی تھی۔

رحمان نے باپ کی طرف دیکھ لیا۔ باپ پیٹھ پھیر کر کمرے کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ رحمان آگے بڑھا۔ اور اُسکو اپنی مضبوط باہوں میں اٹھا لیا شرم کے مارے اُس نے آنکھیں موند لیں۔

اُسکی جاگ کھل گئی۔ ابکے رحمان اُسکو گود میں اٹھا کر نیچے لے آرہا تھا پیچھے پیچھے ماں اُس کا لپٹا لپٹایا بستر لے کر چل رہی تھی۔ اور آگے آگے رحمان کا باپ جلتی لالٹین لئے سیڑھیاں روشن کر رہا تھا۔ آج رات ہی کچھ ایسی تھی جب اُس کا سارا وجود رحمان کی باہوں میں ڈول رہا تھا۔

وہ رسوئی میں پہنچ گئے۔ رحمان کا باپ لالٹین لئے کھڑا رہا۔ ماں نے بستر بچھایا اور رحمان نے اُس کو بستر پہ آہستہ سے لٹا دیا۔ کمرے کی گہری خاموشی میں ابکے باہر سے آتی ہوئی کچھ بے ربط چیخ و پکار ہلکا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ دفعتاً رحمان کا باپ کراہ اٹھا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ آج رات کو سیلاب آئے گا پہ تم لوگ مانتے کبھی .... ہائے شہر میں میری کشتی بہہ گئی ہو گی۔ اب کیا ہو گا۔ .. اب کیا ہو گا؟"

"شور مچانے سے کوئی فائدہ نہیں" رحمان نے باپ کا منہ بند کر دیا "تم لوگ تیار رہو۔ میں اپنی ناؤ لے کر آتا ہوں۔ پانی مکان تک پہنچنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیئے"

"جلدی جاؤ نا...... ناؤ بہہ گئی تو پھر نکل نہ پائینگے" شبرا نے کہا اور بڑھیا کا دل جل گیا۔ بوڑھا کیسی بے دردی سے بیٹے کو موت کے

منہ میں دھکیل رہا تھا اُسکی مامتا نے برداشت نہ کیا وہ رحمان کو روکنے لگی۔

"ابھی نہ جاؤ بیٹا۔ روشنی ہو جاتے تب جانا۔ کہیں پیر پھسل گیا اندھیرے میں تو ......"

"ماں .. ہانجی کا بیٹا ہوں۔ ہانجی کا.... میرا پیر نہیں پھسلتا۔ جو رُک بھی گیا تو صبح تک کشتی بہہ جاتے گی" رحمان نے بڑھیا کی ڈھارس بندھائی اور ننگے پیر کمرے میں سے نکل کر رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

بارش بند ہو چلی تھی لیکن ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے سرگرداں تھے شاید بادل بھی ہٹ جائیں۔ اس سال موسم پر بھروسہ نہ تھا۔ رحمان نے سوچا اور نگاہیں چاروں طرف اوڑھکیں۔ نگاہیں ہر سو بے سہارا پلٹ پڑیں۔ ہر سو اندھیرا تھا۔ گاؤں کے دور سے بے ربط چیخ و پکار نہ سنائی دیتی تو اس بھیانک رات کے اندھیرے اور موت کے اندھیرے میں کوئی فرق نہ محسوس ہوتا۔ اس اندھیرے میں موت یقیناً منڈلا رہی تھی۔ اور اپنے سرد پنجے پھیلائے اُسکا انتظار کر رہی تھی شاید وہ چلتے چلتے ٹھٹھک گیا۔ پیر پانی کی سطح سے چھو گیا اور چھو کر ڈوبتا ہی چلا گیا۔ پانی بہت اوپر چڑھ آیا تھا۔ بڑھیا کا مکان گاؤں سے ذرا دور اونچے ٹیلے پر واقع نہ ہوتا تو کب کا ڈوب چکا ہوتا۔ اور اُنکی چیخیں بھی گاؤں کے وسط سے آتی ہوئی بے ربط آوازوں میں اضافہ کرتیں۔ گاؤں شاید پورا ڈوب گیا تھا۔ ورنہ آوازیں لحظہ بہ لحظہ مدہم نہ ہونے لگتیں۔

پانی کی سطح جب اُسکے گھٹنوں تک آگئی تو اُسے سردی کا احساس ہونے لگا۔ سطح گھٹنوں سے اوپر رانوں پر بڑھ آئی تو اُس کا دل

ڈگمگانے لگا۔ پانی بڑھنے کی یہی رفتار رہی تو ناؤ تک پہنچنا محال تھا۔ اس کا جی چاہا کہ واپس لوٹ پڑے آگے بڑھنے میں جان کا خطرہ تھا۔ لیکن قدم آگے بڑھتے رہے۔ باپ ویسے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ اسے ناؤ کے بغیر واپس لوٹتے دیکھ کر زندہ نہیں چھوڑنے کا۔ باپ بوڑھا بھی پر اتنا سخت تھا کہ جھڑپ کے دوران اس کا جوان جسم بھی کچھ دیر کے لئے بوڑھاپے کے سامنے لڑکھڑا گیا تھا۔

وہ لڑکھڑا گیا۔ اور پانی نے چشم زدن میں اسے اپنی گود میں جکڑ لیا۔ سیلاب راستے کی ساری کیچڑ بہا لے گیا تھا۔ اور کیچڑ کے بجائے چکنی سطح کا تختہ سا چھوڑ گیا تھا۔ کئی غوطے کھانے کے بعد وہ ہانپتا کانپتا بدن کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ باغیچوں کی دیواریں آس پاس کھڑی نہ ہوتیں تو کب کا ڈوب گیا ہوتا۔ بدن پر ان گنت جگہیں پانی کے ٹھنڈے لمس سے تلملا اٹھیں اور تب اسے محسوس ہوا کہ بوڑھے نے اس کا جسم بری طرح سے نوچ رکھا ہے بھیگے کپڑوں کا لمس بھی کچھ اچھا نہ محسوس ہوا۔ وہ جھنجھلا اٹھا۔ احتیاط برتنے کا کوئی فائدہ نہ تھا سارے کپڑے شرابور ہو گئے تھے۔

ناؤ کو دیکھ کر اسکے کھٹر نے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ کہاں تو اس نے کشتی کو سیلاب کے ڈر سے خشکی پر کھینچ رکھا تھا اور کہاں اب کشتی پانی پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ شکر تھا اللہ کا کہ اس نے کشتی کو خشکی پر کھینچ لانے کے باوجود پاس کے درخت کے تنے سے باندھ رکھا تھا۔ ورنہ بہہ گئی ہوتی۔ ایک رات میں دو ناؤ کھو جانے کا صدمہ برداشت سے باہر ہو جاتا۔ پانی کئی فٹ اوپر چڑھ آیا تھا۔ درخت کا تنا پانی میں

اِتنا ڈوب گیا تھا کہ کشتی اور تنے کے بیچ بندھی ڈور آخری حد تک تن گئی تھی۔ اور کشتی درخت کی ٹہنیوں میں ایسے گھس آئی تھی جیسے پانی کے ڈر سے ٹہنیوں کو پکڑے بیٹھی ہو۔ بے چاری کشتی۔۔ وہ کچھ دیر بعد پہنچ جاتا تو کشتی اُبھرتے پانی کا ساتھ نہ دے سکتی اور یقیناً ڈوب جاتی۔

وہ بازوؤں کے بل کشتی میں اُچک گیا۔ درخت کی ٹہنیاں اُسکے چہرے سے ٹکرا گئیں اور کئی جگہ چُبھ بھی گئیں۔ پانی سے باہر آتے ہی بدن ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں سے کانپنے لگا۔ کپڑے اتار کر نچوڑنے کی فرصت نہ تھی۔ ڈر تھا کہ کشتی کی ڈور الگ کرنے سے پہلے ہی ہاتھ پیر اکڑ نہ جائیں۔ اُس نے اندھیرے میں ٹٹولا۔ چپو فرش کے پھٹوں کے نیچے چھُپا پڑا تھا۔ اُسے تسکین سی ملی۔ اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ ناؤ صحیح حالت میں تھی۔ چپو ہاتھ میں تھا اور اُسکے کپکپاتے بدن میں ابھی سکت باقی تھی۔ کانپتی انگلیاں کشتی کی نوک سے بندھی ڈور میں اُلجھ گئیں۔ ڈور الگ ہوکر پانی میں ڈوب گئی۔ اور کشتی آزاد ہوکر لہروں پر ڈولنے لگی۔

کشتی آزاد کیا ہوئی جیسے دُنیا بھر کی مصیبتیں آزاد ہوکر اُس پر نازل ہوگئیں۔ جس راستے سے وہ کشتی تک آگیا تھا اُس راستے کشتی لے جانا ناممکن تھا۔ باغیچوں کی دیواروں کے بیچ اتنی لمبی کشتی گزارنی کٹھن تھا۔ اور باقی سب راستے پانی میں اوجھل تھے شاید پو پھٹ رہی تھی۔ ہر سُو اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ لیے بادل ہٹ رہے تھے۔ اور ستارے ٹمٹما اٹھے تھے جنکی پرچھائیں پھیل کر پانی کو بھی خلاؤں کی وسعت دے رہی تھیں۔ کھلی ہوا کے

ڈ کے پیڑوں کا جنگی مدد سے اُسے کچھ کچھ راہ سُجھائی دے رہی تھی
ورنہ گمان ہوتا تھا کہ جیسے کشتی پانی کی سطح پر نہیں بلکہ آسمان کی
بے پناہ وسعتوں میں بہہ رہی ہے اور اپنے پیچھے کہکشاں کی لکیریں
چھوڑتی جا رہی ہے۔

فضا ساکت تھی۔ پانی ساکن تھا۔ حتےٰ کہ شور و غل کی آوازیں
بھی دم توڑ چکی تھیں۔ یہ پانی کا سیلاب نہ تھا خاموشی کا سیلاب
تھا جس میں زندگی کی ہر ایک رمق دم توڑ چکی تھی۔ چپو کی چپ چپ
نہ ہوتی تو شاید اُسکے دِل کی دھڑکن بھی بے سہارا ہو کر اِس
خاموش سیلاب کی عمیق گہرائیوں میں دم توڑ چکی ہوتی۔ کاش...
وہ اِس خاموش موت کی وادی سے نکل کر گھر پہنچ جاتے۔ جہاں
باپ کی جھڑکی، بڑھیا کا پیار اور گھولی کی دھتکار...... زندگی
کے کتنے لوازمات موجود تھے۔ کاش..... کشتی درختوں کی اِن بھول
بھلیوں سے نِکل جاتی۔ کاش.... اُس کا چپو بہتے گھاس پھوس
کے ڈھیروں میں الجھ نہ جاتے...... کاش......

اُس کو ٹھوکر سی لگی یا شاید کشتی نے ٹھوکر کھائی۔ اُس نے
بے خواب آنکھوں پر زور دیا۔ کشتی کی نوک کسی کالے ڈھیر میں
گھُس گئی تھی۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھا۔ اُسے تعجب ہوا کشتی کی
نوک کسی کنارے کے بجائے کسی مکان کی چھت میں اٹک گئی تھی۔
اس کے سارے بدن میں جھرجھری آئی۔ یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ
پانی میں ڈوبا مکان جو کچھ دیر پہلے زندگی کو اپنے آنچل میں چھپائے
بیٹھا تھا۔ اِسکے اندھیرے کمروں میں جوانیاں میلا کرتی تھیں۔

اِس کے آنگن میں بچپن کھیلا کرتا تھا اور بوڑھاپا دہلیز کا سہارا لئے لئے پھرتا تھا۔۔۔۔۔!

اُس نے غور سے مکان کو دیکھا۔ چھت پر بکھرے برتن واضح ہو گئے۔ شاید گھر کے مکین اِن کو سیلاب کی تیزی میں نہ بچا سکے مکان گر جائیگا اور یہ سب۔۔۔ انسان کی محنت و مشقت۔۔۔ خون پسینہ سیلاب کی تہہ میں غرق ہو جائے گا۔ غیر ارادی طور پہ اُسکے ہاتھ برتنوں کپڑوں کو سمیٹنے کے لئے بڑھے۔ کپڑوں کے نیچے اُس کو ایک لکڑی کا چھوٹا سا صندوق ملا۔ صندوق میں تالا پڑا تھا۔ اُس نے صندوق اٹھا کر ہلایا۔ کھنکھناہٹ کی ہلکی آواز خاموش فضا کو چیر کر اُسکے ذہن میں اُودھم مچانے لگی۔ کشتی ڈانواڈول ہو گئی۔ چشم زدن میں وہ سیلاب کو بُھلا بیٹھا۔ صندوق کو سینے سے چمٹا کر اُس نے کشتی چھت سے الگ کر دی اور گھر کی طرف ہو لیا۔ پَو پھٹ رہی تھی۔

گھر کی چار دیواری میں جب اُس نے کندھے پر سے صندوق اور کپڑے فرش پر رکھ دئے۔ تب نبرا اور بڑھیا کو یقین آ گیا۔ کہ اُسکے کندھے پر کوئی لاش نہیں۔ بڑھیا برتنوں کپڑوں کو پرکھنے لگی اور نبرا صندوق کا تالا توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

برتن تانبے کے بنے تھے اور کپڑے بھی زیادہ اچھے نہ تھے پانی میں لت پت چیتھڑوں کی طرح لگ رہے تھے۔ لیکن جب نبرا نے تالا توڑ کر صندوق کا ڈھکن اٹھایا تو رحمان کبھی اپنی سانس ہی تھکن بھول کر صندوق کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گیا۔

صندوق میں بھر کیلے نئے سلے سلائے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے چاندی کے گول گول روپئے تھے۔ نبرا کے کانپتے ہاتھ چھم چھم کرتے روپئوں کو چھونے لگے۔ ٹٹولنے لگے۔ شاید سو روپئے تھے یا شاید پانچ سو روپئے تھے یا شاید ہزار روپئے تھے۔ رحمان کی گنتی جواب دے گئی۔

"کہاں۔۔ کہاں.... کہاں سے ملے یہ صندوقا...." نبرا کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"پانی میں بہہ رہا تھا میں نے پکڑ لیا۔۔" رحمان نے دور اندیشی سے کام لے کر جھوٹ بول دیا۔

"کتنے روپئے ہیں...." بڑھیا کے لہجے میں ڈھیروں حرص تھا۔ نبرا چونک پڑا۔ اُس نے جھٹکے سے صندوق کا ڈھکن بند کر دیا جیسے بڑھیا کی حریص نگاہوں سے روپئوں کو اوجھل رکھنا چاہتا ہو۔ اور ترش لہجے میں جواب دیا۔

"گِن لینگے بعد میں.... پہلے یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔" اور بڑھیا کو مایوسی ہوئی۔ بیٹے نے روپئے پائے۔ باپ نے رکھ لئے۔ وہ بھلا کون تھی اُنکی جو اُسکی کبھی کوئی پرواہ کرتا۔

"ابھی میں ایک پھیرا اور لگاؤں۔ تب جائینگے" رحمان نے کہا۔

"کیوں...." بڑھیا نے یونہی پوچھ لیا۔ اُس کا ذہن ابھی بھڑکیلے کپڑوں میں اُلجھا ہوا تھا جو شاید کسی نے لڑکی کے بیاہ کے لئے بنوا رکھے تھے اور چھولی کا بھی بیاہ کرنا تھا۔

"ماں۔۔ یہی تو وقت ہے کمانے کا۔ شاید کچھ اور مال ملے...."

" رحمان کے جواب نے شبراکو بولنے پر اُکسایا۔
" ہاں رحمان... ٹھیک ہے ایک پھیرا اور لگا آؤ "
پر بڑھیا سے نہ رہا گیا۔ اور مال آئے یا نہ آئے اُسکی بلا سے۔
اتنے سارے روپئے پاکر بھی بوڑھے کا پیٹ نہ بھر پایا۔
لالچی..... کُتا..

— پانی اور چڑھ آیا تو نکلنا مشکل تھا —
" بیٹا کہیں پانی مکان تک آگیا تو...... "

" پانی اب اور نہیں چڑھے گا قاں۔ تم ڈرو نہیں۔ تم ذرا
کھانا پروس دو۔ بڑی بھوک لگی ہے " رحمان کے پیٹ میں
واقعی بھوک اودھم مچا رہی تھی۔ رات کو جھگڑے کے
باعث گھر بھر نے کچھ نہ کھایا تھا۔ اور کھانا پکا پکایا باسی
ہوگیا تھا۔

ایک بار اور جب اُس کی ناؤ گاؤں کے بیچ پہنچ گئی۔
تو سورج کی کرنیں اپنے نقرئی بازوؤں سے سیلاب کو ٹٹول
رہی تھیں۔ سیلاب کی سطح پر گھاس پھوس اور لکڑی کے
ٹکڑے سرگرداں تھے۔ کہیں کوئی کپڑا بھی بہتا ہوا نظر
میں آجاتا اور رحمان کی ناؤ کپڑے کا رُخ کرتی۔ لیکن بے فائدہ
اس نے کئی کپڑے پرکھ لئے اور سیلاب کے حوالے کر دئے
صندوقوں میں بھرا کیلے نئے کپڑوں کے سامنے ان چیتھڑوں کی
اہمیت کوئی زیادہ نہ محسوس ہوئی۔ اگر کسی چیز کی اہمیت
اُسکے ذہن میں تھی تو وہ مکانوں کی چھتیں تھیں جہاں سینا میں

کسی اور نے اپنے ارمان اکٹھے رکھ چھوڑے ہوں۔ لیکن
گاؤں بھر میں کسی چھت کا نشان باقی نہ رہا تھا۔ جیسے یہاں
پہلے گاؤں نہ تھا۔ زندگی کا گہوارہ نہ تھا۔ بلکہ ازل سے
یہ مردہ جھیل ٹھہری تھی جیسکی کوئی تہہ ہی نہیں۔

جھیل کی سطح کہیں کہیں درختوں نے چھپا رکھی تھی۔
اکثر درخت اکھڑے اکھڑے سے لگ رہے تھے جیسے اب
گرے .... اب گرے۔

جی چاہا گھر کی جانب چل دے۔ لالچ کہیں اسے بھی نہ لے
ڈوبے۔ وقت گذرتا جا رہا تھا اور پانی بڑھتا جا رہا تھا۔
اردگرد ماحول میں عجیب سی بے دردی گھلی ہوئی محسوس
ہوئی۔ اسکو دہشت ہونے لگی۔ لیکن ایک کالے کپڑے کی
گٹھڑی نے اس کا دھیان بٹا دیا۔ جو درختوں کے جھنڈ میں
پھنسی لہروں کے زیر و بم پہ ہلکے ہلکے ڈول رہی تھی۔ کیا
معلوم اس گٹھڑی میں بھی کوئی صندوق پڑا ہو۔
اس کے بازوؤں میں دہشت سما گئی۔ ناؤ تیزی سے آگے
بڑھ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پاس آتی ہوئی گٹھڑی کو
پکڑنا چاہا۔ کراہت کی شدید لہر اس کے بدن کو ڈبو گئی۔
کوئی مردہ گائے تھی۔ بھلا کیا فائدہ تھا یوں سرگرداں
رہنے سے .... پریشان ہونے سے۔ پانی اپنا کام کر گیا تھا
واپس جانا ہی عقلمندی کی نشانی تھی۔

اس کو ناؤ موڑنے کی مہلت نہ ملی۔ درختوں کے

جھنڈ کے پرے کسی ناؤ کی نوک ابھر رہی تھی یا شاید اُس کی اپنی ناؤ کی پرچھائیاں ابھر رہی تھیں۔ یقین نہ آتا تھا کہ اس پیلی موت میں کہیں۔ زندگی بھی بہہ رہی ہوگی۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو مسلا.... واقعی ایک بڑی ناؤ اُسکی طرف آرہی تھی۔ گھبراہٹ کے مارے اُس کا دِل بلیوں اُچھلنے لگا۔ ناؤ پاس پہنچ گئی تو اُس نے ناؤ میں بیٹھے کئی افسر پہچان لئے۔

" ناؤ والے.... ادھر آؤ.... کیا نام ہے تمہارا" ایک افسر نے با رُعب لہجے میں پوچھا۔

" رحمان.... رحمان شاللہ..." اُسکی گھبراہٹ دور نہ ہوئی۔ جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

" لکھو جی.... نام رحمان شاللہ.... سیلاب ڈیوٹی" افسر نے ناؤ میں پڑی سیب کی پیٹی میں سے ایک لال سیب چُنتے ہوئے کہا۔

" دو اودرسیر۔ اِس ناؤ پہ لیپ شیڈ نمبر چار پہ جاؤ"،

دو آدمی اٹھ کھڑے ہوئے اور احتیاط سے اُسکی ناؤ میں آگئے

تب رحمان کو یقین ہوا کہ افسروں نے اُسے مُردہ گائے کو ٹھوکر لیتے نہیں دیکھا ہے۔ ویسے شاید بڑی ناؤ میں پڑی سیب کی پیٹیاں کبھی ایسی سیلاب کے بدولت حاصل ہوتی ہوں۔ اُسکی ہمت بندھ گئی۔

" حضور میرا اپنا مکان ہے۔ سامان ہے.... لوگ ہیں.... میں.... میں۔

" کہاں ہے تمہارا مکان...." افسر نے ایسے پوچھ لیا جیسے یقین نہ آرہا ہو کہ سیلاب نے کسی مکان کو کھڑا رہنے دیا ہوگا۔

" وہ جناب.... وہ ٹیلے پر.... وہ جناب ذرا درختوں کی آڑ میں۔

"رحمان نے ہاتھ سے اشارہ تو کیا لیکن مکان دکھائی نہ دیا۔ درختوں کی گھنی ٹہنیوں نے اُن کی نگاہوں کو روک لیا — اور افسر نے کہا —

"ٹیلے پر مکان ہے تو محفوظ رہیگا۔ سرکاری سامان کی حفاظت زیادہ ضروری ہے —"

افسر کے الفاظ نے رحمان کے تن و بدن میں آگ سی لگا دی۔ جیسے اُسکے گھر والے گوشت پوست کے نہیں کیچڑ گارے کے بنے تھے جو بہہ گئے تو نئے بنائے جا سکتے ہیں۔ عجیب منطق تھی اِن افسروں کی۔ رات کو بیکچروں میں لوگوں کو دھوکے میں رکھا کہ سیلاب نہیں آئے گا۔ کیونکہ بندھ بنائے گئے ہیں۔ اب جب سیلاب نے سب بندھ توڑ پھاند کر بھاگنے کے سارے راستے محدود کر دئے تو حکم ہو رہا ہے۔ کہ سرکاری سامان کی حفاظت زیادہ ضروری ہے۔ تاکہ جو لوگ سیلاب کے پہلے ریلے میں بچ رہے ہیں وہ بھی بہہ جائیں۔ ویسے وہ کوئی سرکاری نوکر نہ تھا۔ سرکار نے اسے کوئی عہدہ... کوئی نوکری یا کوئی ٹھیکہ نہ دیا تھا۔ کوئی آسائش مہیا نہ کی تھی کہ وہ سرکار کا نمک خوار، خیر خواہ بن کر اپنی جان ڈورے میں ڈال دے۔ آرام سے جینے بھی نہیں دینگے یہ لوگ۔ جی چاہا چلا چلا کر اِس بے جا زیادتی پر احتجاج کرے لیکن بڑی ناؤ آگے بڑھ گئی تھی اور ناؤ کی جگہ گھومتے پانی کے ہلکورے اُسکی بزدلی کا ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے۔ جھنجلا کر اُس نے پانی کی سطح پر زور سے چپو مارا۔ پانی چوٹ نہ سہہ کر پلٹ پڑا۔ ساری ناؤ پر مٹیالے پانی کی

بوچھاڑ ہوئی ۔

" ارے ... ارے آہستہ ..." ایک اوورسیر نے گھبرا کر کہا ۔

" ناؤ چلانی نہیں آتی کیا ۔ کھانے کی لٹکری کا ستیاناس کر دیا " ۔

دوسرا اوورسیر غصے سے چلا پڑا اور اس کا اپنا غصہ کنارے توڑ بیٹھا ۔ جی میں آیا ایک بار اور چپو کو پانی کی سطح پر مارے .... اتنے زور سے مارے کہ پانی کی بوچھاڑ اِن دونوں اوورسیروں کو ناؤ میں سے بہا لے جائے ۔ لیکن اس نے چپو کو پانی کی سطح پر نہ مارا ۔ ناؤ میں دو اوورسیر تھے اور دونوں ہٹے کٹے تھے ۔

طوعاً و کرہاً اس نے ناؤ کا رخ دریا کی طرف موڑ دیا ۔ پمپ شیڈ نمبر چار دریا کے دوسرے کنارے پر واقع تھا ۔ ::

چار بج گئے تھے یا شاید پانچ بج گئے تھے۔ سبزا انجانی جگہ سورج کی ترچھی کرنوں کو دیکھ کر ٹھیک اندازہ لگانے سے قاصر رہا۔ کسی درخت یا مکان کا سایہ نظر آتا تو شاید وہ سائے کی لمبائی سے کچھ کچھ اندازہ لگا پاتا۔ لیکن آج سایوں کا نام ونشان نہ تھا—
آس پاس ہر چیز پانی میں ڈوب گئی تھی۔ اگر کہیں کسی ایک ڈھ کے درخت کا سایہ ابھی موجود تھا بھی تو مٹیالے پانی کی سطح پر بالکل نہ دکھائی دیتا تھا۔ ہر طرف مٹیالا پانی پھیلا ہوا تھا۔ کھیت ڈوب گئے تھے۔ مکان ڈوب گئے تھے۔ حتیٰ کہ ٹیلے پر بنے اس مکان کا سایہ بھی چڑھتے پانی میں مدغم ہو گیا تھا۔ صرف دور... بہت دور رہا جن پل کی پکی منڈیر کالی لکیر سی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ لکیر بھی پانی میں مدغم ہو گئی تو شاید اسکی نگاہوں کو سہارا دینے کے لئے کچھ بھی باقی نہ رہ جائے گا۔ پل کی منڈیر تک جانے والی گاؤں کی سڑک کب کی پانی کی گہرائیوں میں چھپ گئی تھی۔

غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں مکان سے کچھ دور چڑھتے پانی

کے کنارے پر مرکوز ہوگئیں۔ پانی کا کنارہ سورج کی ترچھی کرنوں
میں کسی تیز دھار چاقو کے پھل کی طرح چمک رہا تھا اور دھیرے
دھیرے زمین کا سینہ چاک کرتا جا رہا تھا۔ ذرا دیر کی اور بات تھی
پانی کا کنارہ بڑھتے بڑھتے مکان پر یورش کریگا۔ رس رس کر مکان
کی بنیادوں کی سختی چوس لے گا۔ بنیاد کھوکھلی ہوکر مکان کا بوجھ
نہ سہہ سکے گی۔ مکان گر جائے گا اور وہ بھی گر جائیگا۔ اس کے بازوؤں
میں چھپا ہوا لکڑی کا چھوٹا سا صندوق بھی گر جائے گا جس صندوق
میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اس نے آخری پونجی رکھ
لی تھی۔ بڑے ارمانوں سے اسنے صندوق چھپا رکھا تھا۔ بڑے
ارمانوں میں ڈھکا رکھا تھا اس نے یہ صندوق۔ لیکن یہ بے حس پانی
شاید اسکے ارمانوں کو چوس کر اس صندوق تک بھی پہنچ جائے گا۔
اس صندوق کو بھی اپنی لپیٹ میں لے گا۔ محسوس کرتے ہی وہ آپ
ہی آپ جھنجھلا اٹھا۔ یہ سیلاب نہ ہوتا۔ بھونچال ہوتا تو شاید دوڑ
دھوپ کرنے سے جان بچ جاتی۔ بھونچال نہ ہوتا آگ ہوتی تو بھی
جل جھلس کے راستہ بنا ہی لیتا اور جو کہیں گر بھی جاتا تو کشمکش کی
ہوس باقی نہ رہتی۔ پر یہ مٹیالا پانی...... دھندلا دھندلا پانی...
نہ کوئی روک سکتی اس پر اور نہ اس سے لڑا جا سکتا تھا۔ دروازے
کی چوکھٹ پر بیٹھ کر اس بڑھتی موت کو بے بسی سے گھورنے
کے سوا کوئی کر بھی کیا سکتا ہے!

"رحمان کا کہیں پتہ چلا ـــ....." کسی کی آواز نے اسکی بے بسی کو
للکارا۔ اس نے گردن موڑی۔ بڑھیا اتنا نزدیک پہنچ گئی تھی

کہ لال پیرہن کا جھول صندوق کی نوک سے اُلجھا محسوس ہوتا تھا۔
اُس نے صندوق کو زور سے تھام کر کہا۔
"نہیں... کہیں دِکھائی نہیں دیتا۔" آواز میں بلا کی تھکن تھی
جیسے وہ اپنے بیٹے سے بالکل مایوس ہو گیا ہو۔
"پھر...." بے اختیار بڑھیا کے منہ سے نکلے۔
"پھر...." اُس نے دُہرایا۔ بھلا اِس پھر کا کیا جواب ہو سکتا
ہے۔ پھر وہ شہر میں اپنی کشتی بچانے سے تو رہا۔ پھر وہ بڑھتے
سیلاب کو روکنے سے تو رہا۔ پھر وہ بیٹے کو موت کے منہ سے واپس
بلانے سے تو رہا۔ اُسکی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن بڑھیا کے سامنے رونا
معیوب تھا۔ وہ بڑھیا کو نظر انداز کر کے کمرے کی طرف پلٹ پڑا۔
پھولی کمرے کی دیوار کے ساتھ بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ سر
گھٹنوں میں چھپا پڑا تھا۔ بال آوارہ ہو کر ٹانگوں پہ پھیلے لحاف
پر بکھرے ہوئے تھے۔ گردن ننگی تھی۔ ساری گردن میل سے اٹی
پڑی تھی اور بڑی بُری لگ رہی تھی۔ سیلاب کچھ اور بڑھ جاتے
تو اِس گردن کا میل بھی دُھل جائے گا۔ گردن سے سرک کر نگاہیں
کمرے کا جائزہ لیتی رہیں۔ فرش نئی چٹائیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک
چٹائی پر چھوٹی سی دری بچھی پڑی تھی۔ دری کے کنارے دیوار کے
ساتھ ایک نیا بستر لپٹا پڑا تھا۔ اُسکے بیٹے کا بستر.... اُسکے دل میں بے
انتہا درد اُبھر آیا۔ شاید یہ نیا بستر لپٹا لپٹا یا سیلاب کی نذر ہو جائیگا۔
رنگین دری کا ہر رنگ دھندلا جائیگا۔ مٹیالا پانی اِس دری کا ہر رنگ
چاٹ جائے گا۔ مٹیالا پانی اور مٹیالا ہو جائیگا۔ اور اُس کی اپنی نگاہیں

مٹیالی ہونے لگیں۔ جیسے مٹیالے پانی کی ساری دھندلاہٹ اُسکی نگاہوں میں سما گئی ہو۔

نگاہیں دھندلی سہی پر کمرے کا جائزہ لینے سے نہ رُک سکیں۔ وہ بدستور کمرے کے کونے کونے کو ٹٹولتی رہی۔ لالٹین اپنی جگہ پر تھا۔ سماوار اور چینی کے پیالے اپنے مخصوص کونے میں بکھرے پڑے تھے۔ دروازے کی چوکھٹ میں بڑھیا کسی بے جان تصویر کی طرح ٹنگی ہوئی لگتی تھی۔ بڑھیا کے سامنے دروازے کی چوکھٹ کے ذرا ایک طرف اُسکے اپنے بھیگے جوتے تھے۔ اپنے بھیگے جوتے دیکھکر اُس کا پریشان ذہن آگے سفر کرنے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو......" دروازے کی چوکھٹ میں ٹنگی تصویر بول پڑی اور وہ جوتے پہنتے پہنتے ٹھٹک گیا۔ سچ کہاں جا رہا تھا وہ؟ کدھر جا رہا تھا وہ؟ بڑھاپے کی آخری گھڑیوں میں اب کونسا کام باقی رہ گیا تھا.....؟

ماضی کے دھندلکوں میں پریشان ذہن نے ڈبکی تو لگائی لیکن اُسے کوئی کام ایسا نہ ملا جو باقی رہ گیا ہو۔ اُس نے کمایا تھا۔ کھایا تھا۔ شادی کی تھی۔ گھر بسایا تھا۔ بیج بویا تھا۔ اور بیج کو پروان چڑھتے بھی دیکھ پایا تھا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی کشتی میں زندگی کے سب کنارے گھوم آیا تھا۔ محبت کا اُتار چڑھاؤ بھی دیکھ آیا تھا اور نفرت کے گرداب بھی۔ اب جو یہ چند گھڑیاں باقی رہ گئی تھیں تو بڑھیا ملک الموت کی طرح اُس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ اپنے ساتھ اِن ڈراؤنے دھندلکوں میں گھسیٹ رہی تھی۔ اُسکو غصہ آگیا۔ اُس نے خاموشی سے

جوتے پہن لئے۔ جواب واضح تھا۔

جوتے پہن کر اس نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ لپیٹے بستر پر اُس کو اپنی لوٹی نظر آئی۔ اُس نے آگے بڑھ کر لوٹی اٹھائی اور تہہ کرنے لگا۔ لوٹی کی تہوں کے بیچ صندوق کو لپیٹ لیا۔ صندوق بازو تلے دبایا اور دروازے کی اور مڑا۔ دروازے کی چوکھٹ میں بڑھیا کو بدستور ٹنگا پاکر اُسے اچنبھا سا ہوا۔

"راستہ چھوڑ دو......" اُسکا لہجہ سپاٹ تھا۔

"تُم ہمیں چھوڑ کے جاؤگے......" بڑھیا کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"تو کیا کندھے پر لادتا پھروں......" اُسکا لہجہ بدستور سپاٹ رہا۔

"ہم عورتوں کو یوں بے سہارا چھوڑتے ہوئے شرم نہیں آئیگی" بڑھیا کا لہجہ بالکل نہ بدل گیا تھا اور اُسکا جی چاہا۔ ایک چھانپڑ دے کر بڑھیا کو راستے سے ہٹالے۔ بڑی ڈھیٹ عورت تھی۔ اتنی بار ڈانٹ سن کر بھی لہجہ نہ بدلا۔

"تم عورت ہوکر بھی دس مردوں پر بھاری ہو" اُس کی سوچ اُبل اُبل کر خود بخود الفاظ کے سانچوں میں ڈھلتی رہی۔

"تم نے رحمان کو مجھ سے الگ کردیا تمہاری وجہ سے میری کشتی شہر میں ڈوب گئی ہوگی۔ تو آڑے نہ آتی تو میرا رحمان...... میرا بیٹا مجھ سے جُدا نہ ہوتا.... یوں سیلاب میں نہ کھو جاتا۔ صبح سے گیا ہے اور اب تک نہیں لوٹ آیا ہے۔ کیا معلوم ڈوب گیا ہو" نبرا کی آنکھوں میں سیلاب مچلنے لگا اور بڑھیا اِس سیلاب میں ڈوب سی گئی۔ شاید رحمان کا باپ ٹھیک کہتا تھا۔ شاید رحمان کے باپ کی

کشتی سیلاب میں نہ ڈوب جاتی اگر وہ یہاں نہ آتا اور شاید وہ یہاں نہ آتا اگر رحمان یہاں نہ رہتا۔ شاید رحمان یہاں نہ رہتا اگر وہ خود رحمان کو نہ روکتی یا شاید وہ رحمان کو کبھی نہ روکتی۔ اگر وہ زندہ نہ رہنا چاہتی۔ شاید..... شاید زندہ رہنا بذات خود ایک گناہ ہے...
...بہت بڑا گناہ۔

"ٹھیک کہتے ہو تم..... بالکل ٹھیک کہتے ہو" بڑھیا کی آواز ڈوب گئی "میں ہی ساری مصیبت کی جڑ ہوں۔ میں اِسی قابل ہوں کہ سیلاب بہا لے جاتے۔ پر اِس معصوم جان کا کیا ہوگا.... میری پھولی کا کیا ہوگا۔"

پھولی جاگ گئی تھی اور اُنکی گفتگو سُننے میں محو تھی۔ سب کی نگاہیں اپنے اوپر پاکر وہ گھبرا سی گئی۔ مارے شرم کے اُس نے سر جھکا لیا اور بنبرا کے ذہن میں عجیب سا خیال گوندگیا۔ رحمان کی دُلہن ہوتی تو شاید وہ بھی سسر کی نگاہوں کے سامنے شرم سے ایسے ہی سر جھکا لیتی جیسے پھولی اپنے سر کو جھکا رہی تھی اور اُسکا درد پھر اُٹھا۔

"تمہاری بیٹی نے ہی تو میری دُنیا برباد کردی۔ یہ بھی مرجائے تو میرا دِل ٹھنڈا ہو جائے گا"

"بکواس..... بوڑھے درندے...." بڑھیا بجلی کی طرح تڑپ اُٹھی۔ ایک ماں چاہے اُسکا بچہ کتنا ہی بُرا ہو۔ اپنے بچے کے متعلق گالیاں کیسے سہہ سکیگی "میں تمہاری زبان کھینچ لونگی...." بڑھیا چیخنے لگی۔ وہ اور بوڑھا درندہ... بنبرا کی کنپٹیوں پہ چنگاریوں کی تیز بوچھاڑ سی ہوئی۔ بڑھیا شاید اپنے آپ کو پہ ہی سمجھ بیٹھی تھی۔

"راستہ چھوڑ دو بڑھیا کی بچی ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"
نبرا نے دھمکی دی۔

"نہیں چھوڑتی راستہ... کمینے کتے..." بڑھیا دھاڑی۔

نبرا نے بڑھیا کے بدن کو دروازے کی چوکھٹ میں پھیلتا سا محسوس کیا۔ وہ گھبرا گیا۔ کہیں یہ بدن پھیلتے پھیلتے سارے دروازے کو ڈھانپ نہ دے پھر تو راستہ پانا مشکل تھا۔ پل تک پانی آگیا تو آخری راستہ بھی مسدود ہونے کا خطرہ تھا۔ کوئی چارہ نہ تھا بڑھیا کو زبردستی دروازے سے ہٹانے کے لئے... کوئی چارہ نہ تھا...!

لمحہ بھر کے لئے بڑھیا سکڑ سی گئی۔ صدیوں بعد کسی مرد کا ہاتھ اُس کے بدن سے مس ہو گیا تھا۔ لیکن دوسرے لمحے شرم کو بالائے طاق رکھ کر وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح نبرا پر ٹوٹ گئی۔ کمرے میں گالیوں اور چیخوں کا سیلاب ٹوٹ پڑا اور پھولی نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ نبرا چکرا گیا۔ آج اُسے محسوس ہوا کہ ناتجربہ کار رحمان اِس بڑھیا کے سامنے بے بس ہے۔ وہ خود تجربہ کار ہوکر اِس بڑھیا کے سامنے بے بس ہو رہا تھا ایسے لپٹی پڑ رہی تھی جیسے جونک لپٹ پڑی ہو۔ اور لمحہ بہ لمحہ زور پکڑتی جا رہی ہو کشمکش تو درکنار کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہار مان لینے میں ہی خیریت تھی۔

"لے جاؤنگا... لے جاؤنگا... اُف... اب چھوڑ بھی دے حرامزادی"

"تم جھوٹ کہتے ہو۔ دھوکہ دیتے ہو..." بڑھیا چیخی لیکن اپنی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی۔ نبرا کو محسوس ہوا کہ بیٹے کی جان

لے کر اب بڑھیا اُسکی جان لینے پر تُل گئی ہے۔ اپنی حالت پر وہ بل کھا کے رہ گیا۔

"اللہ قسم سچ کہتا ہوں...... اب چھوڑ بھی دے مال زادی"

بڑھیا نے اللہ کے ڈر سے اُسکو چھوڑ دیا لیکن دروازے کو بدستور روکے رہی۔ پریشان بال... سُرخ چہرہ... اُبلتی آنکھیں... کپکپاتے ہونٹ... کمرے کے ملگجے میں بڑھیا ہو بہو ڈائن لگ رہی تھی۔

"لے جاؤنگا۔ تُم دونوں کو لے جاؤنگا۔ پہلے پھولی کو لے جاؤنگا بعد میں تمہیں لے جاؤنگا۔" ونبرا کا دِل الفاظ کے جامے میں عنوان بن بن کر نکل رہا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن جب تک تم پھولی کو پار نہیں پہنچا آؤ گے تب تک روپیوں کا صندوق یہیں چھوڑ جانا ہوگا۔" بڑھیا نے مانگ کی۔

"کیوں..." ونبرا نے بولنا چاہا لیکن آواز نے ساتھ نہ دیا۔ آواز سینے کے زیر و بم میں ڈانواڈول تھی۔

"کیا معلوم تم پھولی کو راستے میں ہی چھوڑ کے بھاگ جاؤ"

بڑھیا نے کہا اور ونبرا کا جی چاہا ایک بار اور بڑھیا سے چمٹ پڑے۔ بڑھیا کی ہڈی ہڈی توڑ دے۔ بڑھیا ڈائن نہ تھی بلکہ ڈائن سے بھی بدتر... اُس کی زبان کہنے سے قاصر تھی۔

"یقین رکھو۔ میں پھولی کو راستے میں نہیں چھوڑ جاؤں گا" ونبرا نے بے بس ہو کر کہا۔ بڑھیا سے چمٹ پڑنا آسان تھا لیکن چھٹکارا پانا مشکل...!

"مجھے تم پر بھروسہ نہیں - پھولی کو پہنچا کر تم واپس آکر صندوق لے جا سکتے ہو۔"

بڑھیا کا جواب سُن کر ببرا سے رہا نہ گیا - اُس نے چوٹ کی "

"اور جو پھولی کو چھوڑ کر تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں تو ........"

"مجھے اپنی پرواہ نہیں - تمہارا سہارا لینے کی بجائے میں مرجانا پسند کروں گی" بڑھیا کی آواز میں غضب کی نفرت تھی - ببرا کسمسا کر رہ گیا - مرجائے بڑھیا - اُس کی بلا سے - صندوق تو کہیں لے جانے سے رہی - ناحق بات کو طول دے کر وقت ضائع کرنے سے فائدہ - پانی مکان کے بالکل نزدیک آگیا تھا - اور صندوق لانے کے لئے دوسرا پھیرا ابھی کرنا پڑے گا -

"ٹھیک ہے - دوسرے پھیرے میں میں صرف صندوق لے جاؤں گا - تمہیں نہیں .... منظور ہے"

"ہاں .... ہاں منظور ہے - لے جاؤ پھولی کو ...." بڑھیا نے حکم جھاڑا اور اُس نے پیٹھ جھکا لی -

پھولی کو ببرا کی پیٹھ پر چڑھ جانے پر آمادہ کرنے میں اتنا وقت ضائع ہو گیا - کہ پانی مکان کی بنیاد تک پہنچ گیا - وہ تو بڑھیا نے جھاڑ جھپٹ کے پھولی کو ببرا کی پیٹھ پر گٹھڑی کی طرح لاد لپیٹ دیا ورنہ پھولی شرم و حیا سے سن ہوئی جا رہی تھی اور ایک بے جان گٹھڑی کی طرح ببرا کی پیٹھ سے پھسل پھسل رہی تھی - ببرا کو پھولی سنبھالنے میں بڑی دِقت پیش آئی اور وہ ماں بیٹی کا موازنہ کئے بغیر نہ رہ سکا - ایک بیٹی تھی جو سیلاب کے

خطرے کو نظر انداز کر کے مارے حیا کے غیر مرد کی پیٹھ پر چڑھنے سے احتراز کر رہی تھی اور ایک ماں تھی جو اپنی بیٹی کو غیر مرد کی پیٹھ پر لادنے پر تُل گئی تھی۔ شاید بڑھیا نے پھولی کو زبردستی رحمان کے گلے منڈھ دیا تھا ورنہ پھولی اتنی جراءت نہ کرتی.....!

اُس کے دل میں پھولی کے تئیں خواہ مخواہ رحم سا پیدا ہو گیا۔ اُس نے پھولی کو اپنے بچے کی طرح سنبھال کر پار پہنچا دیا۔ راستے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئی کیونکہ دریا اور سڑک کے درمیان مٹی کا بندھ ابھی ٹکا ہوا تھا۔ صرف کہیں کہیں دریا کا پانی چھوٹے چھوٹے شگافوں میں سے فواروں کی طرح سڑک پر پھیلے پانی میں گر رہا تھا۔ سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا۔ چاروں طرف پانی اتنا زیادہ تھا کہ کھیتوں کی اونچی منڈیریں اور سڑک کی منڈیر پانی کی آغوش میں چھپ گئی تھی۔ شاید ڈلر کے سب بند ٹوٹ گئے تھے ورنہ ڈلر سے اس سڑک تک میلوں کا فاصلہ تھا اور پانی یہاں تک نہ پہنچ پاتا۔

شبرا کو بوجھ اٹھانے کی عادت نہ تھی تو پھولی کو اٹھا کر لے جانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ویسے پھولی بھی کچھ زیادہ وزن دار نہ تھی لیکن پار پہنچ کر اُسکو اپنی ساری محنت رائیگاں جاتی محسوس ہوئی۔ پُل کے پاس صرف زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ پانی کی دستبرد سے محفوظ تھا۔ باقی اردگرد ساری خشکی پر پانی نے یلغار کر دی تھی جتنا کہ ذرا دور واقع ہاجن گاؤں بھی پانی میں شرابور تھا۔ اردگرد زندگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ کہیں سڑک اور دریا کے

بیچ بندھا بندھ ٹوٹ گیا تو دریا اپنا اصلی راستہ چھوڑ کر کھیتوں کے
بیچ میں سے ڈلر کی اور لپکنے لگے گا اور سڑک بالکل کٹ جائے گی اور
صندوق لانا ناممکن ہوگا۔ اُسکو جلدی کرنی چاہیے۔ لیکن پھولی جانے
کبھی ڈوبے تو ...... قمیض کے دامن کو کھینچ کھینچ کر اُس سے
اُلجھ رہی تھی۔ رو رو کر بڑھیا کی جان کا واسطہ دے رہی تھی اور
قیمتی لمحے ضائع کر رہی تھی۔ جیسے بڑھیا مر گئی تو ساری دُنیا مر جائیگی
..... ہوں۔ وہ جھنجلا اٹھا۔ بڑھیا اُس سے اُلجھ کر قیمتی وقت ضائع
نہ کرتی تو وہ اِس وقت ہاجن گاؤں کی حدود سے پرے نکل گیا ہوتا..!
اُس نے قمیض کے دامن سے پھولی کا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ جھٹکا
لگا اور دامن پھٹ گیا۔ اُسکو بے اِنتہا غصہ آگیا۔ زور کا دھکا دے کر
پھولی کو زمین پر گرا دیا اور خود واپس لوٹ پڑا لیکن راستہ بھر وہ
اپنی حرکت پر نادم رہا۔ بڑا بہادر تھا نا وہ..... جو ایک مریل سی
بیمار لڑکی کو زمین پر گرانے میں کامیاب ہوگیا۔ بڑھیا موجود ہوتی
تو پھولی کو دھکا دینے سے پہلے وہ لمحہ بھر کے لئے رُک جاتا.....
شاید ٹھیک کہا تھا بڑھیا نے کہ وہ اِنسان نہیں درندہ ہے.... درندہ
.... جو کمزوروں پر زور آزمائی کرنے سے نہیں چوکتا..... درندہ..
.. بوڑھا درندہ...... درندہ نہ ہوتا تو بڑھیا کو سیلاب میں چھوڑ
جانے کا جتن نہ کرتا۔ درندہ نہ ہوتا تو ایک بیمار بچے پر ہاتھ اٹھانے
سے کتراتا.... درندہ نہ ہوتا.... درندہ نہ ہوتا.. سیلاب کا شور
چیخ چیخ کر اُسکے کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ ندامت کی شدت
سے اُسکا وجود تھر تھرانے لگا یا شاید پانی کی تیزی اُسکے وجود کو

کتھر کتھرانے پر مجبور کر رہی تھی۔ بندھ کے شگاف سیلاب کی تاب نہ لاکر بڑھ رہے تھے اور فوارے آبشاروں میں تبدیل ہو رہے تھے بندھ کی مٹی پانی کے زور سے بہی جا رہی تھی۔ اور سڑک پر پھیلا پانی گھٹنوں کو جکڑے جا رہا تھا۔

مکان کے پاس پہنچ کر اُسکے وجود کو جھٹکا سا لگا۔ پانی اتنی ہی دیر میں مکان کے اندر پہنچ گیا تھا۔ کچا مکان پانی کے پہلے ریلے نے ہی بیٹھا کر دیا تھا۔ نزدیک جاتے ہوئے ڈر سا لگ رہا تھا۔ کہیں گر گیا تو روپیوں کے صندوق کے ساتھ ساتھ اُس کی جان تک کا خطرہ تھا۔ لیکن ٹیڑھے دروازے کی دہلیز پر بیٹھی بڑھیا کو دیکھ کر اُسکا ڈر کچھ کچھ ڈھیل ہو گیا۔

بڑھیا پانی سے بچنے کے لئے دہلیز پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ پاس ہی دہلیز پر روپیوں کا صندوق چادر میں لپٹا لپٹا یا رکھا تھا۔ پانی دہلیز کی اونچائی کو چھونے لگا تھا.... بڑھنے لگا تھا اور صندوق پر لپٹی چادر کے لٹکتے کونوں کو چاٹ رہا تھا۔ اُس نے صندوق اٹھا کر بغل میں دبا لیا۔ یقین نہ تھا کہ بڑھیا مارے جلن کے صندوق میں روپئے رہنے دیگی۔ لیکن صندوق میں سے ہلکی سی کھنکھناہٹ نے اُسے اچنبھے میں ڈال دیا۔ اُس نے بڑھیا کی طرف دیکھا۔ کیا معلوم بڑھیا اُسے روک دے.... اُسکی منت مانگے اُسکے سامنے گڑگڑاتے۔ لیکن بڑھیا نے کچھ نہ کہا۔ اُسکے وجود سے بے نیاز وہ پانی کی سطح کو ایسے گھور رہی تھی جیسے اپنی نگاہوں سے پانی کی بڑھتی سطح کو اور بڑھنے سے روک رہی ہو۔ پانی کی سطح پر کسی گھر کی ٹوٹی کڑی بہتے گھاس پھوس میں

اُلجھی سرگرداں تھی۔

"پھولی کو پہنچا آیا ہوں اور اب میں جا رہا ہوں ....." اُس سے کچھ
بنا نہ رہا گیا۔ بڑھیا کی خاموشی، بے اعتنائی .... پھولی کی چیخ و پکار عورتوں
کے موثر ہتھیار تھے اور وہ مرد ہونے کے ناطے جانتا تھا کہ کسی مرد کو
اِن ہتھیاروں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں۔ ورنہ مرد نے عورت کا
خاتمہ صدیوں پہلے کیا ہوتا۔ عورتیں مکار تھیں۔ حرامزادیاں .....!

"خدا کے حوالے ......" بڑھیا نے ہولے سے جواب دیا اور نبرا کی
حیرانی کنارے توڑ بیٹھی۔ جی میں آیا کہ ایک لات مار کر بڑھیا کا بھرم
چکنا چور کر دے۔ دہلیز پر یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی فکر نہیں ... غم نہیں۔
... ڈر نہیں۔

"مکان گرنے والا ہے ...." نبرا نے بڑھیا کی بے اعتنائی کا منہ چڑایا۔
لیکن بڑھیا کی حالت میں کوئی فرق نہ پیدا ہوا۔ اور وہ جھنجھلا اٹھا۔
کاش بڑھیا ایک دفعہ صرف ایک دفعہ اُسکے سامنے جھک جائے۔ ایک
دفعہ اُسکی منت مانگے تو قسم اللہ کی .... وہ اپنی جان دے کر بھی بڑھیا کو
اِس بڑھتے موت کے چنگل سے نکال لے گا۔ کاش ... لیکن بڑھیا کچھ کہے
تو۔ جواب دینے کی زحمت بھی نہ کی حرامزادی نے اور وہ آپ ہی
آپ جل اٹھا۔

"میں کہہ رہا ہوں مکان گرنے والا ہے۔ بہری ہو گئی .. دب جاؤ
گی" وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔

بڑھیا نے جواب دینے کے بجائے اُسکے سراپا کا ایسی نگاہوں سے
جائزہ لیا کہ نبرا کو اپنا آپ ننگا ہوتا محسوس ہوا۔ مائی زادی ....

.... حرامزادی ..... کمینی .... ڈائین ۔ وہ پاگل ہو گیا ۔ سارے بدن میں وحشت کوند گئی ۔ ہاتھ بجلی کی طرح آگے بڑھے اُس نے بڑھیا کو کھینچ کر پانی میں کھڑا کر دیا ۔ بڑھیا چیخی ..... چلائی لیکن اُس نے اپنی گرفت ڈھیلی نہ کر دی ۔

" ماں زادی ..... نخرے کرتی ہے ۔ خود تو مر کر چھٹکارا حاصل کر لوگی سبھولی کو کون سنبھالتا پھریگا ۔ چل پار اپنی بیٹی کے پاس پھر چاہے مریا زندہ رہ ..... میں تجھے یہاں نہیں چھوڑنے کا ۔" نبرا نے اپنی کمزوری کو سبھولی کے کمزور وجود میں چھپانا چاہا ۔

بڑھیا نے عاجز آکر اپنے رہے سہے دانت اُس کے ہاتھ پر گاڑھ دیئے ۔ یہ بوڑھا درندہ ایسے کھینچے جا رہا تھا جیسے کسی لاش کو کھینچ رہا ہو ۔ لیکن نبرا غافل نہ تھا ۔ اُس نے ہاتھ چھڑا کر ایک زور کا جھانپڑ بڑھیا کے گال پر مارا اور بڑھیا کا ذہن جھنجھلا اٹھا ۔ شاید اُسکا مرحوم خاوند بھی غصے میں اُسکو ایسے ہی جھانپڑ مارا کرتا تھا ۔ بڑھیا نے سوچنا چاہا ..... یاد کرنا چاہا ۔ پر اُسکو مہلت نہ ملی ۔ نبرا اُسکے بدن کو بڑی بے دردی سے گھسیٹتا جا رہا تھا ۔

" تم لے چلتا ہوگا ماں زادی ..... چاہے مجھ کو نہیں گھسیٹ کر ہی کیوں نہ لے جانا پڑے ۔ میں درندہ ہوں نا ..... بوڑھا درندہ ..... اب میری درندگی بھی دیکھ ۔ کسی مردہ کتیا کی لاش کی طرح گھسیٹ کر لے جاؤں گا ..... ہاتھ پیر مارنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔"

اور بڑھیا کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہو گئے ۔ کشمکش فضول تھی نبرا کے ہاتھ بڑے سخت تھے ۔ کھردرے تھے لیکن اُسکے لڑکھڑاتے وجود کو عجیب سا سہارا دے رہے تھے ۔

---

سورج کی اُٹھتی کرنوں میں دریا بھیانک لگ رہا تھا۔ پانی میں
ایسے ہلچل مچل رہی تھی جیسے دریا کی تہہ میں بھونچال آرہا ہو اور لہروں
کے بجائے اُبلتی آگ کی لپٹیں پھینک رہا ہو۔ کشتی بے قابو ہونے پر تُل
سی گئی تھی۔ اور رحمان کا سارا زور کشتی کو قابو میں رکھنے کے لئے صرف
ہو رہا تھا۔ پانی میں اتنی تیزی سے بل پڑ رہے تھے کہ اُسکے سارے جسم
میں بل پڑ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ کشتی موڑ کر واپس پمپ شیڈ
نمبر چار پر لے جائے۔ اِس دریا کی مست دھار میں جانا موت کے منہ
لگنا تھا۔ جائے کبھی وہ پمپ شیڈ نمبر چار پر تو کھانے کے لئے بھنے مرغے
ملتے۔ پینے کے لئے اِس مٹیالے پانی کے بجائے شراب کی بوتلیں ملتیں۔
اور زندہ رہنے کے لئے نوکری۔ اوورسیروں نے اُسکو روکنے کے لئے
سرکاری نوکری کا لالچ بھی دیا تھا وہ سیلاب کو دیکھ کر پھولے نہ سما
رہے تھے۔ سیلاب کیا آگیا تھا اوورسیروں انجینروں اور ٹھیکہ داروں
کی قسمت میں سیلاب آگیا تھا۔ اُنکی تقدیر جاگ گئی تھی۔ سیلاب کی تباہی
نے دُنیا بھر کا کام پیدا کر دیا تھا۔ واپس پمپ شیڈ نمبر چار پر جائے
تو شاید وہ بھی دینا ناتھ کی طرح مستری بن جائے۔!

اور جو واپس پمپ شیڈ نمبر چار پر نہ جائے تو دریا کے پار۔
تاریک جھونپڑی کی ویرانی تھی۔ بھوک تھی بڈھے کی علالت
تھی۔ بڑھیا کی دھونس ڈپٹ تھی اور پھولی کی۔۔۔۔ پھولی کی۔۔۔۔۔
وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ اُسکے لڑکھڑاتے ذہن میں پھولی کا ادنیٰ
واضح احساس نہ جاگ گیا تھا۔ پھولی تپتا بدن تھی یا برف کی منجمد سِل

۔ آگ کی بوند تھی یا خالی بوتل۔ یا برفیلے سیلاب کا ایک تھپیڑا جو اُسکی زندگی کو معمولی ناؤ کی طرح بہالے جا رہا تھا۔ اتنی تیزی سے ......
اتنی تیزی سے ...... اُس کا سر چکرانے لگا۔

کہیں وہ بہک تو نہیں گیا ہے۔ یہ شراب کا نشہ تھا یا تیز رفتار پانی کا اثر ...... اندازہ کرنے کے لئے اُسکی کانپتی نگاہیں اُفق سے اُچٹ کر کشتی کے کناروں پر پھسلنے لگیں۔ کشتی کے کناروں پر پیلی جھاگ ایسے جم رہی تھی جیسے سیلاب کے ڈر سے کشتی کا سہارا لینا چاہتی ہو اور کشتی پیلی جھاگ کے بوجھ تلے لڑکھڑا سی رہی تھی .... کراہ سی رہی تھی۔ یہی حال رہا تو شاید اُسکا اپنا وجود بھی لڑکھڑا جائے۔ پانی للکار رہا تھا۔ منہ چڑا رہا تھا۔ وہ جھنجھلا اٹھا۔ اُسکے سارے بدن میں وحشت سی کوند گئی تھکے بازوؤں میں نئی تیزی آگئی اور کشتی اور پانی کے ٹکراؤ کی گرج اور اونچی ہو گئی۔

سیلاب سے لڑتا جھگڑتا .... چھینٹے اڑاتا وہ پار پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ بھلا ہو اُن بیروں کا جنھوں نے جانے سے پہلے اُس کو زبردستی شراب پلادی تھی۔ شراب کی چند بوندوں کے سامنے اس سیلاب کی وقعت کیا تھی۔ قہقہہ مار کر سیلاب کا منہ چڑانا چاہتا تھا لیکن اُسکے حلق سے قہقہہ نہ ابھر آیا۔ مکان کی جگہ ملبے کا ڈھیر اُسکا منہ چڑا رہا تھا۔ کہیں وہ اب بھی نشے کی پینگ میں غرق تو نہیں اُس نے اپنی آنکھیں مسل ڈالیں۔ ملبے کا ڈھیر وہیں کا وہیں تھا پانی کی ہلکی ہلکی لہریں ملبے کے ڈھیر کو جاٹے جا رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد پہنچ جاتا تو شاید سیلاب نے ڈھیر کو پوری طرح سے چاٹ لیا ہوتا اور اُسے

منزل کی تلاش میں اس میلوں پھیلی مٹیالی موت میں بھٹکنے کو چھوڑ دیا تھا کہ تھک ہار کر وہ موت کو ہی اپنی منزل سمجھنے پر مجبور ہو جاتا لیکن ملبے کا ڈھیر واضح نظر آرہا تھا۔ ملبے کے ڈھیر پر چھت کی ٹوٹی پھوٹی کڑیاں کٹے ہاتھ پیروں کی طرح بے ترتیب پڑی تھیں۔ بے ترتیب کڑیوں پر گھاس کے گھٹے پریشان سے تھے۔ کچھ گھاس کے گچھے پانی میں بہہ رہے تھے اور دور بہے جا رہے تھے۔ شاید وہ خود بھی ان بہتے گھاس کے گچھوں کی طرح ایک گھاس کا گٹھا تھا سرگرداں...... آوارہ... جسکی راہ سیلاب نے اوجھل کر دی تھی جسکی منزل سیلاب بہا لے گیا تھا۔

ملبے کے ڈھیر کے کئی چکر کاٹ کر بھی اسکو کوئی ایسا نشان نہ ملا جس سے مکان کے مکینوں کا کوئی پتہ چل جاتا۔ اُس نے ناؤ ملبے کے ڈھیر سے لگا دی اور ہاتھوں سے ملبے کو کریدنے کی کوشش کرنے لگا۔ دل میں ڈر ابھر رہا تھا کہ نہ معلوم موت سے کس بھیانک صورت میں سامنا کرنا پڑے۔ کہیں ملبے کے اتنے بڑے ڈھیر کو ہٹانے کی اُسکے تھکے بدن میں سکت نہ تھی۔ کچھ ہی دیر میں اُسکے پیر شل ہو گئے۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا میلوں تک پانی کا راج تھا۔ جس میں زمین کے سارے نشان مدغم ہو گئے تھے۔ صرف دور... بہت دور سیلاب سے محفوظ بھی دکھائی دے رہا تھا سیلاب کی پرچھائیاں سا لگ رہا تھا۔ باپ شاید زندگی بھر سیلابوں کا سامنا کر کے آخر کار سیلاب میں ہی گُم ہو گیا ہے؟

نامردی کا احساس ہوتے ہی پچھتاوے کی ایک تیز لہر اُسکے تھکے ذہن کو ڈبو گئی۔ بھلا کیا ضرورت تھی سونہ داری آنے کی۔ سونہ داری میں آکر پچھلی سے محبت کی پینگیں بڑھانے کی... پھولی... پھولی جس نے اُسکو نظر انداز کر کے...

عبد السلام سے ناطہ جوڑ لیا۔ عبد السلام نے چھوڑ دیا تو اُسکو اپنے دام میں لپٹانا چاہا۔ اور جو وہ کبھی کنارہ کو لیتا تو کسی اور شکار کو مقدش کر لیتی۔۔۔ ہائی زادیا ۔ کتنا۔۔۔ کاش اُسکا باپ ایک بار زندہ ہو جائے تو بھولی کو باپ کے پیروں تلے کچل ڈالے۔ کاش وقت کچھ لمحے پیچھے لوٹ پڑے تو وہ اپنی کوتاہیوں، زیادتیوں اور گناہوں کا کفارہ کر سکے۔ کاش۔۔۔۔۔

کاش۔۔۔ وہ پُل کی منڈیر تک پہنچ جائے اور اپنے لڑکھڑاتے بدن کو کچھ دیر کے لئے کھردری سخت زمین کا سہارا دے سکے۔ سیلاب نے اُسکی زندگی کا سب سے بڑا سہارا چھین لیا تھا۔ اب حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ ظاہراً وہ اپنے بل بوتے پر کھڑا رہنے کی کتنی ہی سعی کرے لاشعور میں اُسکی ہر حرکت باپ کے وجود کے سہارے کھڑی تھی۔ وہ شوہر دار ہی آگیا تو یہ سمجھ کر کہ ناکام ہو کر بوڑھے باپ کے ہاں پناہ مل سکتی ہے۔ دبنا ناخوش سے ناطہ توڑ دیا کیونکہ وہ جانتا تھا اُسکا بوڑھا باپ دوست کی کمی کو پورا کر سکیگا۔ بھولی سے رشتہ بڑھانے کی جرائت کی کہ کہیں داؤ اُلٹا پڑ گیا تو باپ کا کھردرا مضبوط جسم ڈھال بن کر اُس پر چھا جائے گا۔ ہر بلا سے اُسکو محفوظ رکھیگا۔ حتےٰ کہ سیلاب کے بیچ اپنی قسمت کھونے وہ تب چلا تھا جب اُسکا باپ اُسکے ارمانوں کی حفاظت کے لئے موجود تھا۔ اب باپ نہ تھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ سیلاب نے اُسکی جان نہ لی ہو لیکن زندگی چھین گیا یا شاید اُس نے خود اپنی زندگی کو سیلاب میں غرق کر دیا۔ رو دے تو کیا حاصل۔ اِس سیلاب کے سامنے چند آنسوؤں کی کوئی وقعت نہیں۔۔۔ کوئی وقعت نہیں۔۔۔۔!

ناؤ پُل تک آگئی تو آنکھوں میں آنسو رک گئے۔ آنسو بھی شاید پُل کی منڈیر سے پیٹھ لگائے نبرا کو بے اعتباری سے تکنے لگے۔ پُل کی منڈیر سے

پیٹھ لگائے سر گھٹنوں میں چھپائے اُسکا باپ سویا پڑا تھا۔ یا شاید سیلاب نے نڈھال کر دیا تھا۔ اُسکا اپنا انگ انگ سیلاب نے نڈھال کر دیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی گھٹنوں میں سر جھکائے سویا پڑا رہے۔ صدیوں تک سویا پڑا رہے۔ لیکن سر جھکانا اُسے منظور نہ تھا۔ سر جھکا لے تو شاید نیلی دھاری دار قمیض کا رنگ سیلاب اُڑا لے جائے مٹی سے اٹی سفید شلوار مٹیالے پانی میں جذب ہو جائے۔ اور سارا ماحول کچھ دور پڑے سایوں کی طرح سایوں میں تبدیل ہو جائے۔ کھولی اور بوڑھیا کے سوالیہ کے سائے ہو سکتے تھے.... وہ اُسے یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ کھڑا ہوگیا کشتی کا توازن بگڑ گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ بے تحاشہ اُس نے خشکی پر چھلانگ لگائی۔ دیر کر دی تو شاید ٹیلے کی منڈیر کے ساتھ لگے ہو کچھ سائے بھی بڑھتے اندھیروں میں گم ہو جائیں۔ کیا معلوم ٹیلے کی منڈیر اور منڈیر سے جڑا زمین کا چھوٹا سا قطعہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور وہ ایک بار بے سہارا ہو جائے۔ اب اُس میں اکیلے رہنے کی ہمت نہ تھی۔ کاش اُسکی نگاہیں اِس خواب کو تب تک روکے رکھیں جب تک وہ کوئی سنگی انسان نہ پائے۔

نم زمین پر بلا کی پھسلن تھی۔ قدم قدم لڑکھڑا رہا تھا اور پاؤں کی چاپ اُبھرنے سے پہلے ہی سیلاب کی گونج چاٹ جاتی۔ اِس لئے اُسکو باپ کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑنا پڑا۔ ابّا ایسے چونک پڑا جیسے سیلاب کا کوئی تھپیڑا اُسے چھو گیا ہو۔

"تم... تم آگئے۔ میں سمجھا تھا سیلاب بہا لے گیا ہوگا۔ یقین نہیں آ رہا کہ زندہ ہو۔ تم تو دُور بہہ چلے گئے تھے۔ رضیوں کا صندوق بھی ڈوب گیا تقاضا بھی

ڈوب جاتے تو کوئی کیا کرے۔ کچھ نہ باقی رہا اِس دنیا میں میرا . . . ،،
،، کیسے ڈوب گیا صندوق . . . . . رحمان کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔ باپ کے صدمے نے اُسکے تھکے ذہن کو آلودہ کر دیا۔ خیر و عافیت پوچھنے اور جان کی خیر منانے کے بجائے وہ سود خواروں کی طرح اسباب و کتاب کر رہے تھے سوچ بھی شاید تھک کر نڈھال ہو گئی تھی۔
،، بڑھیا مال زادی نے ڈبو دیا جو ایسے بے فکر لیٹی پڑی ہے جیسے کچھ کبھی نہ ہوا ہو ،، نمبرا دل کی بھڑاس نکالنے لگا۔
،، بڑی دلیر بنتی تھی۔ پاکباز بنتی تھی۔ پانی میں بے سہارا چلتی رہی۔ لاکھ کہا کہ ہاتھ پکڑ کر چلو پر وہ ڈائن مانتی بھی . . . جیسے میں اُسکو چھونے ہی کیا جاتا۔ جب مکان سے یہاں تک آدھا راستہ آ گئے تو دریا کے طرف کا بندھ ٹوٹ گیا۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ بندھ میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ بالکل اُسی جگہ بندھ ٹوٹ گیا۔ بھلا میرا اندازہ کہیں غلط ہو سکتا تھا ،، نمبرا بیٹے کی داد سُننے کے لئے رُک گیا۔ لیکن رحمان اُسے ایک ٹک گھورتا رہا تھا۔ نمبرا نے سٹپٹا کر پھر کہنا شروع کیا۔
،، بندھ ٹوٹ گیا اور پانی کا تیز ریلا آ گیا۔ بڑھیا کے پیر اُکھڑ گئے۔ بے تحاشہ مجھ سے لپٹ پڑی۔ بڑھیا جیسے ہی گہری تہ میں گر گیا۔ صندوق لاتی میں لپٹا میری بغل ہی میں دبا تھا۔ وہ بہہ گیا۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ بڑھیا میرے ہاتھ پیر چھوڑ دے لیکن شیطان کی خالہ مجھ سے برابر اُلجھتی رہی تھی کہ صندوق دور بہہ گیا اور لاتی بھی ڈوب گئی۔ وہ تو نہ معلوم میرے دل میں کیا آیا کہ اُسے لپیٹ کر بڑھیا کو یہاں تک لے آیا ورنہ جی تو چاہا تھا کہ پانی میں ہی دبا کے رکھ دوں مال زادی کو . . .

مر جاتی تو میری بلا سے .... پر تم یوں کیا دیکھ رہے ہو۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں ؟ کیا تم سمجھتے ہو میں نے صندوق چھپا لیا .... ؟ بولو بھئی جواب دو .....!

اور رحمان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ باپ کو برابر گھورے جا رہا تھا۔ یقین نہ آ رہا تھا کہ بوڑھا بڑھیا کو مارنے پہ تل گیا تھا۔ شاید باپ صندوق کی خاطر اُسکو بھی بہہ جانے دے۔ لالچی۔ حریص کُتا۔ کوئی فائدہ نہ تھا اِس جیسے باپ کے سامنے سر جھکانے کا۔ اپنے گناہوں کا کفارہ کرنے کا .... اُسکی سوچ خود بخود بدلتی گئی۔ اُس نے بلبھ موڑی اور نبرا اُبل سا پڑا۔ یقین نہیں آتا میری بات کا .... میں اگر جھوٹ بول رہا ہوں تو بڑھیا سے پوچھ لو۔ وہی سگی ہے نا تمہاری۔ میں کون ہوتا ہوں۔ جاؤ .... جاؤ .... پوچھو .... لیکن وہ تمہیں کچھ نہ بتا سکے گی۔ وہ مر گئی ہے .... میری کوشش کے باوجود مر گئی ہے "

"بڑھیا .... بڑھیا مر گئی ہے" اُسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جب بڑھیا نے اُسکو مرنے سے بچایا وہ کیسے مر سکتی ہے جب وہ خود زندہ ہے۔ نبرا سٹھیا گیا ہے بیماری نے اُسکا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ابھی تو کہہ رہا تھا کہ بڑھیا لیٹی پڑی ہے۔ ویسے ہے تو عجیب سی بات۔ لیٹ کے پڑا رہنا بھولی کو چاہئے کیونکہ بھولی بیمار تھی .... کہیں واقعی تو نہیں مر گئی بڑھیا .... اری نہیں .... مر گئی ہوتی تو بھولی یوں چپ نہ پڑی رہتی .... وہ روتی پیٹتی .... بین کرتی .... جیسے ہر زندگی ہر موت پر کرتی ہے۔ کہیں شاید بھولی بھی نہ مر گئی ہو .... اُس نے بے اختیار نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھ لیا۔ کہیں بوڑھے نے صندوق کی خاطر ماں بیٹی کو مار نہ دیا ہو .... !

منبرا بیٹے کی آنکھوں میں بڑھتی بے اعتباری کو نہ سہہ سکا۔ اُس نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے کہنا شروع کیا۔

"بڑھیا بہت پانی پی گئی۔ پیٹ دبایا لیکن پانی نہیں نکلا۔ ہوش بالکل نہ تھا۔ پھولی رونے لگی۔ بھلا میں اکیلا آدمی کس کس کو سنبھالتا۔ مرتی ماں کو سنبھالتا یا روتی بیٹی کو۔ پھولی کا دھیان ہٹانے کے لئے میں نے اُسے بڑھیا کے پاؤں دابنے پر لگایا۔ خود بڑھیا کے بدن کی مالش کی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بڑھیا سرد ہو چکی تھی۔ اب بھلا میں پھولی سے کیا کہتا۔ کیونکر کہتا کہ اُسکی ماں مر گئی ہے۔ وہ تو اب تک سمجھ بیٹھی ہے کہ بوڑھیا بے ہوش ہے۔ پاؤں دابتے دابتے خود بھی ہوش کھو بیٹھی۔۔ نہ۔۔۔ نہ مری نہیں تھکن سے نڈھال ہو کر بے سدھ ہو گئی ہے۔"

رحمان کو اب بھی اعتبار نہ آیا۔ اُسکو باپ کی کسی بات پر بھی اعتبار نہ آتا تھا۔ اُس نے جب بھی کسی بات کو سوچنا چاہا۔ سمجھنا چاہا۔۔ اعتبار کرنا چاہا منبرا نے جان بوجھ کر اُسکے اعتبار کو جھٹلایا۔ بچپن میں وہ کھیل کھول کے۔۔ مچلتا تو منبرا پھلوں کی تاثیر کڑوی بتا تا۔ اگر کبھی کھلونے کی مانگ کرتا تو منبرا کھلونوں کو خطرناک چیزیں کہہ کر ٹال دیتا تھا۔ اور جو کبھی کبھار وہ سیر سپاٹے پر جانے کی ضد کرتا۔۔۔

دوسرے بچے نشاط باغ شالیمار باغ اور ڈل کی سیر کو جایا کرتے تھے۔ تو منبرا جن بھوتوں کا حوالہ دے کر اُسکو جانے سے روکتا تھا حتیٰ کہ اُسکی ہر حرکت کو گناہ کا لباس پہناتا تھا۔ بوڑھے کی بات پہ اعتبار آتے تو کیونکر۔۔ اُس نے بڑھیا کے وجود میں ماں کی کمی کو پورا کرنا چاہا تو باپ نے بڑھیا کو ڈائن کا درجہ دے دیا۔ آج باپ کی بات پہ یقین آتے تو کیونکر۔۔۔۔

سنبرا نے اُسکو بڑھیا کی طرف بدستور گھورتے پاکر یونہی کہہ دیا۔

"ہوسکے تو پھولی کو جگانا نہیں۔ ... بیمار تو ہے ہی۔ رونے پیٹنے سے مرجائے گی اس ویرانے میں"

بڑھیا کے پاس پہنچ کر یہ بات اُسکے ذہن نشین ہو گئی وہ یہ تھی کہ بڑھیا کے کھردرے پاؤں کیچڑ میں لت پت تھے۔ پھولی بڑھیا کے پاؤں پر سر رکھ کر بے سُدھ پڑی تھی اور بالوں کی ایک لٹ کیچڑ میں لت پت بڑھیا کے پاؤں سے چپک گئی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے اُسکے جی میں آیا کہ جھک کر بالوں کی لٹ کیچڑ سے الگ کر کے سنوار دے۔ بیماری نے ویسے ہی سب بال نکال لئے تھے۔ بچی ہوئی مرغی لگتی تھی۔ لیکن وہ جھک نہ سکا۔ پھولی کے جاگ کھل جانے کا خطرہ تھا۔

وہ ذرا اور آگے بڑھ گیا۔ بڑھیا ایک لمبے ڈانڈھ کی طرح سیدھی لیٹی پڑی تھی۔ سر نم زمین پر لڑھک سا گیا تھا۔ گلے پر اُبھری رگوں کا جال تنا ہوا تھا۔ چہرہ ڈھکا نہ تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ بائیں گال پر کیچڑ کا دھبہ تھا جس سے میل کی لکیر کان کے پاس بکھرے سفید بالوں کے گچھے میں بڑھ گئی تھی۔ سر کے باقی بال کیچڑ میں لتھڑ کر چٹائی کی طرح جُٹے دکھائی دیتے تھے۔

غیر ارادی طور پر اُسکی نگاہیں ماں کے چہرے سے ہٹ کر بیٹی کے چہرے پر جم گئیں۔ ماں بیٹی کے خد و خال بہت حد تک ایکدوسرے سے ملتے تھے۔ وہی سُتنی سی ناک۔ وہی بھاری پپوٹوں سے ڈھکی لمبوتری آنکھیں اور وہی نازک نازک کمزور جسم۔ کوئی نمایاں فرق تھا تو یہ تھا کہ پھولی کا جسم ہلکے ہلکے سانس کے زیر و بم پر ڈول رہا تھا اور بڑھیا کا جسم بالکل نہ ہل رہا تھا جیسے بہت لمبا کٹھن سفر طے کر کے آرام کی گہری نیند سو رہی ہو۔ شاید

ایسی ہلکی سی حرکت کا نام زندگی ہے ورنہ بڑھیا کے جسم اور چہرے پر موت نے کوئی ایسی چھاپ نہ ڈال دی تھی جو پھولی کے جسم اور چہرے پر نہ تھی اور پھولی زندہ تھی ــ

پھولی زندہ تھی اور بڑھیا مرگئی تھی - کچھ دیر کی اور بات تھی پھر یہ جسم قبر کی عمیق اندھیروں میں گم ہو جائیگا ہمیشہ کے لئے - یا پانی کی اتھاہ گہرائیوں میں ۔۔ کون جانے سیلاب رکنے کا نام نہ لے - اس زمیں کے قطعے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے اور وہ سب بھی بڑھیا کے ساتھ ساتھ پانی کی اتھاہ گہرائیوں میں گُم ہو جائیں - اسطرح سوچ سوچ کر اپنا جی ہلکان کرنے سے کوئی فایدہ نہ تھا - بڑھیا مرگئی تھی اور بڑھیا کے ساتھ ساتھ اُسکے بند بھی مرگئے تھے - جو اکہ اب پھولی کا قرب حاصل کرنے کے لئے بھی کوئی جواز نہ باقی رہ گیا تھا - وہ شاید آزاد ہو گیا تھا - سوتہ داری کی کٹھور قوتوں سے آزاد ہو گیا تھا - اُسے خوش ہو جانا چاہیے - رہائی حاصل کرنے کے خیال سے خوش ہو جانا چاہیے - لیکن وہ کوئی خوشی نہ محسوس کر سکا تھا کے کسی انجانے گوشے میں یہ خیال کُھلا رہا تھا کہ وہ سوتہ داری کی کٹھور قوتوں سے آزاد نہیں ہوا بلکہ اُن کے سامنے ہار گیا ہے ...

... بُری طرح سے ہار گیا ہے -

اُس نے ایک گہری سانس لی اور واسکٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا - ایک جیب سے کچھ پیسے برآمد ہوئے - دوسری جیب سے سگریٹ کا ٹکڑا ادھ جلا ٹکڑا جو جاتے جاتے اودھر سیر یپ شیڈ نمبر چار پر ایک کے منہ میں ٹھونس گئے تھے - اُس نے پیسے قمیص کی جیب میں ڈال دئے ادھ جلے سگریٹ کے ٹکڑے کو پاس پڑے ایک پتھر پر اُٹھا لے سے

رکھ دیا۔ سوکھ جاتے تو پہننے کے قابل ہو جاتے۔

جیبیں خالی کر کے واسکٹ اپنے کندھوں سے جدا کر کے تہہ کر لی۔ دھیرے دھیرے بڑھیا کا بے جان سر اٹھایا۔ تہہ کیا ہوا واسکٹ سر کے نیچے جما دیا۔ بڑھیا کا سر تہہ کئے ہوئے واسکٹ پر رکھتے ہوئے کچھ پانی کی بوندیں اسکے ہاتھوں پر گر گئیں۔ شاید بارش پھر سے شروع ہو رہی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ دھندلائی نگاہوں کو آسمان پر ابھرے ستارے بادل نہ دکھائی دیتے۔

رات اپنے جوبن پر تھی۔ مٹیالا پانی اندھیرے کا لبادہ اوڑھ کر کالا لگ رہا تھا۔ اندھیرے کے سمندر نے سیلاب کے تہہ و ڈمکڑ ویرے تھے۔ اور زمین کا یہ ننھا سا قطعہ وسعت اختیار کر کے اچھا خاصا میدان سا لگ رہا تھا۔ فضا پانی کی گونج سے حاملہ نہ ہوتی تو یہ بھیانک رات عام راتوں سے مختلف نہ ہوتی۔ آج کی رات نہ ہوا چل رہی تھی۔ نہ بارش ہو رہی تھی اور نہ ہی کوئی اور غیر معمولی بات ہو رہی تھی۔ رحمان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری کائنات حسب معمول دن بھر کی تکان سے چور تاریکی کی چادر تانے آرام کی نیند سو رہی ہو اور آسمان پر جلوہ گر ستارے حسب معمول پہرہ دے رہے ہوں۔ ستاروں کی ہلکی سی روشنی بھی دھند کی طرح پھیلی ہوئی لگتی تھی۔

رحمان کو محسوس ہوا اور اس نے سوچا کہ کاش یہ تاریک پردہ بڑھ کر اسکے آوارہ ذہن پر بھی تن جائے پاس پڑی بڑھیا کی لاش کی طرح اسکے کلبلاتے خیالات کو بھی ڈھانپ رکھے پھر شاید وہ بے روک ٹوک باپ کا سامنا کرنے کی ہمت کر سکے۔ جوان ہوتے ہوئے بھی وہ ایک ننھے کلبلاتے بچے کے مانند

بوڑھے باپ کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ اور باپ تھا تو اسکی بے چارگی سے
بے نیاز پانی کے کنارے بیٹھا پانی کو گھورتا جا رہا تھا۔ چھوٹے باپ کے بوڑھے
سہارے کو تو شاید باپ حسب معمول برس پڑے اسکی دیدہ دلیری پر... اور
آج باپ کے نشتر سہنے کی اس میں سکت باقی نہ تھی۔ کبھی کے نشتر سہنے کے لئے
طاقت باقی نہ تھی۔ جبھی تو چاہ رہا تھا کہ وہ بھی کھولی کی طرح بڑھیا کے پاس
دھرنا مار کر رو دے۔ اتنا رو دے کہ آنسوؤں کا سیلاب ارد گرد دمٹیالے
سیلاب کو بہا کر اسکو بھی ساتھ بہا لے جاتے۔ ایسی جگہ بہا لے جاتے جہاں
کوئی دکھ نہ ہو۔ جہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ جہاں کوئی کشمکش نہ ہو....
جہاں کوئی مارپیٹ نہ ہو.... جہاں کوئی...... ———
"کیا سوچ رہے ہو...." نمبرا کی سرگوشی نہ تھی ہتھوڑے کی مار تھی۔
اسکی سوچ کے پرخچے اڑ گئے۔ پریشان اوسان یکجا کرنے میں اسے
صدیاں لگ گئیں اور صدیوں بعد اس نے جواب دیا۔
"بڑھیا کو ٹھکانے لگا دیں تو چلیں.... یہاں رکنے سے فائدہ...."
"کہاں چلوگے..." نمبرا نے بدستور پانی کی سطح کو گھورتے ہوئے کہا۔
اندھیرے میں پل کی منڈیر سے پیٹھ لگائے اکڑوں بیٹھا وہ انسان نہ لگ رہا تھا
بلکہ پتھر کا ڈھیلا... اور پتھر کے ڈھیلے سے لڑنا آسان نہ تھا۔
"شہر... شہر چلینگے۔ اب یہاں... اب یہاں کیا رکھا ہے" کاش نمبرا یوں بے
حس و حرکت نہ بیٹھا رہے تو شاید وہ یوں نہ ہکلائے "شہر کہاں جاؤگے۔
شہر میں بڑی ناؤ تو بہہ گئی ہوگی..." ایکے نمبرا نے سر اٹھا کر اسکی طرف ایسے دیکھا
جیسے رحمان نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی ناؤ کو دھکا دے کر سیلاب کے
حوالے کر دیا ہو۔ بھڑک اٹھے تو شاید چور چور ہو کر رہ جائے۔ بدن میں

بالکل سکت نہ تھی۔ اُس نے غبی سے جواب دیا۔

"یہاں تو اب کوئی ٹھکانہ نہیں۔ شہر چل کر کچھ نہ کچھ بندوبست کریں گے"

"اور پھولی کا کیا کرو گے۔۔۔" لیکن نبرا کی آواز بھی تیکھی لگی یا شاید اُسے مغالطہ ہوا پانی کی گونج میں ہر آواز عجیب سی سنائی دیتی تھی۔

"پھولی کے ساتھ میرا کوئی رشتہ نہیں۔ میں تو صرف بڑھیا کی خاطر یہاں رہ رہا تھا" کہتے کہتے وہ گھبرا سا گیا۔

"اور بچہ جو ہوا تھا۔" نبرا نے آخر کار نشتر چبھو دیا۔

"بچہ میرا نہیں تھا۔۔" رحمان پھوٹ پڑا "بچہ میرا نہیں تھا۔۔۔ کسی اور کا تھا۔ میں تو ناحق بیچ میں مارا گیا۔"

"ہوں۔۔۔" نبرا رک گیا اور رحمان نے سوچا وہ گھڑی آخر کار آگئی جس کا انتظار سب کو تھا۔ جب اُس کو بوڑھے باپ کے سامنے کھڑا رہ کر اپنا سارا ماضی داؤ پر لگانا تھا۔ بوڑھے باپ سے فیصلہ کرنا تھا۔ اِس دِن کا انتظار بڑھیا کو بھی تھا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ آج بڑھیا نہ تھی۔ بلکہ وہ اکیلا بوڑھے باپ کے سامنے کھڑا تھا۔ اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ فیصلہ کرنے کے بجائے وہ فیصلہ سُننے کا منتظر تھا۔

فیصلہ سُننے کے لئے رحمان بے حِس و حرکت دم سادھے باپ کے سامنے کھڑا رہا تھا لیکن اُسکی بلبلاتی نگاہیں تاریکی کے پردوں کو چھید کر باپ کے چہرے پر فیصلے کو ٹٹولنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔ دریا کی گونج بھی جیسے نبرا کا فیصلہ سُننے کے لئے ٹھٹھر کر منجمد ہو گئی تھی۔ اور وہ خود منجمد ہو کر ٹوٹ پڑا۔

"تمہیں یقین نہیں آتا بابا... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ میرا بچہ نہیں تھا۔ میں اس گھر میں رہنا چاہتا تھا اس لئے زبردستی میرے گلے منڈھ دیا گیا۔ اب تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟"۔

"یقین تو آرہا ہے..." شبرا کی آواز نڈھال سی ہوگئی "لیکن سوچ رہا ہوں بڑھیا نے تمہیں کھلایا پلایا۔ تم کو اپنے سگے بیٹے کی طرح رکھا۔ جب تم مٹی کے نیچے دب گئے تھے تو تمہاری تیمارداری کی۔ تمہیں نئی جان دی... میں بڑھیا کا یہ قرضہ چکا نہیں سکتا... اُسکی بیٹی کو بے سہارا نہیں چھوڑ سکتا... میں احسان فراموش نہیں... سُنا تم نے......"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں..." رحمان باپ کی باتیں سُن کر پریشان سا ہوگیا۔ بوڑھے کا یہ رُخ اُسکے لئے بالکل نیا تھا۔

"تمہیں پھولی کے ساتھ شادی کرنی پڑیگی اسکے بغیر اور کوئی راستہ نہیں" بوڑھے نے فیصلہ دیا اور دریا کی منجمد گونج جیسے ایکدم پگھل گئی ہو رحمان کے پاؤں اکھڑ گئے۔

شادی... پھولی کے ساتھ... میں شادی... میں "

"ہاں ہاں شادی..." شبرا جھنجھلا پڑا، "تم شادی نہیں سمجھ پاتے

"لیکن بابا... میں کیسے شادی کر لوں... پھولی کا بچہ... ایک بچہ..." رحمان نے شبرا کو یاد دلایا۔

"میں سمجھتا ہوں..." شبر چاچا کی آواز گھمبیر ہوگئی۔ "یہ سامنے دریا دیکھتے ہو نا۔ سیلاب آنے سے پہلے اسکا پانی صاف شفاف تھا۔ تمہیں پیاس لگتی تھی تو بے روک ٹوک ہاتھ بڑھا کر پانی پی لیتے تھے۔ مجھے پیاس لگتی تھی اور میں بھی پی لیتا تھا۔ سب پی لیتے تھے۔ یکایک سیلاب آیا پانی گدلا ہوگیا۔ میلا ہوگیا۔ پینے کے قابل نہ رہا

اب تم پینے کی چاہت رکھتے ہوئے بھی پانی نہیں پا پاتے۔ کچھ دنوں بعد سیلاب اُتر جائیگا۔ مٹی نیچے بیٹھ جائیگی۔ صاف شفاف پانی اُبھر آئیگا۔ تو تم پانی پینے میں جھجک محسوس نہیں کرو گے یہ جان کر بھی کہ کبھی یہ پانی میلا تھا۔ گدلا تھا اور پینے کے بالکل قابل نہ تھا ... پیتے رہو گے پیو گے نہیں تو جیوگے کیسے ......!"

"میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آیا۔ نہ معلوم تم کیا کہہ رہے ہو ..." رحمان بے صبر ہو کر بول اُٹھا شاید بوڑھے کا سر پھر گیا تھا جو آج عجیب سی باتیں کہہ رہا تھا۔ ورنہ کھچولی اور پانی کا کیا میل!

"تم نہیں سمجھ پاؤ گے یہ باتیں ..." پھر اغصے ہو گیا۔ "تم نے ابھی زندگی کہاں دیکھی ہے جو زندگی کے راز سمجھ پاؤ گے۔ تم ابھی بچے ہو ... ننھے بچے ... کھلونے سے کھیل لیا تھوڑی دیر اور جی اوب گیا۔ لگے نئے کھلونے کے لئے مچلنے۔ شہر سے دل بھر گیا تو سونہ داری چلے آئے۔ سونہ داری سے جی اوب رہا ہے تو اب شہر جانے کیلئے مچل رہے ہو۔ بھلا کیا رکھا ہے شہر میں ہمارے لئے۔ زمین تھی تو وہ بہہ گئی ہوگی۔ رہنے کا کوئی سہارا باقی نہیں۔ شہر چلے بھی جاؤ تو در در ٹھوکریں کھانے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ گھر بسانے کے لئے جگہ نہیں۔ تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔ بے گھر کو کون دیگا لڑکی ..."

"اور یہاں کیا ہے ..." رحمان بھی جھنجھلا گیا۔ سیلاب نے شاید بڈھے کو واقعی پاگل کر دیا تھا۔

"یہاں سب کچھ ہے ..." بوڑھے کی آواز میں اُمید اُبھرنے لگی۔ "پھولوں ہے جس سے تم شادی کرو گے اور اپنا گھر بساؤ گے۔ زمین ہے جو بڑھیا چھوڑ گئی ہے۔ مکان چاہے گر گیا ہے۔ ہم تینوں مل جل کر اینٹ اینٹ جمع کریں گے۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنائیں گے۔ تم محنت مزدوری کرو گے۔ میں باغ لگاؤں گا ... وہ دیکھو ... سیلاب رُک گیا ہے۔ میں شام سے پانی کی سطح کو جانچ رہا ہوں۔ ایک انچ بھی پانی نہیں چڑھ رہا ہے۔ بلکہ پانی کچھ کچھ اُتر رہا ہے۔ انشاء اللہ صبح ہوتے ہوتے اُتر جائے گا ... کھڑے کھڑے مجھے کیا گھور رہے ہو۔ پانی کو دیکھو ... پانی کو۔ کیا تمہیں یقین نہیں آتا میری بات کا ...؟"

رحمان کو زندگی میں پہلی بار باپ کی بات پر یقین آ گیا۔ سیلاب واقعی اُتر رہا تھا۔




LIBRARY
No.
Date